ہندوستان میں

فکری و تہذیبی اصلاح کا آغاز

اور

ماسٹر رام چندر

ہندوستان میں

فکری و تہذیبی اصلاح کا آغاز

اور

ماسٹر رام چندر

صدیق الرحمٰن قدوائی

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۵۷۰

سنِ اشاعت : ۲۰۰۷ء
قیمت : =/۱۸۰
ڈیزائن سرورق : جاوید رحمانی
اہتمام : اختر زماں
کمپوزنگ : عارفہ خانم، جاوید رحمانی، محمد ساجد
طباعت : ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

Hindustan Mein :
Fikri-o-Tahzeebi Islah Ka Aagaz Aur
Master Ram Chander
by : **Sadiq-ur-Rahman Kidwai**
Price : 180.00

ISBN : 81-7160-139-1

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar : 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
Phone : 23236299, 23237210, Fax : 23239547
E-mail: urduadabndli a bol net in ; anjuman.urdughar@gmail.com

انتساب

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

کی

یاد میں

فہرست

۱-	حرفِ آغاز	ڈاکٹر خلیق انجم	۹
۲-	پیش لفظ	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۳
۳-	مقدمہ	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۱۷
۴-	پیش لفظ	از مؤلف	۵۷
۵-	پہلا باب	رام چندر کا زمانہ	۶۱
۶-	دوسرا باب	حالاتِ زندگی	۸۱
۷-	تیسرا باب	اخبارات، رسائل، تالیفات	۱۰۵
۸-	چوتھا باب	خیالات وافکار	۱۳۵
۹-	پانچواں باب	تاریخ ادب میں رام چندر کا مرتبہ	۱۵۹
۱۰-	ضمیمہ (الف)	رام چندر کے مضامین	۱۷۷
۱۱-	کتابیات		۱۹۷
۱۲-	ضمیمہ (۲)		۲۰۳

حرفِ آغاز

ماسٹر رام چندر پہلے دہلی کالج کے طالب علم اور پھر اسی کالج میں استاد بن گئے۔ ان دنوں یہ کالج مدرسہ غازی الدین خاں کی عمارت میں تھا جو دہلی کے اجمیری دروازے کے باہر واقع ہے۔ مدرسہ غازی الدین خاں دہلی کی قدیم عمارت میں تھا۔ یہ عمارت ۱۷۱۰ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ اسے قلیچ خاں شیخ میر عابد کے فرزند میر شہاب الدین غازی الدین خاں اوّل نے تعمیر کرایا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس عمارت میں سب سے پہلا تعلیمی ادارہ وہ مدرسہ تھا جو مشہور عالم مولانا فخر الدین نے قائم کیا تھا۔

مولانا فخر الدین ۱۷۱۴ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۷۴۷ء کے بعد دہلی آئے اور ۱۷۹۲ء میں اُنھوں نے اسی عمارت میں ایک مدرسہ قائم کیا جو مدرسہ غازی الدین خاں کے نام سے مشہور ہوا۔ ۱۸۲۵ء میں اس عمارت میں دہلی کالج قائم ہوا، جس میں مشرقی زبانوں اور علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۸۲۸ء میں برٹش ریذیڈنٹ کمشنر سر چارلس مٹکاف کی سفارش پر اس کالج میں ایک انگریزی جماعت کا اضافہ کیا گیا۔

۷؍مارچ ۱۸۳۵ء کو گورنر جنرل بہ اجلاسِ کونسل میں ایک ریزولیوشن پاس ہوا جس نے ہندوستان میں مشرقی علوم کی بنیادیں ہلا دیں۔ کیوں کہ اب مشرقی علوم کے بجائے مغربی علوم کو فروغ دینے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ اس ریزولیوشن میں کہا گیا تھا:

''گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی یہ رائے ہے کہ حکومتِ برطانیہ کا بڑا مقصد اہلِ ہند میں یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا ہے اور جس قدر رقوم مقاصدِ تعلیم کے لیے مخصوص ہیں وہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہئیں۔''

قدیم دہلی کالج کے انگریز اربابِ حل وعقد مشرقی زبانوں میں مغربی علوم کی تعلیم کے حق میں تھے جس کے لیے اُنھوں نے صحافت، تراجم اور نصابی کتابوں کا پورا استعمال کیا۔

اس عہد میں وہ اہم واقعات جنھوں نے ہندوستانیوں کی ذہنی زندگی میں تاریخ ساز تبدیلیاں کیں وہ تھے:

۱- پریس کی ابتدا
۲- برطانوی حکومت کی تعلیمی پالیسی
۳- ہندوستانی عوام کی انگریزی اور مغربی علوم سے واقفیت
۴- صحافت کا آغاز

اس انقلاب کے سبب ابتدا میں جو ممتاز اور اہم شخصیتیں اُبھر کر آئیں۔ ان میں ماسٹر رام چندر، شمس العلما ضیا الدین، ماسٹر، بھیروں پرشاد، مولوی ذکاء اللہ اور پنڈت رام کشن دہلوی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب لوگ دہلی کالج کے اساتذہ میں شامل تھے۔ ان میں ماسٹر رام چندر، بھیروں پرشاد وغیرہ اس کالج کے طالب علم بھی رہے تھے اور دوسرے طالب علم جنھوں نے اردو ادب اور ہندوستان کی سماجی، علمی اور تہذیبی زندگی میں نام پیدا کیا، ان میں شمس العلما محمد حسین آزاد، شمس العلما، ڈاکٹر نذیر احمد، موتی لال، بھیروں پرشاد، ماسٹر پیارے لال اور پنڈت منقول کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ماسٹر رام چندر علم و فضل کی وجہ سے اپنے عہد کی بہت ممتاز اور اہم شخصیت تھے۔ اُنھوں نے اپنے رسالوں کے ذریعے اردو کے علمی سرمائے میں نمایاں کام انجام دیے۔ اس کے علاوہ سائنس اور ریاضی کے شعبوں میں بھی اُنھوں نے ان علوم کے ماہرین اور حکومت دونوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ ماسٹر رام چندر کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان کی علمی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی ترقی کے لیے مغربی علوم کی تحصیل لازمی ہے۔

ماسٹر رام چندر دلی کالج کے شعبۂ مشرقی میں ریاضی، سائنس کے استاد مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے لیے اردو میں الجبرا اور Trigonometry (علمِ مثلث) پر کتابیں لکھیں۔ ماسٹر رام چندر نے ریاضی میں ایک کتاب A treastise on Problems of Maxima and Minima لکھی۔ اس کتاب کی ہندوستان اور انگلینڈ میں بہت پذیرائی ہوئی۔ ہندوستان کے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ایک جلسہ منعقد کر کے انھیں ایک خلعتِ پنج پارچہ اور دو ہزار روپے نقد انعام دیا۔ یہ جلسہ ۱۸۵۹ء میں دہلی میں ہوا تھا۔ ماسٹر رام چندر نے ایک اور کتاب Differential لکھی جس میں اُنھوں نے ریاضی کے کچھ نئے فارمولے پیش کیے تھے۔ یہ فارمولے ہندوستان ہی نہیں یورپ کے کالجوں کے نصاب میں بھی شامل کیے گئے۔

مختلف علوم کی طرح اردو صحافت کی تاریخ میں بھی ماسٹر رام چندر کا بہت اہم مقام ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جو رسالے جاری ہوئے، ان میں ماسٹر رام چندر کے دو رسالے بہت اہم

ہیں۔ اُنھوں نے 'فوائد الناظرین' کے نام سے ۱۸۴۵ء میں ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے کے جاری کرنے کا مقصد بقول "ماسٹر رام چندر 'فوائد الناظرین' واسطے ان اشخاص کے جاری کیا گیا جو واقفیت 'مغربی علوم وفنون' سے نہیں رکھتے تھے اور جنھوں نے سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔"

'فوائد الناظرین' میں سائنسی، اخلاقی، اصلاحی، سیاسی، تاریخی، سماجی اور معاشی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ مضامین کے متنوع موضوعات کے اعتبار سے 'فوائد الناظرین' اپنے تمام ہم عصر رسالوں سے ہر لحاظ سے ایک منفرد اور مختلف رسالہ تھا۔ یکم ستمبر ۱۸۴۷ء میں ماسٹر رام چندر نے 'محبِ ہند' کے نام سے ایک علمی اور ادبی مصور ماہنامہ بھی جاری کیا۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ راجہ رام ایشور چندر ودیا ساگر، پنڈت رامابائی، سوامی وویکانند جیسی شخصیتیں اپنے زمانے کے سماجی مصلحین تھیں، مگر ان کے مخاطب صرف ایک ہی مذہب کے لوگ یعنی ہندو تھے۔ بعد میں سرسید اور حالی وغیرہ بھی عام طور سے مسلمانوں ہی کی ریفارم کے کاموں میں منہمک رہے۔ اس کے برعکس ماسٹر رام چندر نے بلا لحاظِ مذہب وملّت تمام ہندوستانیوں کو اپنا مخاطب بنایا۔ 'محبِ ہند' میں ادبی موضوعات پر بھی مضامین اور مختصر تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ ماسٹر رام چندر اپنے دونوں رسالوں میں ہندوستانیوں کو ایک طرف یورپین علوم کی خصوصیات سے روشناس کراتے تھے اور دوسری طرف مغلیہ سلطنت کے زوال کے حالات بہت ہی دردمندانہ انداز میں بیان کرتے تھے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اردو کے ایک ممتاز اور صاحبِ نظر ادیب اور نقاد ہیں۔ وہ بسیار نویس نہیں ہیں۔ اُنھوں نے کم لکھا ہے تاہم جو کچھ لکھا ہے وہ اعلا درجے کی چیز ہے۔ ان کی تحریریں گہری سماجی بصیرت اور فکر وآگہی کی حامل ہوتی ہیں۔ اردو ادب کے علاوہ سماجی علوم بھی ان کی خصوصی دل چسپی کا موضوع ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ 'ماسٹر رام چندر' ان کی بہت اہم کتاب ہے جو سنہ ۱۹۶۱ء میں دلّی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے شائع ہوئی تھی۔

اس کتاب میں اُنھوں نے ماسٹر رام چندر کے جامع سوانح لکھے ہیں اور ان کے علمی، سائنسی، سماجی اور ادبی کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ماسٹر چندر کی حیات اور ان کی علمی اور ادبی خدمات کا ایک قابلِ ذکر مونوگراف ہے۔

ادھر کچھ عرصے سے یہ کتاب نایاب ہو چکی تھی لیکن پھر بھی ایسے قارئین کی کمی نہیں رہی جو اس کتاب کے متلاشی تھے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر اب حذف واضافے کے بعد اس کا دوسرا اڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔

خلیق انجم

پیش لفظ

(طباعت ثانی)

یہ کتاب ۶۱-۱۹۶۰ء میں لکھی گئی تھی اور ۱۹۶۳ء میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے شائع ہوئی۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب جو شعبۂ اردو کے بانی اور پہلے صدر و پروفیسر تھے۔ وہ اپنے علمی مرتبے کے ساتھ غیر معمولی تنظیمی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ ان کی نگرانی میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں متعدد علمی منصوبے شروع ہوئے۔ سب پورے نہ ہوسکے کہ وہاں کے حالات بدل گئے پھر بھی جب تک اُن کو موقع ملا، اُنھوں نے تدریسی، تحقیقی اور تنقیدی سرگرمیوں کے اعتبار سے دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کو ایک ایسے مقام پر پہنچادیا کہ آزادی کے بعد کی اردو کی اعلیٰ تعلیم کی تاریخ میں اس کی حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی۔ فاروقی صاحب کے متعدد منصوبوں میں ایک تھا Delhi School Of Urdu Literature : Monographic Studies۔ اس کے تحت پہلا پہلا کام ماسٹر رام چندر پر ایک مونوگراف کی ترتیب تھی اور اُنھوں نے مجھے اس کام کے لیے ریسرچ فیلو کی حیثیت سے منتخب کیا۔

میں نے اسی سال علی گڑھ سے اردو میں ایم۔ اے کیا تھا اور خواب و خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ یہاں آتے ہی محض ایک سال کے اندر اس قدر اہمیت کا کام کرنا پڑے، جس کے لیے اس سے قبل میری کوئی تربیت نہیں ہوئی تھی۔ مگر فاروقی صاحب اپنے ارادے کے پکّے تھے۔ ان کے ساتھ مختلف ملاقاتوں میں مجھے کچھ ایسا حوصلہ ملا کہ میں نے کام شروع کردیا گویا کہ تحقیق و تنقید کی دنیا میں عملی تجربے سے ہی میری تربیت کا آغاز ہوا۔ میں نے چار پانچ ماہ تک سارے ملک کے اہم شہروں کی لائبریریوں میں کام کیا۔ سفر کے دوران اس وقت کے اہم ترین اہلِ علم کی خدمت میں حاضر ہونے

اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ فاروقی صاحب اس دوران بیرونی ممالک کے سفر پر گئے۔ وہاں سے بھی وہ نہ صرف میری خیر خبر لیتے رہے بلکہ یورپ اور امریکہ کی لائبریریوں سے بہت اہم مواد بھیجتے رہے۔ جن میں اُن کا مقدمہ اور ایک اس کتاب کا ضمیمہ شامل ہے۔

کتاب کی اشاعت کے بعد اس کی پذیرائی جس طرح ہوئی اس کا اندازہ مجھے ابتدا میں بالکل نہ تھا۔ اس کا سب سے بڑا سبب تو یہ تھا کہ اُنیسویں صدی کی دہلی کی زندگی ہندوستان کی تہذیبی اور سیاسی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے اور دہلی کے اسی ماحول کو بنانے میں قدیم دہلی کالج اور وہاں کے استاد ماسٹر رام چندر کا سب سے اہم حصّہ ہے۔ شمالی ہند میں اصلاح پسندی کا آغاز ان لوگوں کے ذریعے ہوا جو ۱۸۵۷ء کے بعد فروغ پا کر علی گڑھ تحریک کی بنیاد بنا۔ علی گڑھ تحریک کے اہم ترین رکن نذیر احمد، محمد حسین آزاد اور ذکاء اللہ دہلی کالج میں ماسٹر رام چندر کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے اور مولانا حالی بھی کالج سے غیر رسمی تعلق رکھتے تھے۔ ماسٹر رام چندر ریاضی کے بڑے عالموں میں تھے۔ اُن کی علمیت کا شہرہ یورپ تک ہوا۔ چناں چہ ہندوستان میں سائنس کی تاریخ اور ملک کی تہذیبی و سیاسی تاریخ میں اہمیت کی بنا پر ہندوستان اور ہندوستان کے باہر اس کتاب کی کچھ قدر ہوئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عرفان حبیب اور پروفیسر گیل منال (Gale Minault) کا کام بہت اہمیت رکھتا ہے۔

اس دوران دنیا کے دانشوروں نے نئے نئے مباحث اُٹھائے جو اس وقت تو نہیں تھے جب یہ کتاب لکھی گئی مگر جن کا گہرا تعلق اُن باتوں سے تھا اور ہے جو اس کتاب میں زیرِ بحث آئیں۔ مثال کے طور پر ایڈورڈ سعید نے مستشرقیت (*Orientalism*) سے متعلق نئے زاویے سے کچھ سوالات اُٹھائے جن کا تعلق ان رشتوں سے تھا جو سامراجی ممالک اور اُن کے تحت نوآبادیات سے تھے اور جن کا اظہار اس رویے سے ہوتا ہے جو مستشرقوں (*Orientalists*) کے ہاں ملتا ہے اور جسے ایک عرصے تک مستند مانا جاتا رہا۔ دوسری بحث ہن ٹنگٹن (*Huntington*) کے تہذیبی تصادم کے نظریے کی بنا پر چھڑی اور عصرِ حاضر کے سیاسی منظر نامے میں اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں تصادم کے بالمقابل تہذیبوں کے درمیان مکالمے کا نقطۂ نظر بھی سامنے آیا اور اس عہد کے تقاضوں کے مطابق بدلے ہوئے سامراجی مفادات کی طرف بھی توجہ ہوئی۔

ماسٹر رام چندر کا عہد خود ان کی تحریریں اور اُن کے اثرات ان طبقوں کے تعلق سے بھی دیکھے جانے چاہئیں۔

پہلے اڈیشن کی طباعت کے کچھ عرصے بعد اتفاق اور میری خوش قسمتی کہیے کہ ماسٹر رام چندر کے ورثا

میں جناب نرمل کمار مکرجی (سابق کیبنٹ سکریٹری۔ حکومتِ ہند) اور اُن کے خاندان کے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی۔ جناب مکرجی اور ان کی وفات کے بعد ان کی صاحب زادی ڈاکٹر شوبھنا چٹرجی نے اپنے خاندان کے کاغذات اور ان کے ساتھ بہت سی یادداشتیں عنایت کیں جن سے ماسٹر رام چندر کی زندگی خصوصاً تبدیلِ مذہب کے بعد کے واقعات کی تصدیق ہوئی۔ جنھیں اُن کے داماد ایڈون جیکب (Edwin Jacab) نے بھی مرتب کیا تھا اور اس کتاب کو لکھتے وقت بھی ان سے فائدہ اُٹھایا تھا۔ میں ان سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ میں جناب مکرجی اور شوبھنا کا بہت ممنون ہوں۔

کتاب کا دوسرا اڈیشن بہت سے دوستوں کے پے بہ پے اِصرار پہ خاصے تامل کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ اس کی اشاعت کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کا خاص طور سے شکرگزار ہوں۔ اُنھوں نے اس موضوع سے اپنے علمی شغف کے سوا جس خلوص و محبت کے ساتھ طباعت کا اہتمام کیا وہ ہمیشہ دل پر نقش رہے گا۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

دہلی

مقدمہ

مدرسۂ غازی الدین جو بعد میں دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا (اور یہی وہ کالج ہے جس سے رام چندر وابستہ تھے) مسٹر ٹامسن کے قول کے مطابق ۱۷۹۲ء میں قائم ہوا تھا۔[1] اس کی عمارت آج بھی موجود ہے لیکن اس میں امتداد زمانہ سے اتنی تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور اس ادارے نے ارتقا کی اتنی منزلیں طے کی ہیں کہ اس کے قدیم ماحول کو سمجھنا دشواری سے خالی نہیں البتہ مرقع مراۃ الملوک کے بیانات کی مدد سے اس کے "جغرافیائی" گرد و پیش کا کچھ اندازہ ممکن ہے:

"اجمیری دروازہ کے باہر مدرسۂ نواب غازی الدین خاں نہایت نفیس و لطیف بنا ہوا ہے یہ مدرسہ سب سنگ سرخ سے تعمیر کیا ہوا ہے۔ اس کے تین دروازے بہت کلاں اور نہایت خوب صورت ہیں۔ مرتبۂ اوّل ہی میں جب کوئی ان دروازوں سے مدرسہ میں قدم رکھتا ہے۔ اس عمارت کی خوبی و خوب صورتی دروازوں سے دل نشیں ہو جاتی ہے اندر جا کر ایک صحن نہایت وسیع اور نہایت مرتفع واسطے آرام طلبہ کے بنے ہوئے ہیں اور ان حجروں کے سقف پر بھی حجرے متعدد ہیں اور ان جانبوں کے وسط حقیقی میں ایک ایک درہ نہایت وسیع اور مرتفع ہے اور ان دروں کی چھت پر دالان سنگ سرخ کا ہے اور یہ ایک درے مابین حجروں کے اس طرح پر ہیں کہ چند حجرے اس کے ایک جانب میں اور چند حجرے باقی اس کے دوسرے جانب میں واقع ہوئے ہیں اور جانب مشرق میں بھی جس طرف وہ تینوں دروازے ہیں، دروازوں کے دونوں جانب میں چند حجرے ہیں۔ انھیں حجروں کی طرح کے۔ اور غرب کی طرف ایک مسجد ہے، بہت بڑی اور نہایت خوب صورت سنگ سرخ کی اور فرش مسجد کا بھی سنگ سرخ کا ہے اور مسجد کے دونوں پہلو میں کچھ صحن چھوڑ کر دو دالان بہت بڑے، سنگ سرخ کے ہیں۔ جنوبی دالان کے پاس متصل مسجد کے ایک مجر جالی دار سنگ بانسی کا اور اس مجر میں ایک مجر اور سنگ مرمر کا جالی دار وہ جالیاں ایسی خوب صورت ہیں کہ ان میں ایسی نازک کاری ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اس مجر میں تین قبریں ہیں کہ تعویذ اس کا سنگ مرمر کا اور سامنے مجر کے دالان در دالان بہت خوش وضع ہے اور صحن مدرسہ میں ایک حوض بہت وسیع اور عمیق تھا۔

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق: مرحوم دلی کالج، پہلا اڈیشن، ص ۳

یہ مدرسہ احمد شاہ بادشاہ اور عالم گیر ثانی کے عہد میں تیار ہوا تھا۔ غازی الدین خاں نے جوان سلاطین کے عہدہ اراکین سلطنت سے تھا، اس کو تیار کیا تھا۔ ایک مدت ہوئی کہ انگریزوں نے چاہا تھا کہ اس کو منہدم کردیں بلکہ انہدام اس کا شروع ہوگیا تھا۔ ازبس کہ بنا اس کی نہایت مستحکم ہے، جب تک کہ ایک گز بھر دیوار ٹوٹ گئی، دیواریں (کذا) کے ساتھ کدالیں ٹوٹ گئیں جو کہ (کذا) اس کے انہدام میں بھی بہت روپیہ کا صرف پڑتا ہے اور عمارت بھی بہ سبب خوبی کے یادگارِ سلف تھی، اس کا انہدام موقوف کرکر ایک خندق اس کے گرد کھودوا کر اس کو شہر میں لے لیا اور سرکار انگریزی نے اس کو طالب علموں کی تعلیم کے واسطے پسند کیا۔ چند مدرس عربی اور فارسی اور شاستری کے اس میں مقرر کردیے۔ چند مدت کے بعد نواب فضل علی خاں اعتماد الدولہ وزیر شاہ اود (کذا) نے بھی اس کو مدرسہ کے خرچ کے واسطے ایک لاکھ ستر ہزار روپے دیے۔''[1]

اسی سلسلہ میں لکھا ہے:

''ہر چند اس مدرسہ میں حوض سے نہایت کیفیت اور بہت منفعت تھی لاکن انگریزوں نے اس لحاظ سے کہ اس میں پانی بند رہتا ہے اور اس سب سے متعفن ہوکر ہوا کو فاسد کرتا ہے اور فساد ہوا موجب بیماری کا ہوتا ہے، حوض کو بند کروادیا اور اس پر ایک چمن لگوا دیا اور بیچ کے دروازہ کو دو چوکھٹیں لگوا کر بشکل ایک کمرہ کے بنوادیا اور اس کو امتحان گاہ طلبہ مقرر کیا۔ اب دو تین برس کے عرصہ میں مدرسہ فارسی اور عربی اور

---

[1] مرقع مرۃ الملوک قلمی۔ کتب خانہ خدا بخش (اورینٹل پبلک لائبریری) پٹنہ ورق ۲۸۶ خاتمہ پر لکھا ہے۔ ''اختتام کتاب مرقع مراۃ الملوک بدست منشی مہتاب ملاز والی لاہور گردید'' یہ مرقع غالباً مہاراجہ رنجیت سنگھ؟ (متوفی ۱۸۳۹ء) کے حکم سے تیار ہوا تھا۔ اس پر جارج پنجم اور ملکہ میری کی دستخطیں بھی ہیں۔ تاریخ تالیف نامعلوم نیز ملاحظہ ہو

Reminiscences of Imperial Delhi by Sir Theophilus Metcalf,Col.Rickett's mss, India office Library,London

رام چند خیر خواہ ہند کی اشاعت مورخہ یکم ستمبر ۱۸۴۷ء میں لکھتے ہیں: ''قریب اجمیری دروازہ کے، ایک عمارت مدرسہ کی، تعمیر کروائی ہوئی غازی الدین خاں بھتیجے نظام الملک کی ہے۔ حقیقت یہ (کذا) جب یہ عمارت تیار ہوئی ہوگی، اُس وقت بہت خوب صورت ہوگی۔ اگرچہ اب بھی (صفحہ۳) باوجود شکستہ حال کے بہت خوش نما معلوم ہوتی ہے [خیر خواہ ہند، مقالہ ''حال دہلی کا''، ص۲و۳، ہارڈ ورڈ یونی ورسٹی لائبریری]

جائے مقرر ہوا اور اس مکان کو دارالشفائے مرضا ٹھہرا دیا۔ چناں چہ
اکثر بیمار وہاں رہتے ہیں اور سرکار سے ان کے کھانے پینے اور دوا کی
اعانت ہوتی۔[1] (ہے)

اس زمانہ کا ایک عام دستور یہ تھا کہ امرا دینی اور دنیوی تعلیم کے لیے مدارس و مساجد اور اپنے لیے مقبرے بنوایا کرتے تھے۔ اسی طرح نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ نے بھی یہ خوب صورت عمارت انڈوسراسنک طرز پر بنوائی تھی جہاں وہ ۱۷۱۰ء میں آسودہ کیے گئے۔ افسوس ہے کہ مدرسۂ غازی الدین کے حالات پردۂ خفا میں ہیں یعنی یہ نہیں معلوم کہ اس میں تعلیم کیسی ہوتی تھی اور تعلیم دینے والے کون تھے۔ روایتاً مشہور ہے کہ حضرت شاہ فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۷۹۹ء) نے بھی یہاں درس دیا تھا۔[2] اصل میں شمال مغرب اور جنوب کی طرف بہت سی شاندار عمارتیں اور امراء کے مقبرے تھے جن کے نشانات ابھی تک باقی ہیں۔ ان ہی عمارتوں میں حضرت شاہ فخرالدین رح کا مدرسہ بھی تھا۔[3] جس سے یہ تسامح ہوا ہے۔ مسٹر ایچ۔ جے ٹیلر (H.J.Taylor) کی رپورٹ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۲۴ء

۱۔ مرقع مراۃ الملوک۔ قلمی۔ ورق ۲۵۲ اور ۲۵۳
مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سرسید احمد خاں کی آثارالصنادید۔ باب سوم، ص ۳۱-۳۲ عنوان: مدرسہ غازی الدین خاں، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۰۰ء
مولوی بشیرالدین احمد کی 'واقعات دارالحکومت دہلی)، مطبوعہ ۱۹۱۹ء ص ۵۶۲ جلد دوم
مولوی ابوالحسنات ندوی کی ہندستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، مطبوعہ مطبع معارف ۱۹۳۶ء، ص ۲۳ اور مولانا ریاست علی ندوی کی عہد اسلامی کا ہندوستان ادارۃ المصنفین، پٹنہ ۱۹۵۰ء، ص ۲۸۹-۲۹۰۔ مولانا ریاست علی ندوی نے لکھا ہے کہ سرسید کا یہ بیان کہ یہ "مدرسہ احمد شاہ اور عالم گیر ثانی کے عہد میں تیار ہوا"، صحیح نہیں۔ "اس کے بانی غازی الدین فیروز جنگ محمد علی معظم بہادر شاہ اوّل کے دور میں وفات پا چکے تھے اور اسی مدرسہ میں مدفون ہوئے۔" حاشیہ ص ۲۹۰

۲۔ Dr. Mahmud Husain: A History of the freedom Movement article by Intizamullah S. Akbarabadi-

مجھے مولانا شہابی کا یہ بیان ضعیف معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ واقعات دارالحکومت دہلی: مولوی بشیرالدین احمد، ص ۲۶۷
انوارالرحمٰن، مصنفہ مفتی مولانا محمد نوراللہ صاحب" جو حضرت شاہ عبدالرحمٰن صاحب لکھنوی قدس سرہ العزیز کے ملفوظات میں ہے لکھا ہے" یہ شاہ جہاں آباد رسیدہ اول در مدرسۂ حضرت مولانائے فخرالدین محمد قدس سرہٗ العزیز وارد گشتہ"۔ مطبوعہ نول کشور

میں مدرسۂ غازی الدین میں نو طالب علم تھے اور مولوی عبداللہ ان کو درس دیتے تھے۔ ولیم ایڈم (William Adam) نے ۱۸۳۸ء کی رپورٹ میں عربی مدارس کے معیار کو فی الجملہ "بلند" خیال کیا ہے اور جیسی یورپ میں چھاپہ خانہ کی ایجاد سے قبل تھی۔"[1] ان کے نصاب انشا و ادب، بیان و بدیع، منطق و فلسفہ، فقہ و حدیث، ہیئت و حکمت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ سائنس اور آزادیٔ خیال مفقود ہے۔[2] مکتب کٹھ ملاؤں کے ہاتھ میں ہیں اور اُن کی تعلیم کا نتیجہ عمل کو اُبھارنا نہیں بلکہ کاہل اور بے ذوق بنادینا ہے۔[3]

مولوی بشیر الدین احمد کے قول کے مطابق دہلی کالج ۱۸۴۲ء تک اجمیری دروازہ پر رہا۔ بعد میں کشمیری دروازہ کے قریب ریذیڈنسی کی عمارت میں منتقل ہوگیا۔[4] ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں بھی یہ کالج کشمیری دروازے والی عمارت میں تھا جہاں ۱۱ مئی کو اس کا کتب خانہ لوٹا گیا۔[5] لیکن کشمیری دروازہ آنے کے باوجود مدرسہ کی عمارت کالج کے پرنسپل کے قبضہ میں تھی جو کبھی کبھی بورڈنگ کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔[6]

محمد حسین آزاد کے بیان کے مطابق "قفس کی تیلیوں" والا مشہور مشاعرہ بھی جس میں شاہ نصیر استاد ذوق شریک ہوئے تھے، غازی الدین خاں کے مدرسہ ہی میں ہوا تھا۔[7]

دہلی کالج خلا کی پیداوار نہیں ہے۔ اس ادارہ کی اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہوگا جب اس کے

1: Calcutta Revies, Vol. 2, No.4, July-Dec. 1844p. 344: The State of Indigenous Education in Bengal and Bihar-Report by William Adam ,1838

2: R.M.Martin:History of the Possessions of the Hon"ble East India Company,London,1837, Vol´2, p..182

3: Calcutta Review ,Vol 2, No.4 ,July -Dec. 1844,Page 344

۴: بشیر الدین احمد: واقعات دار الحکومت، دہلی ص ۲۶۷

5:N.K.Nigam: Delhi in 1857, Delhi,1957, p-17

۶: بشیر الدین احمد: واقعات دار الحکومت، دہلی

۷: محمد حسین آزاد: 'آب حیات' (۴۴۵) ۱۸۷۷ء میں دہلی کالج ختم کردیا گیا۔ دربار قیصری کے موقع پر اہلِ دہلی نے وائسرائے سے درخواست کی کہ اس کالج کو نہ توڑا جائے لیکن انگریزوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ لاہور کے پنجاب یونی ورسٹی کالج کو ترقی دیں گے، اسی پر قائم رہے اور دہلی کی سیاسی اور تہذیبی اہمیت ختم ہوگئی۔ سرسید نے ۱۸۷۲ء میں لکھا تھا کہ اب دہلی میں بجز "چند ٹوٹی ہوئی قبروں" کے اور کیا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں انگریزوں نے مدرسہ کی عمارت کو پولیس لائن سے خالی کردیا اور عربک اسکول کو دے دیا۔ مولانا حالی نے لکھا تھا:

آپ کو ہم پر رحم جو آیا گھر یہ عطا ہم کو فرمایا
حکم مرمت کا بھجوایا ٹوٹے پھوٹے کو بنوایا
جب تک شہر آباد رہے گا نام تمھارا یاد رہے گا

پس منظر کو سامنے رکھا جائے اور ان حالات کا جائزہ لیا جائے جو اس وقت ہندوستان پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ اس کالج کا قیام ۱۸۲۵ء میں عمل میں آیا جب دنیا میں تین بڑے انقلاب ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے صنعتی انقلاب کا ذکر ضروری ہے۔ اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا اور کرناٹک (۱۷۵۱ء) اور بنگال (۱۷۵۷ء) کے تاراج شدہ خزانوں کی بدولت انگلستان کے صنعتی انقلاب (Industrial Revolution, 1770) میں جان پڑ چکی تھی۔ مشینیں تو بے جان ہیں، ان میں حرکت صرف سرمایہ سے پیدا ہوتی ہے۔ چناں چہ ہندوستان کے خزانوں سے انگلستان کے انقلاب کو وہ فائدہ پہنچا جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں۔[1] واٹ (Watt) نے ۱۷۶۸ء میں دخانی انجن اور ہارگریوز اور کرامپٹن (Crompton) نے ۱۷۶۴ء اور ۱۷۷۶ء میں کپڑے کی کلیں ایجاد کر کے اور جان ول کن سن (John Wilkinson) نے آمد و رفت اور رسل و رسائل میں تبدیلی پیدا کر کے صنعتی پیداوار میں انقلاب برپا کر دیا اور انگلستان نئی منڈیوں اور نئے بازاروں پر قبضہ کر کے دنیا کا دولت مند ملک بن گیا۔

ہندوستان میں ابتدا انگریزوں کی حیثیت محض تاجرانہ تھی اور اُنھوں نے اس کی پوری کوشش کی کہ وہ اپنے آپ کو اس ملک میں ہردلعزیز اور مقبول بنائیں۔ اُنھوں نے یہاں کی تہذیب کا احترام کیا۔ یہاں کی زبانیں سیکھیں۔ ہندوستانی علوم کو مدون کیا، اردو اور فارسی میں شعر کہے، ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کیں۔ یہاں کے کھانے کھائے اور یہاں کے لباس کو پہنا۔[2] ان کے نزدیک یہاں کی شاعری دل آسا، یہاں کی رزمیہ داستانیں پُر شکوہ، یہاں کے وید اعلیٰ و ارفع، یہاں کا مذہب فلسفیانہ، یہاں کی صنعت خوب صورت اور یہاں کی سائنس ایسی وقیع تھی کہ نیوٹن (Newton) بھی اسی راستہ پر چل کر کامیاب ہو سکا۔[3] لیکن سامراجی مقاصد متعین ہو جانے کے بعد ان کا انداز فکر اور طرز عمل بدل گیا اور وہ اپنی عظمت کا بوجھ

1: Brooke Adams: The Law of Civilization & Delcay, 1928, pp 259-60.

2: J.H.Plumb: England in the 18th cetury (1714-1815) Baltimore,1961, page 177
Also R.B.Saksena:Indo-European Poets of Urdu and Persian,and T.g.P.
Spear-The Nabobs

3: George D.Bearce-British Attitudes Towards India,Oxford University Press, London.1961. pp 22-24

اُٹھائے ہوئے ہندوستانیوں سے الگ تھلگ رہنے لگے۔اٹھارویں صدی میں سلطنت مغلیہ کمزور ہوچکی تھی اور فرانسیسیوں کی شکست کے بعد (۱۷۵۱ء) انگریزوں کو پورا موقع تھا کہ وہ دیسی ریاستوں کی کمزوری اور عوام کی بیکسی سے فائدہ اُٹھائیں اور ہر ناجائز طریقہ سے دولت جمع کریں۔ جب کلایو پر اس کی زیادتیوں اور زراندوزیوں کا مقدمہ چلایا گیا تو اس نے اپنی برأت میں دارالعوام کے سامنے کہا تھا:

''خدا گواہ ہے، مسٹر چیرمین، اس وقت میں خود اپنی اعتدال پسندیوں پر حیران ہوں!''[1]

اسی قسم کا مقدمہ ۱۷۸۰ء میں وارن ہسٹنگز پر چلایا گیا۔اس وقت بھی سامراجی تعلقات اور انسانی اخلاق کے بہت سے نکتے معرض بحث میں آئے لیکن بالاخر فتح اسی مفروضہ کو ہوئی کہ انگریز من جانب اللہ ہندوستان پر حکومت کے لیے مامور کیے گئے ہیں اور یہ سفید حکومت ہندوستانی عوام کے فائدہ کے لیے ہے۔''[2] مارٹن لکھتا ہے''ہندوستان جس طرح زراعتی ملک ہے اسی طرح صنعتی بھی ہے......کوئی قوم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔اس صورت میں ہندوستان کو صرف زراعتی ملک بنادینا سخت بے انصافی اور ظلم ہے۔'' لیکن ہوا یہی کہ کمپنی کی معاشی پالیسی کی وجہ سے ہندوستان کی صنعت وحرفت ختم ہوگئی اور وہ صرف خام اشیاء کی منڈی بن کر رہ گیا۔

صنعتی انقلاب کے بعد دوسرا لائق ذکر واقعہ امریکہ کا انقلاب ہے۔ ۴؍جولائی ۱۷۷۶ء کو برطانیہ کی امریکی نوآبادیات نے آزادی کا اعلان کردیا جو اہل انگلستان کے لیے بڑا تازیانہ تھا اور اس نے ان کی ہندوستانی پالیسی کا رُخ بدل دیا۔اُنھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان ہی امریکہ کا بدل ہوسکتا ہے اور اگر اتحاد کو بڑھانا اور خام پیداوار حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے بنگال کی سی دوعملی اور لوٹ کھسوٹ کے بجائے ایسا انتظام حکومت اور ایسی ٹرسٹی شپ قائم کرنا چاہیے جو ان مقاصد کے حصول میں معاون ہو۔[3] وارن ہسٹنگز (Warren Hastings) کے بعد لارڈ ویزلی کے یہاں یہ مقاصد اس رپورٹ میں پوری طرح نمایاں ہیں جو اس نے کمپنی کے نظما کے سامنے فورٹ ولیم کالج کے قیام کی ضرورت اور اس کے مقاصد کے بیان میں پیش کی تھی۔ یہ کالج سقوط میسور (۱۷۹۹ء) کی یادگار میں ۴؍مئی ۱۸۰۰ء کو قائم کیا گیا تھا اور اس کا مقصد تجارتی ادارے کے ایجنٹ نہیں بلکہ ایسے انگریز حکمران پیدا کرنا تھا جو

1:J.H.Plumb: England in the 18th century ,p-174
2: J.H.Plumb:England in the 18th century , p.-176
3: J.H.Plumb:England in the 18th century, p.132

ہندوستان میں برطانوی سامراج قائم کرنے کے اہل ہوں اور فرانس کے انقلابی خیالات سے متاثر نہ ہوسکیں۔[1]

تیسرا بڑا انقلاب وہ تھا جو فرانس میں برپا ہوا (۱۷۸۹ء) جس کی تقلید میں سلطان ٹیپو نے سری رنگا پٹم میں Jacobin Club قائم کیا اور ایک رات اس نے اور تمام اراکین نے تاج شاہی کو آگ لگادی اور وہ سب ایک دوسرے کو "شہری" کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔ ٹیپو آپ کو Citoyen Tipo کہتا تھا اور اس کی فرانس کے انقلابی رہنماؤں سے خط و کتابت تھی۔[2] اسی طرح راجہ رام موہن رائے (۱۸۳۳-۱۷۷۲ء) ایک بڑی پُر تکلف دعوت منعقد کر کے انقلاب فرانس کا خیر مقدم کر چکے تھے[3] لیکن انگلستان محوِ تماشائے لب بام ہی رہا اور اس نے اس آگ کو اپنے ملک کے اندر نہیں آنے دیا۔ اس نے انقلاب کے اصول ضرور خاموشی سے اپنائے لیکن اپنی اخلاقی جارحیت اور مذہبی روایات کی کمر کو پہلے سے زیادہ مضبوط باندھ لیا۔ وہ ان ہی دو ہتھیاروں سے اب تک آدھے سے زیادہ یورپ کے خلاف لڑتا رہا تھا۔ کچھ تعجب نہیں کہ ان کامیابیوں نے اس کے اندر اخلاقی برتری اور روحانی تفوق کا ایک خاص جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اودھ کے مرزا ابوطالب خاں جنھوں نے ۶-۱۷۹۳ء میں یورپ اور انگلستان کا سفر کیا تھا، وہ بھی اس خیال سے متفق ہیں کہ انگریزوں میں قومی غرور بلا کا ہے اور وہ دنیا کی دوسری قوموں کو جنسِ کم ارزد سمجھتے ہیں۔[4] ہندوستان کے مخصوص حالات میں انگریزوں کا یہ احساس اور بڑھ گیا اور عیسائی مشنریوں اور Evangelism کی تحریک نے ان جذبات کو تیز کر دیا۔

1: Calcutta Revies. Vol.5, No.9,Jan.to June 1846,p-90 and p.93

2: K.A.Faruqi:Nationalism and Urdu Poetry, Paper read at the University of Wisconsin Collquium, Feb.22.1962

انقلابی رہنماؤں سے مراد Directoire ہے۔ پانچ رہنماؤں کی وہ جماعت جس کے ہاتھ میں ۱۷۹۵ سے ۱۷۹۹ء تک فرانس کی عنان اختیار رہی۔

3:Percival Spear:India,Pakistan and the West,Third Edn.London p.188

[4] مرزا ابوطالب خان: مسیر طالبی (فارسی) "مشعر بر حالات لندن و کیفیات جمیع جزیرہ انگلینڈ وغیرہ در عہد حکومت...... لارڈ منٹو بہادر حسب الحکم صاحبان عالی شان کالج کونسل دام ظلہم۔ بہ تصحیح جناب ڈاکٹر ولین صاحب دام ثروتہ ، و مرزا حسن علی خلف الصدق مرزا (ابوطالب خاں) مرحوم و میر قدرت علی در سنہ ۱۸۱۲ء...... بہ چھاپہ خانہ ہندوستانی طبع گردید" اس کا ایک نسخہ محمڈن پبلک لائبریری مدراس میں بھی ہے۔ اس سفر نامہ کا انگریزی ترجمہ Charles Stewart کا کیا ہوا دو جلدوں میں لندن سے شائع ہو چکا ہے۔ مرزا ابوطالب خاں کے متعلق مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ علامہ عبداللہ یوسف علی کی "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، مطبوعہ الہ آباد، سنہ ۱۹۲۶ء ص ۱۳۱ تا ۱۳۴ اور Calcutta Revies, Vol.II,July-Dec. 1844,p-380

اس وقت ہندوستان پر زوال اور انحطاط کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سلطنت مغلیہ کمزور ہو چکی تھی۔ اس کی حیثیت ایک عظیم الشان درخت کی سی تھی جس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بہادر شاہ اوّل کے زمانے سے لے کر نادر شاہ کے حملے تک اس کے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہے لیکن اس کی جڑوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا لیکن اس بیرونی حملہ (۱۷۳۹ء) نے مغلوں کی کمر توڑ دی اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ ''از سلطنت بجز نامے باقی نماند'' اس وقت جاٹ مرہٹے، روہیلے، سکھ، انگریز سب ہی لوٹ کھسوٹ پر آمادہ تھے اور جب ان کی دوڑیں دہلی میں آتی تھیں تو خدا کی مخلوق رات کو سونے نہیں پاتی تھی۔ [1] ان طوفانوں میں عوام خس و خاشاک سے زیادہ مجبور اور بے دست و پا تھے۔ ہر زبردست کے گھوڑے ان کے کھیتوں کو پامال اور ہر جابر امیر کے سپاہی ان کے گھروں کو بے چراغ کر سکتے تھے۔ روزی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ صبح کو ملی تو شام کی خبر نہیں۔ دست کار، صناع، کسان، مزدور، وضیع و شریف سب ہی پریشان اور مضمحل تھے۔ خالصہ کی زمین کم ہو جانے سے خود شاہی خاندان پر تین تین وقت کے فاقے گزرتے تھے اور سلاطین کی حالت فقیروں سے بھی بدتر تھی۔ جاگیرداری اور اجارہ داری کی لعنتوں نے آسائش اور اطمینان ختم کر دیا تھا۔ سیاسی انتشار اور اقتصادی بدحالی کے اس اندھیرے میں انگریز، جن کے پیچھے انگلستان کا صنعتی انقلاب اور تاریخ کی بڑھتی ہوئی قوتیں تھیں، اپنے قدم مضبوطی سے جما رہے تھے اور انھوں نے سنہ ۱۸۵۷ء میں بنگال جیسے مال دار صوبہ پر قبضہ کر کے ہماری ''اقتصادی شہ رگ'' کو کاٹ دیا تھا۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دلّی تک پہنچ گئیں اور انگریزوں نے ضعیف العمر شاہ عالم کو جو عبدالقادر روہیلہ کے ہاتھوں نابینا ہو چکا تھا، اپنے قبضے میں کر لیا۔ سرجی ارجن گانو کے صلح نامہ کی رو سے سندھیا نے دوآب کا سارا علاقہ مع آگرہ اور دہلی کے انگریزوں کے سپرد کر دیا اور وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے کبھی شان عجم اور شوکت روم حقیر معلوم ہوتی تھی، نیست و نابود ہو گیا۔ شاہ عالم کی حکومت تو خیر پالم تک تھی لیکن اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی حکومت سمٹ کر قلعے کی چہار دیواری تک رہ گئی۔ یہ بساط بھی ۱۸۵۷ء میں درہم و برہم ہو گئی۔

اس اقتصادی بدحالی اور سیاسی افراتفری میں تعلیم کی جو حالت ہو گی وہ ظاہر ہے۔ جہاں تک دلّی میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کا تعلق ہے اس کی ابتدا سنہ ۱۸۱۳ء سے کی جا سکتی ہے۔ اس سال کے چارٹر کی رو سے یہ طے ہوا کہ ممالک محروسہ ہند کے اجرا کے لیے کم سے کم ایک لاکھ روپے

---

[1] فوائد الناظرین نمبر ۲ جلد ۴، مورخہ ۹ رجنوری، سنہ ۱۸۴۹ء

سالانہ خرچ کیے جائیں۔ یہ ''شاہانہ'' رقم منظور تو ہوگئی لیکن دس برس تک ایک پیسہ بھی اس مد پر خرچ نہیں ہوا۔

اس وقت علم کی طرف جو بے توجہی تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بنگال جو ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آچکا تھا اور جس کی ۱۸۵۴ء میں آبادی تقریباً تین کروڑ ستر لاکھ تھی، اس کی تعلیمی ضروریات پر کمپنی بہادر کے صرف آٹھ ہزار روپے سالانہ خرچ ہوتے تھے جو انگریز کلکٹر کی تنخواہ کی ایک تہائی رقم تھی اور تقریباً اتنا ہی دو سو ہندوستانی قیدیوں کی نگہداشت پر خرچ کیا جاتا تھا۔[1]

اس وقت انگریز نہ صرف یہ کہ تعلیم پر زیادہ خرچ کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے بلکہ اُنھوں نے یہ ستم کیا کہ بنگال میں جو بھی مدرسوں کے لیے معافی کی زمینیں تھیں، وہ سب بیچ دیں اور وہاں کے مدارس کا قدیم نظام جس کی بدولت اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان کی تعلیم کا اوسط یورپ سے زیادہ تھا، اس کو نیست و نابود کر دیا۔[2] مدرسہ عالیہ اور کلکتہ ودیالیہ جن کا تعلیمی تاریخوں میں اتنا ذکر ہے، دراصل ہندوستانیوں کی درخواست اور اصرار پر جاری کیے گئے تھے۔ ریورنڈ ڈف Rev.A.Duff نے صحیح کہا ہے کہ ''تعلیمی پالیسی ہم نے شروع نہیں کی، دراصل ہمارے سر مڑھ دی گئی۔''[3]

بالآخر ۱۷ جولائی سنہ ۱۸۲۳ء کو ایک جنرل تعلیمی کمیٹی کی تشکیل کی گئی اور یہ ایک لاکھ کی رقم اس

۱- Calcutta Review,Vol.22,1854,Article:Vernacular Education for Bengal p. 305

۲- مارٹن لکھتا ہے کہ ہندوستان میں پانچ میں، انگلستان میں پندرہ میں، فرانس میں سترہ میں، ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں گیارہ میں اور آسٹریا میں پندرہ میں، ایک آدمی تعلیم سے بہرہ مند ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

R.M. Martin:History of the Possession of the Hon'ble E.I.C.London 1837, Vol.II.p. 173

B.T.McCulley:English Education & the Origins of Indian Nationalism, New York 1940.p.183

Jawaharlal Nehru: Discovery of India,London 1956,pp.285 and 319

۳- Rev. A.Duff's Evidence,3rd June 1853,Second Report from the Select Committee of the House of Lords on Indian Territories, 1852-53

کے تصرف میں دے دی گئی۔[1] اس کمیٹی کا سکریٹری ولسن (Dr. Horace Hayman Wilson) کو مقرر کیا گیا جو سنسکرت کا عالم اور مشرقی علوم کا حامی تھا۔ کمیٹی نے مختلف برطانوی علاقوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لیے سرکلر جاری کیے۔ دہلی کا جائزہ جے۔ٹیلر J.Tylor نے لیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ دہلی میں تعلیم کی حالت بڑی افسوس ناک ہے۔ پرانے اوقاف بے توجہی کا شکار ہیں اور شرفا تک اپنے بچوں کو پڑھانے کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اس وقت پرانے مدارس سسک رہے ہیں لیکن ان کی عمارتیں اور معلم موجود ہیں۔ اگر تعلیم کی از سر نو تنظیم کی جائے تو اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔[2]

مسٹر ٹیلر کی سفارش پر ایک "ادبی ادارہ" دہلی کالج کے نام سے ۱۸۲۵ء میں قائم ہوا اور وہ اس کے پہلے سپرنٹنڈینٹ مقرر ہوئے جن کو ۱۵۰ روپے ماہوار الاؤنس ملتا تھا کالج کے صَرف کے لیے ۶۰۰ روپے ماہوار منظور کیے گئے۔ ایک پرنسپل سو روپیہ ماہوار پر اور پانچ مولوی پچاس روپے ماہوار پر رکھے گئے۔ اسی موقع پر طالب علموں کے لیے تین تین روپے ماہوار کے ۸۹ وظائف بھی جاری کیے گئے۔

جنرل کمیٹی نے تعلیم کے سلسلہ میں جو ہدایات جاری کیں ان سے دہلی کالج کی نوعیت اور حیثیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت اچھے استادوں اور کتابوں کی بڑی کمی تھی اس لیے دہلی کالج کے نصاب میں کوئی بڑی یا بنیادی تبدیلی ناممکن تھی۔ اسی وجہ سے اس کمیٹی نے فقہ اور قدیم فلسفہ کو نظر انداز نہیں کیا لیکن "علوم مفیدہ کی تحصیل" پر زور دیا (مثلاً ریاضی و تاریخ) جہاں تک زبانوں کا تعلق ہے اس نے ہندوستانی (اردو)، فارسی اور عربی کے سیکھنے کی سفارش کی۔[3] اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابتدا میں دہلی کالج کا مقصد بھی اور مدارس کی طرح خصوصیت سے عربی زبان اور اسلامی قانون کا سکھانا تھا۔[4] اس قسم کی تعلیم سے بہرہ مند لوگوں کی برطانوی

1- R.M.Martin-History Vol.2, p.177

2- Educational Despatch from the Governor -General in Council to the Court of Directors,EIC,dated 27th January 1826.

۳- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Educational Despatch from the Governor General in Council to the Court of Directors,EIC-duted January 27,1826(I.O)

4-Educational Despatch from the Governor General in Council of Bengal to the Court of Directors,dated 21st Aug.1829(I.O)

عدالتوں میں بڑی کھپت تھی۔

۲۶ر جولائی سنہ ۱۸۲۶ء کی رپورٹ سے جو گورنر جنرل نے پیش کی، معلوم ہوتا ہے کہ ایک سال کے اندر اس کالج نے غیر معمولی ترقی کی اور اقامتی طلبا کی تعداد ۱۴۰ تک پہنچ گئی۔ ۱۸۲۷ء میں عربی کے طلبا ۴۰ تھے لیکن فارسی کی اعلیٰ جماعتوں میں ۵۰، ابتدائی جماعتوں میں ۹۷ اور سنسکرت میں ۱۷ تھے۔ اس طرح طالب علموں کی مجموعی تعداد ۲۰۴ تھی۔ سنہ ۱۸۲۸ء میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ ہیئت اور ریاضی کی تعلیم مغربی اصولوں کے مطابق دی جانے لگی اور انگریزی زبان کی تعلیم کا بھی انتظام کر دیا گیا۔[1] لیکن اس سال کے امتحانات کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کالج میں انگریزی کی تعلیم ثانوی حیثیت سے ہوتی تھی جس کا معیار بہت معمولی تھا۔ چناں چہ جنرل کمیٹی نے اہل دہلی کے شوق کو دیکھتے ہوئے پر زور سفارش کی کہ انگریزی کی جماعتیں علاحدہ قائم کی جائیں اور انگریزی زبان، سائنس اور ادب کی تحصیل کے لیے ۸۰۰ روپے ماہوار منظور کیے جائیں۔ گورنمنٹ نے بھی اس خیال کی تائید کی (۱۸۲۹ء) اور قدیم دہلی کالج کے بطن سے ایک نیا ادارہ جس کو دہلی انسٹی ٹیوشن یا دہلی انگلش کالج یا دہلی کالج کا غربی شعبہ کہنا درست ہوگا، وجود میں آیا۔[2] اس کی یہ مشرقی اور مغربی یا قدیم و جدید دونوں حیثیتیں آخر وقت تک قائم رہیں۔

دہلی کالج انگریزوں کی اس تعلیمی پالیسی کی بدولت وجود میں آیا جس پر مشرقی علوم کے حامی (Orientalists) عمل پیرا تھے اور جو اس وقت جنرل تعلیمی کمیٹی پر چھائے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ یورپ میں ہندوستانی علوم کی دید و دریافت کی بڑی قدر تھی۔ گوئٹے کے توصیفی اشعار سر ولیم جونس (Sir William Jones) کے تحقیقی مقالات اور ولیم رابرٹسن (William Robertson) کے تہذیبی انکشافات نے ان کی مقبولیت اور اہمیت کو بڑھا دیا تھا۔ بعض برطانوی حکمران، ہندوستانی علوم کی سرد بازاری پر آزردہ تھے اور ان کا احیاء چاہتے تھے۔ لارڈ منٹو نے ۶ر مارچ ۱۸۱۱ء کی یادداشت میں لکھا تھا کہ

''ہندوستانی عالموں کی تعداد گرتی جاتی ہے اور علم کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا جاتا ہے۔''[3]

1:Bruce Tiebout McCully:English Education and the Origins of Indian Nationalism,New York 1940.p.26

2-Home Dept:Letters to the Court of Directors, Vol.97, 1826-30,Educational Despatch.dated 21st Aug. 1829(I.O)

3-Calcutta Review,January-June,1854,p259,Article-'The Early or Exclusive Oriental Period of Govt.Education Bengal

اس پر کلکتہ ریویو کے مقالہ نگار نے طنز کیا تھا کہ "لارڈ منٹو کی یادداشت تمام تر ہندوستانی علوم کا مرثیہ ہے، اس میں ہندوستان کے عیسائی وائسرائے نے مغربی علوم کی حمایت میں ایک اشارہ بھی نہیں کیا۔"[1]

انگریز یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ہمیں ہندوستان کی حکومت تو مل گئی ہے لیکن ہندوستانیوں کی ہمدردی حاصل نہیں ہوئی۔[2] ان کو یہ بھی خیال تھا کہ اگر ان علوم کی حمایت کی گئی جو اہلِ ہند کو بہت عزیز ہیں تو وہ "ان کی نگاہوں میں سرخ رو ہوسکیں گے۔" اس لیے جنرل کمیٹی نے جو تعلیمی پالیسی بنائی وہ مشرقی علوم کی حمایت میں تھی۔ اس کے اراکین کچھ تو اپنے دامن کی تنگی کی وجہ سے اور کچھ عقیدہ۔ یہ سمجھتے تھے کہ مشرقی تعلیم سوسائٹی کے اونچے طبقہ سے شروع کی جائے اور اس کے فوائد و برکات چھن کر طبقہ ادنی تک پہنچنے چاہیے۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ اس طبقہ کو رفتہ رفتہ مغربی علوم سے آشنا کیا جائے اس لیے کہ اچھے نتائج مشرق و مغرب کے آمیزہ ہی سے مرتب ہوسکتے ہیں اور شاید اسی صورت میں ان ہندوستانی زبانوں کو فروغ حاصل ہوسکتا ہے جو بعد میں ذریعۂ تعلیم بنیں گی۔ دوسرے ہندوستان جیسے قدیم اور وسیع ملک میں مغربی آگاہیوں کی بنیاد صرف مشرقی علوم ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔

اس جنرل کمیٹی کا سب سے بڑا کارنامہ دہلی کالج کا قیام ہے جس نے ہمیں مغربی علوم سے روشناس کرایا اور یہ واقعی بڑا احسان ہے لیکن یہاں یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اس وقت پورا ہندوستان نئی ضرورتوں یا نئی ایجادوں سے ناآشنائے محض تھا یا ہندوستان کے مخصوص حالات کو جنرل کمیٹی کی تعلیمی پالیسی کے مہمیز کرنے میں کچھ بھی دخل نہیں۔ اس قسم کا مفروضہ تاریخ سے ناواقفیت پر مبنی ہوگا۔ مغلوں کے دورِ عروج کا ذکر نہیں جب کہ بابر (متوفی ۱۵۳۰ء) کا سفیر ماسکو میں مقیم تھا یا اکبر (متوفی ۱۶۰۵ء) امریکہ کی دریافت سے باخبر ہوچکا تھا۔[3] آخری زمانہ میں بھی دانشمند خاں اورنگ زیب کے دارالخلافہ دہلی کا گورنر) ڈیکارٹے (Descartes) کی تجزیاتی سائنس کی ایجادات اور ہاروے (Harvey) کے دورانِ خون کے نظریہ کی اہمیت کو پہچانتا تھا اور اس نے برنیر (Bernier) گیسنڈی (Gassendi) اور ڈیکارٹے کی کتابوں کے

1-Calcutta Review,January-June,1854,p259,Article-'The Early or Exclusive Oriental Period of Govt.Education in Bengal,
2-Adam's Third Report on Vernacular Education in Bengal and Bihar,1868,p.340
3-Jawaharlal Nehru:Discovery of India,4th Edition,London 1959,Footnote-Page 261

فارسی تراجم پر مامور کیا تھا۔[1] اسی طرح سوائی جے سنگھ جس کا انتقال نادر شاہ کے حملے کے چار سال بعد ہوا ہے، علم ہیئت اور جدید ریاضی سے غیر معمولی دل چسپی رکھتا تھا اور ان شعبوں میں جو کچھ کام پرتگال اور یونان میں ہوا تھا، اس سے تراجم کے ذریعہ واقف تھا۔[2] اٹھارویں صدی کے سیاسی انحطاط میں بھی ہندوستانی پیداوار کے طریقوں کا مقابلہ دنیا کے کسی ملک سے کیا جاسکتا تھا۔ ہندوستان کی ہنڈیوں اور صنعت وتجارت کی ساکھ ایشیا اور یورپ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بحری جہاز نپولین کے خلاف جنگ میں استعمال ہوئے تھے اور اس کی تعلیم کا اوسط، انگلستان سے کہیں زیادہ تھا۔[3] انیسویں صدی کی عام مایوسیوں میں بھی جب کہ ہماری بیڑیاں بہت بھاری ہوگئی تھیں، ہندوستانیوں میں ایک ایسا مستثنیٰ یا محدود طبقہ موجود تھا جو انگریزوں کے نئے علوم سے واقفیت کو ضروری سمجھتا تھا۔ مہاراجہ اپوروکرشن بہادر، دہلی کے درباری شاعر انگریزی سے واقف اور ہیم برگ Hamburg اکادمی کے ممبر تھے۔ اُنھوں نے ۱۸۴۸ء میں اپنی ایک فارسی نظم کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا تھا۔[4] بشپ ہیبر (Heber) ۱۸۲۴ء میں لکھنؤ گیا ہے، وہ غازی الدین حیدر کے لکھنؤ کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ ہندوستان سے زیادہ یورپ کے شہروں مثلاً ڈرس ڈن Dresden سے ملتا جلتا ہے۔ بادشاہ کے ملازمین میں انگریز انجینئر شامل ہیں اور وہ خود علم کیمیا، دخانی انجنوں، نئے قسم کے جہازوں اور جدید کتابوں سے دل چسپی رکھتا ہے۔[5] نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷۔۳۷ء) نے تو ایک رصدگاہ (Observatory) بھی بنوائی تھی جس کی نگرانی Col.Vilcox کے سپرد تھی۔ لکھنؤ کے شاہی پریس سے ایسی کتابیں بھی شائع ہورہی تھیں جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئی تھیں۔[6] مارٹن ۱۸۳۷ء میں لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں انگریزی زبان کی تحصیل کا

1-Bernier's Travels ed. Constable and V.A.Smith,1914,p.324

2-Jawaharlal Nehru: Discovery of India,1956,p.281

3-R.M.Martin-History vol.2, 1837,p.173

4-Calcutta Review -Vol.Xi,Jan-June 1849-Misc.Notes-Review on'History of the conqurerors of Hind".Pub.in Calcutta,Bengal Catholic Orphan Press.1848

5-Bishop Heber:Narrative of a Journey through the Upper Provices of India 1824-5,2 Vols,London ,1828

6-A Collection of Moral Precepts and Reflections gatherd from various sources in English and Hindostany,Vols.1 and2,printed at His Majesty the King of Oude's Liithographic Press.Lucknow 1833,Library of Congress Washington D.C.,U.S.A

رواج روز بروز بڑھ رہا ہے۔ لارڈ بنٹک نواب فیض محمد خاں سے انگریزی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ دہلی کالج کے ایک استاد نے اس بنا پر استعفیٰ دے دیا ہے کہ اس کو کسی بھی دیسی ریاست میں ٹیوٹر یا سکریٹری کی اعلی سے اعلیٰ جگہ بہت آسانی سے مل سکتی ہے۔ کشن لال نے اپنے دونوں لڑکوں کو اس نیت سے انگریزی پڑھائی ہے کہ وہ نواب فیض محمد خاں کے سکریٹری مقرر ہوں گے۔''[1]

بنگال میں انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے جو ذہنی انقلاب پیدا ہو گیا تھا، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن یہ عرض بے محل نہ ہوگا کہ مشہور مصلح اور رہنما راجہ رام موہن رائے (متوفی ۱۸۳۳ء) جو ۱۸۳۱ء میں شہنشاہ دہلی کے سفیر کی حیثیت سے انگلستان گئے تھے اور جو مانچسٹر اور لور پول کی ''سانس لیتی ہوئی اور سچ مچ کی چلتی ہوئی'' مشینیں دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے تھے۔[2] قطعی طور پر مغربی تعلیم کے حامی تھے اور ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر ہندوستانیوں کو موقع دیا جائے تو ان کی ۲/۳ آبادی اپنے بچوں کو عربی، فارسی اور سنسکرت کے بجائے انگریزی پڑھائے گی۔[3]

باوجود مذہبی اور سماجی دشواریوں کے ولایت کے سفر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا جو ۱۸۶۹ء میں نہر سوئز کے مکمل ہو جانے کے بعد اور بڑھ گیا لیکن ابتدائی زمانہ میں بھی مرزا ابوطالب خاں کی مثال ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اودھ کے ریذیڈنسی وکیل میر لندنی یعنی میر حسن علی ۱۸۱۴ء یا ۱۸۲۴ء میں Addiscombe میں اردو پڑھاتے تھے۔ ان کی انگریز بیوی Princess Augusta کی ملازم تھیں۔ یہ بارہ برس لکھنؤ میں رہنے کے بعد واپس ولایت چلی گئیں۔[4] میر لندنی کی انگریزی دانی کی تعریف کی جاتی تھی اور اُنھوں نے گولڈ اسمتھ (Goldsmith) کے ناول Vicar of Wakefield کے ایک باب کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔[5] اسی طرح یوسف خاں کمبل پوش، مولوی مسیح الدین اور سر سید احمد خاں

1-R.M.Martin:History of the Possessions of the Hon'ble E.I,C,1837,Vol.2, p.198

2-Culcutta Review -Vol.4.1845,Article on' Rammohun Roy',p.382

3-S.D.Collet: Life and Letters of Raja Rammohum Roy.London 1900,pp 71-73 and pp-59-60

4-Calcutta Review, July-Dec.1844,p. 387

۵- جان شیکسپیر، منتخبات ہندی جلد اوّل مطبوعہ لندن ۱۸۴۶ء پانچواں اڈیشن، صفحہ ۱۳۱ کا نوٹ۔

سے پہلے ۱۸۳۷ء میں انگلستان اور فرانس گئے تھے اور ان کے سفرنامہ کے بعض حصے رام چند کے محب ہند میں شائع ہو چکے تھے۔[1] ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی یورپی علوم وفنون کے دلدادہ تھے۔

دہلی مٹنے پر بھی ہندوستان کا قلب وجگر اور ایک عظیم الشان تہذیب کی نشانی تھی۔اس کے مکاتب و مدراس جید عالموں سے خالی نہیں تھے جن کے علم وفضل کی دھاک ہندوستان کے باہر ملکوں میں بیٹھی ہوئی تھی اور جو اپنی تہذیب اپنے علوم پر فخر کرتے تھے۔ان اساتذہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا نام کئی حیثیتوں سے لائق ذکر ہے۔ان کو مدرسہ عالیہ کلکتہ کی صدر مدرسی کے لیے طلب کیا گیا لیکن اُنھوں نے اس عزوجاہ پر ویرانہ دہلی کو ترجیح دی۔اس وقت انگریزوں کا تسلط دہلی سے کلکتہ تک قائم ہو چکا تھا۔اُنھوں نے فتویٰ دیا کہ پورا برطانوی ہند دارالحرب ہے اور مسلمانوں کو اپنا نظم قائم کرنے کے لیے لڑنا چاہیے لیکن جب انگریزی سیکھنے کا سوال پیدا ہوا اور مقامی و بیرونی مسلمان اس طرف متوجہ نہیں ہوئے تو اُنھوں نے انگریزی زبان سے استفادہ کی حمایت کی۔[2]

---

[1] محب ہند، مورخہ پہلی نومبر ۱۸۵۹ء عنوان 'حال سفر یوسف خاں کمبل پوش کا ملک انگلستان میں'' شروع میں رام چندر کا نوٹ ہے: ''ان صاحب نے ملک انگلستان اور فرانس اور مصر وغیرہ میں بطریق سیاحی سفر کیا اور وہاں کے جو عجب حال بہ چشم خود دیکھے، قلم بند فرمائے اور 'تاریخ یوسفی' اس کا نام رکھا...... میں بھی ان کو لکھتا ہوں تاکہ یہاں کے لوگوں کو معلوم ہو کہ دنیا میں کیا عجیب وغریب چیزیں اور پیدائش خدائی اور سیاحی میں معلوم ہوتی ہیں۔'' اس سفرنامہ کا نام 'عجائبات فرنگ'' بھی ہے اس کا ایک نسخہ ۱۸۴۷ء کا چھپا ہوا میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

[2] دلی کالج میگزین: قدیم دلی کالج نمبر ۱۹۵۳ء شذرات از راقم ص ۲۱ نیز عبدالمجید سالک:

''مسلم ثقافت ہندوستان میں'' مطبوعہ لاہور ۱۹۵۷ء ص ۶۲۴ مولانا عبدالمجید سالک نے حضرت شاہ عبدالعزیز کے اس فتوئ جواز کا رشتہ دہلی کالج سے جوڑا ہے اور لکھا ہے: ''جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی میں کالج قائم کیا اور مسلمان اس کالج میں تعلیم پانے پر آمادہ نہ ہوئے تو شاہ صاحب نے ان کے شبہات کو رفع کر کے ان سے کہا کہ دہلی کالج سے استفادہ کریں یعنی شاہ صاحب......انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے چکے تھے۔''

مولانا سالک کی یہ رائے صحیح نہیں اس لیے کہ شاہ صاحب کا انتقال ۱۸۲۴ء میں ہوا ہے اور دہلی کالج ۱۸۲۵ء میں قائم ہوا۔ابتدا میں اس کی حیثیت عربی مدرسے کی سی تھی۔اس میں انگریزی جماعتوں کا اضافہ ۱۸۲۸ء میں ہوا ہے۔شاہ صاحب کا فتویٰ دہلی کالج سے نہیں شاہ بخارا کے ایک استفسار سے متعلق ہے۔فرماتے ہیں''اور انگریزی پڑھنا یعنی انگریزی کا حرف پہچاننا اور اس کی لغت اور اصطلاح جاننا، اس میں کچھ قباحت نہیں بشرطیکہ صرف مصلح ہونے کے خیال سے انگریزی حاصل کی جائے۔اس واسطے کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علی وسلم کے حکم کے موافق زید بن ثابت نے یہود و نصاری کے خط و کتابت کا طریقہ اور ان کی زبان سیکھی تھی......اور اگر صرف ان کی انگریزوں کی خوشامد کی غرض سے اور ان کے ساتھ اختلاط رکھنے کے لیے یہ علم پڑھے اور اس ذریعہ سے چاہے کہ ان کے یہاں تقرب حاصل ہو جائے تو البتہ اس میں حرمت اور کراہت ہے۔'' (سرور عزیزی العروف فتاوی عزیزی مطبع مجیدی کانپور ص ۳۳۵)

یہی نہیں بلکہ حضرت شاہ عبدالعزیز نے انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے کی موافقت میں بھی فتویٰ دیا تھا۔[1] ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزوں سے علمی روابط اور انگریزی زبان و علم کی یہ تائید سرسید کی تحریک سے تقریباً پچاس برس پہلے حاصل ہو چکی تھی۔

اس بحث کا مدعا یہ ہے کہ دہلی کالج کچھ ایسی "بے موسم" کی چیز نہیں تھا اور ایک طبقہ خواہ وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، ایسا ضرور تھا کہ جو انگریز کے علم و آئین کو جاننے اور سمجھنے کا خواہش مند تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت جلد دہلی کالج کے مشرقی شعبہ کو زوال اور مغربی شعبہ کو ترقی حاصل ہونا شروع ہوئی۔ ۱۸۳۴ء میں انگریزی کی جماعتوں میں طلبا کی تعداد ۱۶۰ تک پہنچ گئی۔ انگریزی گرامر کے پچاس فارسی نسخے صرف ایک دن میں بکنے لگے۔[2] اور مولویوں اور پنڈتوں کے لڑکے "اب اس پرانے نظریے پر ہنسنے لگے کہ زمین دنیا کا ایک جامد مرکز ہے۔"[3]

دہلی کا یہ پودا چوں کہ صحیح وقت پر لگایا گیا تھا اس لیے اس نے جڑ تو پکڑ لی لیکن اسے نمِ سحر میسر آنے سے پہلے بادِ سموم کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ جب کبھی کسی نئی تحریک کا آغاز ہوتا ہے جو مروجہ طریق زندگی کے لیے خطرہ معلوم ہو تو اُس کی مخالفت ہوتی ہے اور مخالفت کی کمی یا زیادتی اس پر منحصر ہوتی ہے کہ اس تحریک کے لیے زمین کتنی ہموار یا ناہموار ہے۔ دلّی کالج بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ جنرل کمیٹی نے اس کالج کے لیے ۶۰۰ روپیہ ماہوار مقرر کیے تھے لیکن ۱۸۲۹ء میں نواب اعتماد الدولہ (متوفی سنہ ۱۸۳۱ء) نے اس کے لیے سات سو روپیہ ماہوار کا وقف منظور کیا۔ ان کے داماد اور اس وقف کے متولی سید حامد علی خاں کو انگریزوں سے یہ شکایت تھی کہ یہ کالج عربی اور فارسی کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا لیکن وقف کی رقم انگریزی کے شعبہ پر خرچ ہو رہی ہے نیز "ہندوستان بھر میں جتنے بھی تعلیمی ادارے ہیں، سب عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں اور اسی وجہ سے کالج کی موجودہ مسیحی کمیٹی بھی نواب مرحوم کی وصیت کا

1:J.M.S.Baljon:The Reforms and Religious Ideas of Sir Sayyid Ahmad Khan.2nd Edn.Lahore 1958,p.23. سرسید کا رسالہ احکام طعام سنہ ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ شاہ صاحب کی مراد حلال کھانوں سے ہے۔ سرسید کا رسالہ 'احکام طعام اہل کتاب' اس کے بہت بعد ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔

2:Appendices 'F' and 'G' of the Report of the General Committee of Public Instruction for 1833.

3:C.F.Andrews:Maulvi Zaka Ullah of Delhi,1928,pp.39-40 .Also Perceval Spear:Twilight of the Moghuls, Cambridge,p-200

احترام نہیں کرتی ،، لیکن حامد علی خاں کو گورنر جنرل کی طرف سے تنبیہہ کی گئی کہ آئندہ اس کالج کے سلسلہ میں کسی بھی ایسی شکایت پر غور نہ کیا جائے گا" جو خط و کتابت کے مقرر طریقہ یعنی کالج کی مقامی کمیٹی اور جنرل کمیٹی کے ذریعہ نہ بھیجی جائے گی۔"[1]

اس وقت حالات کا رُخ بدل چکا تھا۔سترھویں صدی میں ہندوستانی تہذیب اہل یورپ کی نظروں میں حقیر نہیں تھی لیکن ۱۸۰۰ء میں ان کا اندازِ فکر اس ملک کے متعلق بدل گیا اور وہ اس کی روایات کو فرسودہ، اس کی رسموں کو بہیمانہ اور اس کے عوام کو سراسر وحشی سمجھنے لگے۔اٹھارویں صدی کے فرانسیسی فلسفیوں نے یہ بات پورے یورپ کے دل میں بٹھادی تھی کہ ان کی تہذیب تمام دوسری تہذیبوں سے اعلیٰ وارفع ہے۔اس لیے کہ یورپ نے ترقی کا راز جان لیا ہے اور وہ راز ہے عقلیت۔اسی کی بدولت ایسی سائنسی ترقی ممکن ہے جس کی نظیر ماضی میں نہیں اور اسی کے ذریعے سماج کی ایسی تشکیل کی جاسکتی ہے جس کی بنیاد انصاف پر ہو۔ صنعتی انقلاب بھی اسی سائنسی فکر کا زائیدہ تھا جس کی دولت آفرینیوں کے آگے قارون کے خزانے ہیچ تھے۔اُنیسویں صدی میں جب اس مدرسۂ فکر سے انسان دوستی اور افادیت کی تحریکیں آکر مل گئیں تو انگلستان میں ایک دورِ اصلاح شروع ہوگیا اور ہندوستان کو اس "نئے فلسفہ" کے بروئے کار لانے کا بہترین معمل سمجھا جانے لگا۔ان افکار و خیالات سے متاثر انگریزوں نے (جن میں بنٹنک اور میکالے بہت مشہور ہیں) جب ہندوستان میں ذات پات کی تفریق دیکھی تو ان کی انسان دوستی کو ٹھیس لگی اور جب یہاں کی قبیح رسمیں دیکھیں تو ان کی عقل دوستی کو صدمہ پہنچا اور ان کو یقین ہوگیا کہ ہندوستان کی نجات صرف مغرب کی تقلید اور پیروی میں ہے۔اس طبقہ کو Evangelical گروہ سے بھی مدد ملی جو عیسائیت کی سطح پر انسان دوست اور عقلیت کی سطح پر افادیت پسند واقع ہوا تھا۔۱۸۱۳ء کے چارٹر کی رو سے عیسائی مشنریوں کو برطانوی مقبوضات میں آزادانہ تبلیغ کی اجازت بھی مل گئی جو سچے دل سے یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ہندوستان میں ایک بڑی تبلیغی اور تعلیمی مہم سرانجام دینا ہے۔دلی کالج کے پرنسپل ٹیلر (Taylor) کی سرگرمیاں اور مسلمانوں کے ساتھ پادری فینڈر (Pfander) کے مناظرے اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔[2]

اس زمانہ میں یہ بحث چل رہی تھی کہ ہندوستانیوں کو کون سی تعلیم دی جائے اور اس کا ذریعہ کیا

---

1. قدیم دلی کالج نمبر، ص ۱۵۷

2: Calcutta Review-Vol.iv, July-Dec 1845: The Mohommedan Controversy p. 449

ہو۔لارڈ میکالے کا خیال تھا کہ ہندوستانی کلچر خرافات اور توہمات کا پشتارہ ہے اور وہ تاریخ جو تیس فٹ کے اونچے حکمرانوں سے بھری ہوئی ہے اور جن کا دور حکومت تیس ہزار سال تک پھیلا ہوا ہے اور وہ جغرافیہ، جس میں تمام سمندر، دودھ اور شیرے کے ہیں، اس کا پڑھانا محض تضیع اوقات ہے۔[1] میکالے Cecil Rhodes کا ہم نوا اور ہم خیال تھا۔ان دونوں کو برطانیہ کی مسیحائی کا یقین تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کے اس فیوض و برکات ہی سے یہ خدا کی مقہور اور تیرہ وتار سرزمین روشن ہوسکتی ہے۔[2] میکالے کے فکری محرکات میں برطانوی سرمایہ داری کی وہ سیاسی اور معاشی ضرورتیں اور مصلحتیں متزاد تھیں جن کا تقاضا تھا کہ ملک میں ہمدرد اہل کاروں کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا جائے جو نوآبادیاتی نظام کے قیام میں اعانت کرسکے، "جو خون اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز۔" میکالے کو یہ بھی یقین تھا کہ اگر اس کی تعلیمی پالیسی پر عمل کیا گیا تو اس سے ہندوستان میں عیسائیت کو فروغ حاصل ہوگا۔[3] اور انگریزوں کی لسانی، علمی اور مذہبی برتری کا سکہ بیٹھ جائے گا۔[4]

میکالے کی یہ تعلیمی یادداشت (۱۸۳۵ء) ہماری تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔اس موقع پر ولسن (Wilson) نے بہت واویلا مچائی کہ یہ بڑا ظلم ہے کہ ہندوستانیوں کے ذہن کو ان کی تہذیبی بنیادوں سے محروم کردیا جائے اور وہ اپنے فکر و خیال کے لیے ایک اجنبی ملک کے محتاج ہوجائیں جو سات سمندر پار واقع ہے۔[5] لیکن گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنک نے اس یادداشت کو

1: Thompson and Garrat: Rise and Fulfilment of British Rule in India 1935,p.661--Macaulay 's Minute. Also ,G.O. Trevelyan: The Life and Letters of Lord Macaulay (2Vols.) London,1931, 1, p.291.

2: Hans Kohn: A History of Nationalism in the East, 1929,pp.94-5

3:Ishwar Nath Topa: The Growth and Development of National Thought in India(Inaugural Dissertation 1928)Gluckstadt 1930,page 65-Macaulay's letter to his mother dated 22nd Oct. 1836.

4: George D.Bearce-Op.Cit p 161.

5: Asiatic Journal,xi-vii,Jan. 1836,pp1-16-G. H. Wilson's letter dated 5thr Dec.1835.

منظور فرمالیا۔ مشرقی علوم کے حمایتیوں کو شکست ہوئی اور ہندوستان کی ثقافتی غلامی کا وہ دور شروع ہوا جو فوجی محکومی سے زیادہ گراں نشیں تھا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زلزلہ آتا ہے اور مکان و مکین سب دب جاتے ہیں لیکن ایک حسن اتفاق سے بچ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی دلی کالج کے ساتھ ہوا۔ میکالے کی تعلیمی پالیسی نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔[1]
مشرقی علوم سرپرستی اور امداد سے محروم کر دیے گئے لیکن دہلی کالج کو باقی رہنے دیا گیا......وایں آفت از مینا گزشت!۔

دہلی کالج کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اردو کے ذریعہ مغربی سائنس، ہیئت، ریاضی، نیچرل فلاسفی وغیرہ کی تعلیم کا انتظام کیا اور شمالی ہند میں سب سے پہلے مشرق اور مغرب کے صحت مند عناصر کو سمونے کی کوشش کی۔ اس طرح اس کالج نے نہ صرف اردو زبان میں تعلیم کی شاندار روایات قائم کیں بلکہ ایک نئی فضا اور ایک نئی شش جہت پیدا کی۔ تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت، مشرق و مغرب کا امتزاج اور وہ سائنسی اور سیکولر نقطۂ نظر جس پر آج ہم زور دے رہے ہیں اور جس کی مدد سے اس زمانہ میں ہم اپنی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں اس کا اوّلین احساس دہلی کالج ہی نے پیدا کیا تھا۔

انگریزی اثر سے بنگال میں جو بیداری پیدا ہوئی تھی، وہ زیادہ تر ادبی ہے لیکن دہلی میں اس کی حیثیت سائنسی ہے۔[2] اس پرانے شہر میں جو قدیم تہذیب کا علامتی مرکز تھا، انگریزوں کی رسمیں نہیں آئیں، ان کے خیالات آئے۔ مغرب کی برکتوں کا یہ احساس کبھی بھی اتنی جلد نہ پیدا ہوتا اگر دہلی کالج کی نامور شخصیتیں، جن میں مشہور ریاضی دان رام چندر کا نام سرِ فہرست ہے، تدریس و تصنیف کے ذریعہ یا صحافت و ترجمہ کے نئے معیار قائم کر کے ان خیالات کی باقاعدہ اشاعت نہ کرتیں۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کو جغرافیائی اعتبار سے ملک کہہ لیجیے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تاب و توانائی ختم ہو رہی تھی۔ ملکی قوتیں ٹکرا ٹکرا کر مضمحل ہو چکی تھیں اور ان میں اتنی سکت باقی نہیں تھی کہ ملک کی رہنمائی کر سکیں۔ پرانے زرعی نظام کے ختم ہو جانے اور انگریزوں کے معاشی استحصال کی وجہ سے ملک غریب ہو گیا تھا اور خوف اور مایوسی نے اس کو بہت سے

---

[1] اگرچہ ۱۸۳۸ء میں افغانوں سے لڑائی کی وجہ سے اس پالیسی پر جلد عمل نہ ہو سکا۔

2:Percival Spear: Twilight of the Moghuls, Cambridge 1951,p.1990

امراض و اوہام میں مبتلا کردیا تھا۔ ہندوستانی ذہن کے آگے نہ کوئی منزل تھی نہ کوئی محمل۔ گردوپیش کے اندھیرے سے بچ کر اس نے اپنی ساری توجہ خارج کے بجائے باطن پر مرکوز کردی تھی اور وہ بہت سی پرانی اور فرسودہ اقدار کو سینہ سے لگائے ہوئے تھا۔ قدیم و جدید کی اس آویزش میں دلی کالج ایک ستارہ ہے جو اس شام غم میں بھی صبح نو کی خبر دیتا رہا۔ اس نے ہمیں رواجی تصورات سے نجات دلاکر ایک نئی آب و ہوا پیدا کی، جس میں ماضی کا تنقیدی شعور، حال کا نیا احساس اور مستقبل کی پذیرائی ممکن تھی۔ کالج کی شخصیتوں میں رام چندر، پیارے لال آشوب، اشپرنگر، مملوک علی، صہبائی، شیو نرائن آرام، کریم الدین، محمد حسین آزاد، ذکا اللہ، نذیر احمد اور ضیاء الدین اور بیرون کالج کی شخصیتوں میں غالب و آزردہ [1] سرسید و حالی کے کارنامے علاحدہ علاحدہ اہم ہیں لیکن ان سب کا ملاکر جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے ہمارے فکر و احساس کی دنیا میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کردی تھی۔

اس تبدیلی کا اثر دور تک پہنچ گیا تھا۔ غالب کے یہاں جو مغرب کی خیر و برکت کا احساس اور انگریزوں کے علم و آئین کی تعریف ملتی ہے، وہ بھی دراصل مولانا ابوالکلام آزاد کی صراحت کے خلاف۔ [2] کلکتہ سے زیادہ، دہلی کی فضا کی پروردہ ہے۔ کلکتہ میں تو ان کی نظر "سبزہ زار ہائے مطرا" اور "نازنین بتانِ خود آرا" سے آگے نہیں گئی۔

دہلی میں جو تبدیلیاں دبے پاؤں آرہی تھیں اور جو اخبارات و رسائل شائع ہو رہے تھے، ان کا چرچا کالج کے حدود سے نکل کر علم دوست گھرانوں تک پہنچ گیا تھا اور وہ قدیم فلسفہ جس کا محور ارسطو کی تعلیمات تھیں پس پشت پڑ گیا تھا۔ غالب نے البتہ دہلی کالج کی ملازمت قبول نہیں کی جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی وضع داری کو گنوا کر نئے نظام سے مفاہمت کے لیے تیار نہیں تھے لیکن انتخابی ذہن قدیم علوم کی نارسائیوں سے واقف ہو چلا تھا۔ کالج کے

---

[1] مفتی صدرالدین آزردہ، ڈاکٹر اشپرنگر کے دوست۔ رام چندر کے رسالہ محب ہند کے خریدار اور دہلی کالج کے ممتحن تھے (قدیم دلی کالج نمبر ص ۳۶-۶۶-۱۲۴)

[2] حضرت مولانا نے غلام رسول مہر کی کتاب "غالب" کے حواشی میں مرزا کے سفر کلکتہ کو ان کی ادبی زندگی کا بڑا اہم موڑ قرار دیا ہے اور ان کی نثر کی سادگی کے سلسلہ میں میر حسن علی کے ترجمہ Vicar of Wakfield کا بھی ذکر کیا ہے۔

حلقے سے ان کے اچھے مراسم تھے اور وہ انگریز کی داد و دانش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔[1]

غالب کے یہاں جو چیز ایک ''مبہم احساس'' کی صورت میں تھی، وہ سرسید کے یہاں ایک ''واضح اصلاحی پروگرام'' بن گئی پھر یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ جدید اردو ادب کے قافلہ سالاروں میں سرسید، نذیر احمد، حالؔی، ذکاء اللہ، پیارے لال آشوب اور محمد حسین آزاد کے ذہن کے بیشتر نقش ونگار راست یا بالواسطہ دہلی کی اسی فضا میں تیار ہوئے تھے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ دہلی کی تعلیمی، معاشرتی اور ادبی زندگی میں میں جہاں کہیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پہلے کسی قسم کی حرکت نظر آتی ہے اس کا سلسلہ، دہلی کالج ہی سے ملتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے سرسید کی سائنٹی فک سوسائٹی تک عشق کی ایک جست نہیں ہے، دہلی کالج اس کی درمیانی منزل ہے۔ طبیعات، کیمیا، ہیئت، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سیاست مدن، فلسفہ و اخلاق، صحافت، قواعد، لغت سازی، تذکرہ و ترجمہ، ناول نگاری، ادب نسواں، مقالہ نگاری اور مکتوبِ نویسی میں دہلی کالج سے متاثر شخصیتوں نے جو کام انجام دیے ہیں وہ ہماری تاریخ ادب کے اہم سنگ میل ہیں اور اس وقت عمل میں آئے ہیں جب لوگ نو عروسِ نظم ہی کے خط و خال پر مٹے ہوئے تھے اور آدمِ نثرِ جدید یعنی سرسید احمد خاں کے کارنامے سامنے نہیں آئے تھے۔

اس موقع پر فورٹ ولیم کالج اور دلّی کالج میں جو بنیادی فرق ہے، اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اوّل الذکر نے قدیم اسلوبِ بیان میں ایک انقلاب برپا کردیا اور باوجود

---

[1] غالبؔ نے آئین اکبری کو ''متاع کس مخر'' اور سرسید کی تصحیح کو ''مردہ پروردن'' کہا ہے (جو غلط اور غیر اہم ہے) لیکن انگریزوں کے ''شیوہ و انداز'' کی تعریف کی ہے (جو اہمیت سے خالی نہیں)

تاچہ آئین با بدید آوردہ اند آنچہ ہر گز کس ندید آوردہ اند

گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد گہ دخاں گردوں بہ ہامون می برد

نغمہ ہائے زخمہ از ساز آوردند حرف چوں طائر بہ پرواز آوردند

رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ شہر روشن گشتہ درشب بے چراغ

سرسید ۱۸۶۹ء میں لندن گئے اور مغرب سے بے حد متاثر ہو کر لوٹے۔

فارسی کے عالم گیر اثر کے ''سلیس نثر نگاری کی شاہ راہ'' قائم کردی لیکن وہ ۱۸۰۰ء میں ''صاحبان نو آموز'' کو اردو پڑھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اسی لیے صرف زبان دانی کا کالج ہو کر رہ گیا اور اس کا اثر بھی طرز و اسلوب کی سرحد سے آگے نہ پڑھ سکا۔ اس کے مخاطب ہندوستانی نہیں، انگریز تھے۔ اسی لیے علامہ عبداللہ یوسف علی نے اس کو ایک ''جزیرہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں تک بیرون کالج کے مقتدر مصنفین کا تعلق ہے (بعض وہابی مصنفین کو چھوڑ کر[1]) ان کے طرز پر بھی فارسی کا گہرا اثر تھا، وہ بدستور ظہوری اور بیدل کی نثر کے دلدادہ تھے اور حد یہ کہ پرائیویٹ خطوں میں بھی ''محمد شاہی روش'' کو برتنا ضروری سمجھتے تھے لیکن جب نئی ضرورتوں کی صبح طلوع ہوئی تو رات کا یہ غازہ اور نرگسی آنکھوں کا سرمہ ڈھل گیا۔ نئے تقاضوں اور نئی تبدیلیوں نے تکلفات کے طلسم کو توڑا اور اس میں سادگی اور سچائی کی نئی روایات قائم کیں۔

اس طلسم کے توڑنے اور نئی قدروں کے پھیلانے میں دلی کالج کے ماسٹر رام چندر کا بڑا حصہ ہے جو اس مانوگراف کا اصل موضوع ہیں۔ ان کی اولیات میں تنقید شعر و ادب، ترجمہ و تاریخ، سیرت و سوانح، مضمون نگاری اور صحافت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سرسید، حالی، آزاد، نذیر احمد اور شبلی کے کارنامے، رام چندر کے بعد کے ہیں۔ موخر الذکر کو ''اردو کے عناصر خمسہ'' کے آگے تاریخی تقدم حاصل ہے، ادبی نہیں لیکن یہ شرف بھی معمولی نہیں۔

جدید اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۸۷۴ء کے مشاعرۂ پنجاب اور نئی تنقید کی ابتدا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے حاصل کی جاتی ہے جو ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا لیکن رام چندر نے حالی سے ۴۶ سال پہلے اپنے رسالہ 'خیر خواہ ہند'[2] میں اردو شاعری پر تنقید کی ہے جس سے اس

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف ''وہابی ادب'' جو آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلا بھونیشور میں بڑھا دیا گیا۔

[2] رام چندر کا 'خیر خواہ ہند' جیسا کہ صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب نے لکھا ہے یکم ستمبر ۱۸۴۷ء کو جاری ہوا لیکن نومبر ۱۸۴۷ء سے اس کا نام 'محب ہند' ہو گیا۔ ڈاکٹر گارساں دتاسی اور ابواللیث صدیقی صاحب خیر خواہ ہند اور محب ہند کو دو مختلف رسالے سمجھتے ہیں جو صحیح نہیں۔ قاسم علی سجن لال صاحب اور عتیق صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ خیر خواہ ہند صرف ستمبر ۱۸۴۷ء میں نکلا اور دوسرے ہی نمبر سے اس کا نام محب ہند ہو گیا۔ یہ رائے بھی درست نہیں۔ ہارورڈ یونی ورسٹی لائبریری، کیمبرج امریکہ میں اس رسالہ کے ابتدائی پرچے مل جانے سے ان غلط فہمیوں کا بخوبی ازالہ ہو جاتا ہے۔

میدان میں ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں ان کے خیالات کو پیش کرنے سے مراد رخ روشن کے آگے شمع رکھنا نہیں ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ان میں سے بعض اعتراضات کو حالی نے آگے چل کر زیادہ صراحت اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یکم ستمبر ۱۸۴۷ء کے 'خیر خواہ ہند' میں (جس کا نام نومبر ۱۸۴۷ء سے محب ہند ہو گیا) ایک حصّہ انگریزی زبان میں بھی ہے۔ اس میں رام چندر کا ایک مضمون مشاعرہ پر شائع ہوا ہے جس میں ضمناً اردو شاعری پر بھی تنقید ہے۔ ذیل میں اس مضمون کے اہم نکات کو پیش کیا جاتا ہے:

۱- مشاعرے صوبہ شمالی و مغربی اور بالخصوص دہلی میں ہر مہینہ، ہر پندرھویں دن یا ہر ہفتہ ہوتے ہیں۔ میر مشاعرہ شاعروں کو دعوت نامے جاری کرتا ہے اور مصرع طرح کی اطلاع دیتا ہے لیکن سامع کی حیثیت سے ہر شخص شرکت کرسکتا ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے

۲- عام طور پر سامعین، اساتذۂ سخن کو سننے کے بعد چلے جاتے ہیں اس لیے یہ رواج ہے کہ استادوں سے آخر میں پڑھواتے ہیں تاکہ محفل آخر وقت تک جمی رہے۔

۳- مشاعرہ بالعموم ایک وسیع دالان میں منعقد ہوتا ہے جو تمام آسائشوں اور ضرورتوں کا جامع ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کے سامنے شمع آتی ہے جس کی روشنی میں وہ اپنا کاغذ پر لکھا ہوا کلام سناتا ہے۔

۴- شاعری کا موضوع عام طور پر عشق ہے جس کا معیار بہت پست اور افسوس ناک ہے۔

۵- اس کا اندازہ معشوق کے تصور سے کیا جاسکتا ہے۔ وہ ان شاعروں کی دنیا میں بے وفائی اور جور و جفا کا پتلا ہے۔ وہ بوالہوس رقیب سے راہ و رسم ہی نہیں رکھتا بلکہ سچے عاشق کی ایذا رسانی سے خوش بھی ہوتا ہے۔

۶- اردو شاعری میں عاشق، سودائی و مجنوں، رند خراباتی، کافر، مغموم اور دلگیر نظر آتا ہے۔

۷- عاشق اور واعظ میں کبھی نہیں بنتی۔ ان شاعروں نے شیخ کی بری طرح خبر لی ہے اور کوئی گستاخی ایسی نہیں ہے جو ان واعظانِ مذہب و اخلاق کے ساتھ روا نہ رکھی ہو۔

۸- ہر مصیبت اور بے عملی کا سبب چرخ نیلوفری ہے۔ ہمارے شاعر (جو عاشق سمجھتے جاتے ہیں) جب کبھی معشوق کی ایذا رسانی اور بے وفائی کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا سارا الزام آسمان کی کج رفتاری پر رکھتے ہیں۔

۹- اردو شاعروں کی بے مذہبی (Irreligiousness) مشہور ہے اس کا اندازہ مندرجہ

ذیل اشعار سے ہوگا:

نہ بت خانے سے کام اپنا، نہ بیت اللہ سے مطلب
میں بندہ عشق کا ہوں ، مجھ کو کیا ہے راہ سے مطلب
سمجھ تو دیکھ مجھ سے تجھ سے جھگڑا کیا ہے اے زاہد
تجھے تسبیح سے اور مجھ کو اپنی آہ سے مطلب

ـــــــــــ

واعظ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میر
آؤ مہ خانے چلیں تم کس کی باتوں پر گئے[1]

رام چندر کی انگریزی زبان وادب سے واقفیت راست تھی۔ حالی کی بالواسطہ لیکن حالی کا مذاق سخن رام چندر سے بلند تھا۔ وہ خود شعر کہتے تھے اور اچھے شعر کی پرکھ رکھتے تھے۔ وہ اپنی شاعری کے مزاج اور ادب کی روایت سے بے خبر نہیں تھے اور بلاغت میں اشارت اور ادا کی جو اہمیت ہے، اس کے رازداں تھے۔ رام چندر نے اعتراضات کی انگلی تو صحیح جگہ پر رکھ دی لیکن میر کا تیرِ نیم کش ان کی بے چین راحتوں میں اضافہ نہ کر سکا اور اُنھوں نے اردو شاعری کو ایک ایسے پیمانہ سے جانچنے کی کوشش کی جو "غیر شاعرانہ" ہے تاہم ذوق وظفر کے زمانے میں اردو شاعری کے متعلق بنیادی اور اساسی سوال اُٹھانا بجائے خود اہم ہے۔

رام چندر نے اسی نمبر کے حصّہ اردو میں بھی "حال مشاعرہ کا" عنوان قائم کیا ہے اور لکھا ہے "بروقت جمع ہونے مجلس مشاعرہ کے عجب کیفیت معلوم ہوتی ہے کہ قلم اس کے لکھنے میں سرنگوں ہے۔ تصویر مجلس مشاعرہ کی بھی درج رسالہ کے کرتا ہوں۔ اس سے کیفیت مجلسِ مذکور کی معلوم ہو جاوے گی۔"[2] اس تصویر کے بعد شبیہہ حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ خلد اللہ ملکہ" درج ہے۔

رام چندر نے حضور والا کے عنوان سے ظفر کی شاعری پر بھی رائے زنی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"بہادر شاہ بادشاہ دہلی، اردو اشعار ایسے کہتے ہیں کہ قلم کو طاقت نہیں کہ وصف ان کا بیان کرے اور زبان اون کی تعریف لکھنے میں گونگی بن جاتی ہے۔ دل نے بے اختیار چاہا کہ حضرت کی چند غزل لکھ کر اپنے ناظرین کی نظر سے گزاروں تاکہ وہ اون کو مطالعہ کر کر بہرہ کافی

---

[1] خیر خواہ ہند: مورخہ یکم ستمبر ۱۸۴۷ء صفحہ ۱۲ حصّہ انگریز، مخزونہ ہارورڈ یونی ورسٹی لائبریری کیمبرج، ریاست ہائے متحدہ امریکہ

[2] خیر خواہ ہند: یکم ستمبر ۱۸۴۷ء حصہ اردو، ص ۵۳ (ہارورڈ)

اور فائدہ وافی حاصل کریں اور دیکھیں کہ شعر گوئی اس کا نام ہے اور
لطف یہ ہے کہ شعر حضرت کا سلیس اور موافق محاورہ زبان اردو کے
ہوتا ہے اور شیخ ابراہیم ذوق عہدۂ اوستادی پر ممتاز اور سرفراز ہیں اور
اکثر اشعار حضور والا کے میں اصلاح دیتے ہیں۔"[1]

اس تبصرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رام چندر "حفظ مراتب" کے قائل تھے لیکن اس کی اہمیت "شاہ وقت" کی "تعریف" سے زیادہ نہیں بلکہ جو کچھ اُنھوں نے انگریزی میں لکھا ہے اس کی ایک معنی میں تردید ہے۔ اس لیے کہ اُنھوں نے اردو شاعری پر جو عمومی اعتراضات کیے ہیں وہ ظفر کی شاعری پر بھی صادق ہو سکتے ہیں لیکن جو چیز رام چندر کو اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے وہ شعر و شاعری کا ایک محدود تصور نہیں بلکہ تہذیب کا ایک نیا شعور ہے جسے وہ اچھے ادب کی تخلیق سے پیدا کرنا چاہتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ "اگر شاعر اردو کے توجہ کریں تو وہ ہر قسم کے اشعار جن کی زبانوں انگریزی اور رومی اور یونانی میں بہت شہرت ہے، بنا سکتے ہیں۔"[2]

رام چندر کی اولیات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اُنھوں نے مراسلہ نگاری کی قدیم روش پر سخت اعتراضات کیے اور آسان عبارت لکھنے پر زور دیا۔ اس وقت اردو نثر فارسی کے اثر میں بندھی ہوئی تھی اور اس کے پاس بجز "مضامینِ عاشقانہ اور گل گشت مستانہ" کے اور کچھ نہیں تھا۔ "لفظ و معنی کے شکنجے" میں کبھی کبھی "فشارِ آغوشِ حسین" کی کیفیت لطف دیتی ہے لیکن اس سے نقصان یہ ہوا کہ ادبی مرصع کاری، علم و فضل کی نشانی سمجھی جانے لگی اور نجی خطوط بھی تکلفات سے گراں بار ہو گئے۔

رام چندر ان فارسی انشا پردازوں کے بڑے خلاف تھے۔[3] جن کا سارا سرمایہ ایجادِ اسالیب اور

---

[1] خیر خواہ ہند: یکم ستمبر ۱۸۴۷ء، ص ۵۶۔ غزلیات ظفر ص ۵۶ سے ۵۹ تک درج ہیں۔

[2] محب ہند: مورخہ جون ۱۸۴۸ء، ص ۵۱ (ہارورڈ)

[3] ماسٹر رام چندر کی مولفہ نے لکھا ہے "اس زمانہ کی (اردو) نثر کی سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جملوں کی ساخت میں عموماً عربی کے نمونوں پر چل رہی تھی چناں چہ ماسٹر رام چندر کی تحریریں بھی اسی انداز کی نشان دہی کرتی ہیں۔" (ص ۹۳) یہ رائے محل نظر ہے۔ اول تو اس وقت عربی کا رواج فارسی سے بھی کم رہ گیا تھا۔ دوسرے خود رام چندر کی عربی کی لیاقت مشتبہ ہے۔ اگر ان عربی اثرات سے ان کی مراد قرآن شریف کے تراجم ہیں تو شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے ترجمہ کا یہ حال ہے کہ "اس قدر لفظی" بے محاورہ اور دشوار فہم ہے کہ ہمارے زمانہ میں کیا اس زمانے میں بھی بول چال کی زبان ایسی نہ تھی۔" اسی طرح شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمۂ قرآن بھی "سلیس اور بامحاورہ نہیں ہے۔" (حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو، طبع ثانی ص ۵۴۔۵۵) جو تراجم ایسے "بے محاورہ اور دشوار فہم" ہوں، ان کے اثرات کا "ادب کی فضا پر چھا جانا اور ان کے 'عربی طرز' میں 'ادیبوں میں پسندیدہ اور معیاری' بن جانا عجیب ہے۔ محترمہ نے شاہ عبدالعزیزؒ کے اردو ترجمہ کا بھی دو جگہ ذکر کیا ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ اس سے ان کی کیا مراد ہے۔

صفحہ ۹۲ پر اُنھوں نے لکھا ہے کہ "رام چندر کا طرز تحریر قدیم انشا پردازی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔" "قدیم انشا پردازی سے بالعموم مراد وہ 'اغلاق عبارات و صناعات' ہیں جو اردو میں فارسی کے ذریعہ آئے۔ رام چندر کی ساری ادبی زندگی اس طرز و روش کی مخالفت میں گزری۔ جیسا کہ آگے کی بحثوں سے واضح ہوگا۔ وہی قواعد کی بے پروائی، متعلقات فعل کو فعل کے بعد لانا مضاف الیہ کو اکثر مضاف کے بعد لکھنا اور الفاظ کی بے محل تقدیم و تاخیر' یہ عام تھی اور سرسید کے یہاں بھی نظر آتی ہے لیکن یہ عربی کا اثر نہیں بلکہ اکثر جگہ فارسی میں "سوچنے" اور اردو میں "ترجمہ" کرنے کا نتیجہ ہے۔

تزئینِ بیان تھا۔ فوائد الناظرین میں لکھتے ہیں:

"تمام ہمت فارسی والوں کی اپنی تصنیفات و تالیفات میں عبارت آرائی و انشاپردازی میں مصروف رہی۔ صدہا کتابیں ایسی ہیں کہ جن میں سوائے نمود عبارت و الفاظ کے کوئی مضمون نہیں۔ مثلاً مینا بازار و سہ نثر ظہوری، وقائع نعمت خاں عالی و پنج رقعہ وحسن و عشق وغیرہ کہ جن کے مصنفین کو کمال شوق عبارات مشکلہ کا تھا بلکہ بعض کتابیں جو عبارت آرائی سے علاقہ نہیں رکھتی (کذا) ان میں زبردستی اپنی عادت کو خرچ کیا ہے...... اکثر کتابوں کے خطبے ایسے دیکھنے میں آئے کہ اوّل سے آخر تک لاحاصل ہے...... بادشاہ کی تعریف میں دو دو ورق سیاہ کیے جن میں سوائے رشکِ جمشید و فریدوں و سکندر و دارا اور دانائی میں رشکِ ارسطو و افلاطون و بقراط و جالینوس و لقمان وغیرہ، سخاوت میں حاتم، شجاعت میں شیر وغیرہ، حکومت میں حاکم ہفت اقلیم، حالاں کہ وہ بے چارا مالک ایک صوبہ کا بھی نہ تھا اور معدلت میں نوشیرواں سے بہتر۔ الغرض چند عبارت خاص تھے جن کو الٹ پھیر ہر ایک نے لکھا اور ادنیٰ مضمون کے واسطے جو ایک سطر میں گنجائش رکھتا تھا، ایک ورق میں لائے اور اس کا نام کمالِ بلاغت رکھا۔"[1]

اس فارسی انشا پردازی کے زیر اثر، اردو میں جو خطوط لکھے جا رہے تھے، وہ بھی قافیہ پیمائی اور رنگین بیانی سے خالی نہیں تھے۔ مرزا رجب علی بیگ (صاحب فسانۂ عجائب) کی آنکھوں کا آپریشن ہوا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ سخت اذیت اور کرب کا عالم ہے۔ اس حالت میں ایک خط اپنے بیٹے کو لکھا ہے۔ اس میں اس روش کی پابندی نہیں ہوسکی تو معذرت کی ہے اور لکھا ہے:

"یہ دو سطریں انتشار طبیعت میں لکھی ہیں۔ کوئی چست فقرہ نہ نکلا۔"[2]

ایسی ہی معذرت ایک اور خط میں ہے: "یہ خط پریشانی میں اناپ شناپ، بے ناپ تول لکھا ہے۔"[3]

واجد علی شاہ تاجدارِ اودھ "آوارۂ دشتِ غربت ہیں۔" بقول ان کے "چہرہ ارغوانی، زعفرانی ہے (اور) فراموش ساری لن ترانی" ہے لیکن اس عالم میں بھی بیوی کو خط کی رسید لکھتے ہیں تو اس طرح:

"نامہ عنبر شامہ، عطر آگیں، بہجت تزئیں، مفرح روح، مقوی دل، ممد جان، معاونِ رواں، سلسلۂ محبت، وسیلۂ مودت، مسکنِ دلِ نالاں و

---

[1] فوائد الناظرین نمبر ۹ ج ۵ مورخہ ۲۹ر اپریل ۱۸۵۰ء عنوان، حال علوم اہل اسلام کا ہندوستان میں۔"

[2] انشائے سرور: نول کشور، ص ۵۳

[3] ایضاً، ص ۴۷

مضطر، جامع پریشان و بے پر، مایۂ صبر و قرار، باعث تسلیِ دلِ غم خوار، مجاہد الدولہ کی معرفت پندرھویں ماہ صفر کو رونق افروز بزم موصول ہوا، کاشانۂ محبت روشن اور خانۂ الفت رشکِ وادیِ ایمن ہوا۔“[1]

رام چندر نے اپنے رسالہ 'محبِ ہند' مورخہ یکم جنوری سنہ ۱۸۵۰ء میں ایک مضمون ”توہمات رسوم“ پر شائع کیا ہے جس میں اس طریقۂ خط و کتابت کی سخت مذمت کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ ”واہیات و منشآت“[2] اور ”اغلاق عبارات و صناعات و استعارات۔“[3] فارسی کے ذریعہ آئے ہیں اور قابل ترک ہیں۔ پنڈت کیفی کا خیال ہے کہ غالبؔ کی اردو نامہ نگاری کا نقطۂ آغاز رام چندر کے اسی مضمون کو سمجھنا چاہیے لیکن یہ رائے نظر ثانی کی محتاج ہے۔ اوّل تو غالبؔ کی سلاست نِگاری اور غالبؔ کی اردو خط نویسی مترادف نہیں ہیں۔ دوسرے غالبؔ کے اردو خطوط رام چندر کے اِس مضمون کی تاریخ اشاعت یعنی یکم جنوری سنہ ۱۸۵۰ء سے پہلے کے بھی ملتے ہیں۔ تیسرے غالبؔ کی ”سادگی“ خلا کی پیداوار نہیں ہے (البتہ ”پُرکاری“ ان کی اپنی ہے) غالبؔ سے پہلے، بہت سے مکتوب نگار، اپنی افتادِ طبیعت اور اقتضائے حال کے مطابق، آسان عبارت بھی لکھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ فارسی کے مقلدین کے یہاں بھی ”صفائے گفتگو“ کی دل چسپ مثالیں مل جاتی ہیں۔[4]

رام چندر کا وصف امتیازی یہ ہے کہ اُنھوں نے نہ صرف محمد شاہی روشوں کے خلاف مسلسل جہاد کیا بلکہ اردو کے انداز گفتگو اور سادہ و سلیس نثر کے پھیلانے میں بھی بڑی کوشش کی۔ اس لیے اگر ان کے خطوط مل سکتے تو وہ بڑے کام کی چیز ہوتے۔ ہمارے پاس ان کا صرف ایک خط مٹکف (Sir Theophilus Metcalfe, President of the Local Committee, Public Instruction,Delhi) کے نام ہے جس سے کم سے کم ان کے مراسلاتی نظریہ کی عملی شکل واضح ہو جاتی ہے:

> ”بخدمت سر سیافلس مٹکف صاحب بہادر بارنٹ[5] کے یہ عرض ہے کہ اس کتاب سے یہ غرض ہے کہ وہ باشندے ہندوستان کے جو زبانوں فرنگ سے ناواقف ہیں، کچھ حال مسائل وغیرہ فاضلوں اور کاملوں

۱۔ قیام لندن کی یادداشتیں۔ تاریخ ممتاز ورق ۴ الف و ب۔ برٹش میوزیم

۲۔ محبِ ہند مورخہ یکم جنوری سنہ ۱۸۵۰ء سنہ ۱۸۵۰ء ج ۲۹، ص ۴۶۔۴۹

۳۔ ایضاً

۴۔ راقم الحروف نے اس بحث کو 'مکتوباتی ادب' میں پھیلا ہے اور نمونے دیے ہیں۔

۵۔ Baronet

یونان اور روم قدیم اور فرنگستان اور ممالک شرقی کا معلوم کریں چوں کہ
میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کو شوق اس امر سے بہت ہے کہ ترقی علوم
کی اہل ہند میں ہوتو آپ کے نام سے یہ کتاب''[1] تیار کرتا ہوں
تا کہ آپ کے نام مبارک کے باعث سے اس کی علم دوست قدر
کریں۔فقط

بندہ

رام چندر

۲۳رتاریخ اکتوبر سنہ ۱۸۴۹ء [2]

رام چندر نے سرسید سے پہلے مضمون نگاری وصحافت، ذکاء اللہ سے پہلے ترجمہ وتاریخ اور حالی سے پہلے سیرت نگاری وتنقید شروع کی اور اس طرح ان کی حیثیت چراغ راہ کی سی ہے۔ اُنھوں نے نذیر احمد کی طرح نسوانی ادب مہیا نہیں کیا لیکن موخرالذکر سے پہلے عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کی حمایت کی۔اُنھوں نے سرسید کی طرح کوئی اصلاحی تحریک شروع نہیں کی لیکن غلامی اور محرومی کا احساس دلایا اور 'تہذیب الاخلاق' سے بہت پہلے ''مضامینِ علمی'' اور ''نصیحت آگیں'' لکھ کر جو'' مفید خلقت ہندوستان'' ہوں، ہماری چشم تنگ کو کثرت نظارہ سے کھولنے کی کوشش کی۔یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے کام میں حالی کی طرح کوئی بڑا ادبی حسن نہیں ہے بلکہ اس میں وہ تمام خرابیاں ہیں جو ایک پیش رو کے یہاں ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ادبی تاریخ میں ان کی اہمیت مسلم ہے اس لیے کہ اُنھوں نے نئے تقاضوں کو اپنے اندر جذب کر کے مستقبل کے امکانات پیدا کیے اور بعد میں آنے والوں کی گزرگاہوں کو روشن کر دیا۔

رام چندر کی یہ خصوصیت بھی نہایت درجہ اہم ہے کہ وہ ''تحصیل علوم انگریزی کے فوائد'' کے ساتھ،قوم اور ملک کی ترقی میں اردو زبان کی اہمیت کے شناسا تھے۔اس وقت مشرقی اور مغربی علوم کے حامیوں کے درمیان جو بحثیں چل رہی تھیں ان کا ذکر اوپر آچکا ہے۔یہاں صرف اس

---

[1] مراد تذکرۃ الکاملین مولفہ رام چندر

[2] یہ خط تذکرۃ الکاملین کے صفحہ ۲ سے لیا گیا ہے،یہ کتاب ''مصنفہ رام چندر مدرس علوم انگریزی ،مدرسہ سرکاری دہلی''،میں طبع ہوئی۔انگریزی کے خط پر تاریخ یکم اکتوبر سنہ ۱۸۴۹ء ، اردو کے خط پر ۲۳راکتوبر اور کتاب کے سرورق پر تاریخ طباعت ستمبر ۱۸۴۹ء درج ہے۔

کا اعادہ ضروری ہے کہ مشرقی علوم کے حامی انگریزی کے موافق ہی نہیں تھے بلکہ مغربی سائنس کے علم وعرفان میں اس کی جو بنیادی اہمیت ہے، اس پر بھی زور دیتے تھے لیکن وہ یہ قلم اس طرح لگانا نہیں چاہتے تھے کہ علوم قدیمہ کے اصل شجر کو نقصان پہنچے۔ وہ اس پیوند سے اس کی قوت نمو کو بڑھانا اور اس میں نئے برگ و بار لانا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ بے میل نہ ہوں بلکہ خوش نمائی اور بینائی دونوں کے لیے مفید ہوں۔ رام چندر بھی اسی صحت مند تعلیمی نظریہ کے موئد اور حامی تھے اور حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پہلے اردو کے کسی ادیب اور مفکر کی تحریروں میں مشرق و مغرب کے امتزاج اور احیائے علمی میں اردو کی اہمیت پر اتنا زور نہیں، جتنا رام چندر کے یہاں ہے۔

زبان کے سلسلہ میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے جو "ماسٹر رام چندر" کی مولفہ کو 'محب ہند' کے ایک مضمون پر غور نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اُنھوں نے جون سنہ ۱۸۴۸ء کے پرچہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ماسٹر رام چندر "ہندوستانی زبانوں میں نئے علوم و فنون کو منتقل کرنا بہت "دقت طلب" سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ انگریزی ہی کے ذریعہ سیکھے جاسکتے ہیں۔"[۱] محترمہ نے جو خیالات رام چندر سے منسوب کیے ہیں، وہ ان کے نہیں، مغربی علوم کے حامیوں (Anglicists) کے ہیں۔ اس مضمون میں رام چندر نے مشرقی اور مغربی علوم کی بحث کا ذکر کرتے ہوئے دونوں فریقوں کے خیالات پیش کیے ہیں۔

ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"بعض کی صاحبان انگریز میں سے یہ رائے ہے کہ اہلِ ہند کو علوم اور فنون بوساطت زبان انگریزی کے سکھانا چاہے (کذا) اور اس سے بہت فائدہ متصور ہوسکتا ہے۔ خلاف اس کے بعض صاحبان کی یہ رائے کہ ہندوستانیوں میں ترقی تحصیل علم اور فنون کی اس وقت ہوگی جب کہ کتب علوم اور فنون کی زبانوں انگریزی اور عربی اور شاستر میں سے ترجمہ اردو ہوکر یہاں کے لوگوں کو سکھائے جاویں جو لوگ طرف دار انگریزی راج کے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ "یہ سچ ہے کہ ترقی تحصیل علوم اور فنون کی بوساطت زبان مروجہ کے زیادہ آسانی سے متصور ہے بہ نسبت ایک بیگانہ ملک کی زبان کے سکھائے جاویں تو انھیں حاصل کرنا زیادہ آسان ہوگا، بہ نسبت اس کے کہ وہ اول زبان انگریزی میں استعداد کاملہ حاصل کر کے اس کی وساطت سے علوم اور فنون کے تحصیل میں مصروف ہوں لیکن ایک بڑی دقت ہندوستان میں یہ ہے کہ اس ملک میں ایک زبان مروج نہیں ہے یعنی یہ بات نہیں ہے کہ سارے باشندے ہندوستان کے

---

[۱] سیدہ جعفر: ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، انتخاب پریس، حیدرآباد، ص ٦٦

ایک بولی بولتے ہوں خلاف اس کے یہ پایا گیا ہے مختلف اضلاع اس ملک کے بولی جاتے ہیں (کذا) مثلاً بنگالہ میں اور بمبئی میں اور مدراس میں اور مارواڑ اور دہلی وغیرہ میں مختلف زبانیں مروج ہیں اور ان میں اس قدر فرق ہے کہ ان میں سے ایک ضلع کے رہنے والا دوسرے ضلع کے باشندوں کی بولی بالکل نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ محققوں نے دریافت کیا ہے کہ ہندوستان میں قریب ۵۶ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ پس یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم ہندوستان کے لوگوں کو بوساطت ان کی زبانوں کے علوم اور فنون سکھادیں تو کتب انگریزی وغیرہ کو ۵۶ مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنا چاہیے اور یہ بہت مشکل ہے۔"[1]

رام چندر مشرقی علوم کے خامیوں (Orientalists) کی طرح انگریزی کی علمی حیثیت کو تسلیم کرتے تھے لیکن ان کی میزان قدر میں سب سے زیادہ اہمیت اس کی تھی کہ مغرب کے بہترین سرمایہ کو اردو میں منتقل کیا جائے تا کہ مشرق اور مغرب کا سنجوگ فطری طور پر ہو سکے، تعلیم کے بہترین اصول مجروح نہ ہوں اور ان کا فائدہ زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ رام چندر نے اکتوبر ۱۸۴۷ء کے خیرخواہ ہند میں اپنے تعلیمی اور لسانی نقطۂ نظر کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> (انگریزوں نے) "شیوع علوم مفیدہ کے واسطے ہند میں تجویز کی)......اب بوساطت زبان انگریزی کے ذرا ذرا سے لڑکے ان مضامین کی تکرار آپس میں کرتے ہیں......وہ علوم جن کے نام سے بھی یہاں کے اکثر لوگ آگاہ نہیں تھے، اب بوساطت زبان انگریزی کے (ص ۳۱) اس قدر شیوع ہوئے ہیں کہ کوچہ کوچہ میں اون کا ذکر سننے میں آتا ہے لیکن یہاں ذرا یہ بھی دریافت کرنا ہے کہ ہندوستان میں کرورہا آدمی ہیں، اون میں سے کس قدر خلقت نے زبان انگریزی کو تحصیل کیا ہے؟ (بہت کم نے) زبان انگریزی ایک بیگانی زبان ہے اور اسی واسطے اوس کا تحصیل کرنا نسبت فارسی کے مشکل تر ہے......نسبت ہنود کے مسلمان بہت کم انگریزی تحصیل کرتے ہیں مثلاً رپورٹ مدارس انگریزی اضلاع کے مدارسِ انگریزی میں بیچ ۱۸۴۴ء کے ۱۱۴۶ ہندو اور صرف ۱۴۴ مسلمان زبان انگریزی تحصیل کرتے تھے۔ (بعض لوگ ایسے ہیں جو) ذرا واقفیت انگریزی سے حاصل

---

[1] محب ہند، مورخہ یکم جون سنہ ۱۸۴۸ء: عنوان، تربیت اہل ہند کے باب میں۔

کر کے اور حروف انگریزی لکھنا جان کر نقل نویس دفتر انگریزی میں
ہوجاتے ہیں۔پس ان میں (ص ۳۲) اور ناخواندوں میں کچھ تھوڑا سا
فرق ہوتا ہے۔غرض یہ کہ زبان انگریزی کے ذریعہ سے اوس قدر شیوع
علوم مفیدہ کا نہیں ہوسکتا ہے جس قدر کہ ضروری ہے تاکہ ہندوستان
کے آدمی وہ لیاقت اور عقل کریں جو بالفعل اہل فرنگ کو حاصل
ہے۔اب جو امید ہے کہ ایک دن اہل ہند عاقل اور عالی حوصلہ مثل
فرنگیوں کے ہوجائیں اس باعث سے ہوتی ہے کہ علوم اور فنون کی
کتابیں زبان اردو میں ترجمہ کی جائیں اور اوس کی وساطت سے ہند
کے آدمی علم حاصل کریں۔"[۱]

اردو کے متعلق رام چندر کی رائے یہ ہے:

"واضح ہو کہ زبان اردو ایسی ہے کہ بہت، بہت دور سمجھی جاتی
ہے......اور ظاہر ہے کہ وہی زبان باسانی تحصیل ہوسکتی ہے جس کے
سمجھنے میں چنداں مشکل نہ ہو۔اب اگر غور سے دیکھو تو دریافت ہوگا کہ
حیدرآباد دکن سے لگا کے سرحد نیپال اور دریائے اٹک اور شہر
صورت (کذا) سے شہر پٹنہ تک زبان اردو یعنی وہ زبان جو دہلی میں
لوگ بولتے ہیں، سمجھی جاتی ہے۔سوائے اردو کے کوئی ایسی زبان
ہندوستان میں نہیں ہے جس کا اس قدر زیادتی سے رواج ہو مثلاً بنگالی
زبان سوائے ملک بنگالہ کے اور کہیں نہیں سمجھی جاتی۔کشمیری زبان
سوائے ضلع کشمیر کے اور کہیں نہیں سمجھی جاتی ....لیکن اردو زبان
بہت جگہ سمجھی جاتی ہے۔حیدرآباد اور ناگ پور اور لکھنؤ اور پٹنہ اور لاہور
اور بہاول پور میں جو مختلف اضلاع ہندوستان میں فاصلوں بعید پر
واقع ہیں زبان اردو سمجھی جاتی ہے۔پس اگر اس زبان کی وساطت سے
علوم شیوع ہوں اور رواج پاویں تو حقیقت میں خلقت ہند کو بہت
فائدہ ہے۔"[۲]

رام چندر تعلیم میں قومی زبان کے منصب اور مقام کے محرم اور نئی تہذیب کے فروغ میں اس کی

---

[۱] خیر خواہ ہند، مورخہ اکتوبر ۱۸۴۷ء، ص ۳۰۔۳۱۔۳۲ عنوان "تربیت اہل ہند کا بیان۔" ہارورڈ

[۲] خیر خواہ ہند: اکتوبر ۱۸۴۷ء، ص ۳۲، عنوان "تربیت اہل ہند کا بیان۔" ہارورڈ لائبریری

تبلیغی اہمیت کے شناسا تھے۔ اُنھوں نے 'خیر خواہ ہند' میں اپنے خیالات کی مزید صراحت کی ہے اور نہ صرف اردو کی بے مثل صلاحیت، ہندوستان گیر مقبولیت اور تراجم کی افادیت پر زور دیا ہے بلکہ سرد مہر حکومت کو بھی توجہ دلائی ہے کہ وہ اردو کے مدرسے اور یونی ورسٹیاں قائم کرے۔ وہ لکھتے ہیں:

''چند سال سے چند صاحبان انگریز اور بعض رئیسان ہندستانی نے کئی ہزار روپیہ بطور چندہ کے جمع کر کے اوس روپے میں سے کتابوں (کذا) علوم اور فنون کو زبان انگریزی اور فارسی وغیرہ میں سے ترجمہ کرائیں (کذا) خلقت ہندوستان کی کو ان صاحبان کا بہت احسان ماننا چاہیے کیوں کہ ان عالی حوصلہ مردوں کی سعی سے کئی ہزار جلدیں مختلف علوم اور فنون مفیدہ کی اکثر تو انگریزی زبان میں سے اور بعض زبان فارسی وغیرہ میں سے ترجمہ ہوگئی ہیں اور باشندے یہاں کے اپنی خاص زبان میں وہ کتابیں پڑھ سکتے ہیں جو پہلے نہایت نایاب تھیں۔ ان صاحبوں کا جنھوں نے کتابیں اردو میں ترجمہ کرائیں ہیں ایک مجمع ہے اور سکرتر یعنی مہتمم اس مجمع کے کاروبار کے جناب ڈاکٹر سپرنگر صاحب بہادر ہیں جو بالفعل پرنسپل مدرسہ دہلی کے ہیں...... واضح ہو کہ جس قدر چاہیے...... اکثر مدارس سرکاری ایسے ہیں کہ جن میں زبان نہایت بے حقیقت شے ان مدارس میں سمجھی جاتی ہے...... (پس انگریزوں کو) بہت سی مدد زبان اردو کے شیوع کرنے میں لازم ہے...... (حکومت کی غرض صرف یہ ہے) طالب علم کچھ واقفیت اپنی زبان سے بھی حاصل کرلیں اور نہ یہ کہ (مغربی) علوم کو بہ وساطت زبان اردو کے حاصل کریں۔ یہ تو جب ہوتا ہے کہ وہ زبان انگریزی کو تحصیل کرتے ہیں۔ پس اس صورت میں زبان اردو، نسبت زبان انگریزی اور فارسی عربی وغیرہ کے حقیر رہی۔ حقیقت میں دیکھو تو کوئی مدرسہ اردو کا ہندوستان میں نہیں ہے۔ یہ زبان فقط اور زبانوں کے ضمن میں سکھائی جاتی ہے مثلاً دہلی میں چار مدرسہ انگریزی عربی اور فارسی شاستری کے ہیں لیکن کوئی مدرسہ اردو کا نہیں ہے...... گورنمنٹ کو چاہیے کہ زبان اردو کو اپنی دست گیری سے وہ بزرگی بخشیں جو اور زبانوں کو حاصل ہے۔ بالفعل زبان اردو میں ہر فن اور ہر علم کی

> کتابیں موجود ہیں اور موجود ہوسکتی ہیں......صاحبان گورنمنٹ کو لازم ہے کہ جیسے کہ مدرسہ انگریزی اور عربی وغیرہ اسی طور سے ایک یا دو مدرسہ بڑے بڑے شہروں میں اردو کے مقرر کریں اور وہاں زبان اردو سکھائی جائے اور اوسی کی وساطت سے ہر علم،......اور یقین ہے کہ اگر علم اور عقل، زبان انگریزی کی تحصیل سے چھ برس میں آتے ہیں تو وہ سب عقل اور علم اردو کے طالب علموں کو دو برس میں آجائے گی۔"[1]

انگریزوں کے اثر سے ہمارے ملک میں تین قسم کے ردِّ عمل ہوئے۔ ایک طبقہ تو انگریزوں سے زیادہ انگریز بن گیا لیکن اس کی عمر زیادہ نہیں ہوئی۔ دوسرا طبقہ ہندوستانی تہذیب کی مفاہمانہ روش کا رازداں تھا اور وہ اس مرحلہ پر بھی مشرق و مغرب کے فکر و خیال میں ایسا اتحاد اور امتزاج چاہتا تھا جو ہماری تہذیبی روایات سے ہم آہنگ ہو۔ تیسرا طبقہ قدامت پسند تھا جس کو مرجانا گوارا تھا لیکن انگریزی پڑھنا یا انگریزوں سے روابط رکھنا پسند نہیں تھا۔ باوجود عیسائی ہوجانے کے رام چندر کا شمار طبقہ اوّل میں نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے مسیحی مے خانہ میں جانے کا سبب پرانے علوم کی ''کم نگاہی'' سے زیادہ وہ ''تشنگی'' ہے جو جدید نے پیدا کی تھی۔ وہ دل سے زیادہ دماغ کی تسکین چاہتے تھے جاہ و منصب و ثروت نہیں۔ حیرت انگیز بات ان کا عیسائی ہونا نہیں۔ ان کے وہ مضامین ہیں جن میں ۱۸۵۷ء سے پہلے حب الوطنی کی تبلیغ اور انگریزوں پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ دراصل رام چندر کا تعلق دوسرے طبقہ سے تھا اور وہ پریس، صحافت اور نثر کے ذریعہ (جو دراصل اردو میں مغربی اثرات کی علامتیں ہیں) نئی اور صحت مند تبدیلیاں لانا چاہتے تھے اور تعلیم کی عمارت گہری لیکن وسیع بنیادوں پر کھڑی کرنا چاہتے تھے اس زمانہ میں جب کہ تاحدِ ناظر برطانوی اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا اور انگریزی سے بڑے بڑوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں، رام چندر کے تربیت یافتہ اور بالغ ادراک کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کو چند منتخب لوگوں کی ملک بنانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے یہاں تعلیم بانس کا پیڑ نہیں ہے جس کے تنے پر گانٹھیں ہی گانٹھیں ہوتی ہیں اور اوپر چند پتے نظر آتے ہیں بلکہ وہ اردو کے ذریعہ سائنسی تہذیب کی برکتوں کو عام کرنا چاہتے تھے اور ہندوستانیوں میں وہ ''لیاقت اور عقل'' پیدا کرنا چاہتے تھے جو ''بالفعل اہل فرنگ کو حاصل ہے'' اس علمی انقلاب کے لانے میں وہ اردو کی فطری صلاحیتوں سے باخبر اور اس کے ہندوستانی عناصر کے قدردان تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اردو کے دامن کو وسیع کرکے اسے اعلیٰ زبانوں کی صف میں شامل کیا جاسکتا

---

[1] خیر خواہ ہند، بابت اکتوبر ۱۸۴۷ء، ص ۳۴-۳۵، ہارورڈ لائبریری کیمبرج، امریکہ

ہے۔ جون ۱۸۴۸ء کے محب ہند میں لکھتے ہیں:

"ایک اور بات طرف داروں انگریزوں کو جاننی چاہیے (کذا) کہ زبان اردو میں مضامین شاعری وغیرہ کے چند برسوں سے بہت عالی بننے لگے ہیں اور بعض شاعر بالفعل ایسے موجود ہیں کہ وہ مرتبہ برابری کا اکثر شاعروں عربی اور فارسی اور انگریزی وغیرہ سے رکھ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اگر شاعر اردو کے توجہ کریں تو وہ ہر قسم کے اشعار جن کی زبانوں انگریزی اور رومی یونانی میں بہت شہرت ہے، بنا سکتے ہیں۔...... پس صاحبان عالی شان اس بات سے دل جمعی رکھیں کہ علم ادب اردو میں زیادتی سے ہے۔"[1]

رام چندر نے بار بار اس کا اعادہ کیا ہے کہ اگر اعلیٰ تعلیم کو وسعت دینا ہے تو اردو کو ترقی دینا ہوگی اور سنسکرت فارسی عربی اور انگریزی ہمارے درد کا مداوا نہیں ہوسکتیں۔ سنسکرت کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ "اپنی ذات سے ایک نہایت مشکل زبان ہے اور اس کا تحصیل کرنا بہت محنت چاہتا ہے پس برہموں میں سے بھی اس زبان میں کوئی کماحقہ، واقفیت حاصل نہیں کرتا تھا اور اکثر یہ ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے کہ جو جو باتیں دین اہلِ ہنود کی جو روزمرہ عمل میں آتی ہیں اونھیں فقط برہمن سیکھ لیتے ہیں اور علوم کو خوب تحقیقات سے سمجھنا اور اس کو اوروں کو بتانا ایک امر نہایت عجیب ہے۔"[2] رام چندر کو اس کا بھی افسوس ہے کہ ہندوستان کے قدیم علوم میں تحقیق کا دروازہ بند ہوگیا ہے اور ان پر توہمات کی کائی جم گئی ہے۔ ان کے فاضلوں نے "ایسے دریا بھی بیان کیے ہیں کہ جن کے مخزن یعنی جائے نکاس تو آسمان پر ہیں اور ان کی لہریں کرۂ چاند پر سے گزرتی ہیں۔"[3] اسی طرح مولوی "تکرار لفظی"[4] میں پھنسے ہوئے ہیں اور "منطق" اور "فقہ"[5] سے باہر نہیں نکلتے۔ "فارسی باز" رنگینی عبارت پر مرے جاتے ہیں:

"واللہ یہاں کے متصدیوں اہلِ قلم کا تو یہ نقشہ ہے کہ جہاں ایک دو

---

[1] محب ہند: جون ۱۸۴۸ء، ص ۵۱۔ ہارورڈ

[2] خیر خواہ ہند: یکم ستمبر ۱۸۴۷ء عنوان: "باعث کم شیوع ہونے علوم مفیدہ کا ہندوستان میں"، ص ۵۔ اسی سلسلہ میں بطور معذرت کے لکھتے ہیں "خفا کہ ہم نے اس جائے کچھ برہموں کی برائی کے طور پر نہیں لکھا ہے: ہارورڈ

[3] محب ہند: مئی ۱۸۴۹ء، ص ۵۰ ہارورڈ

[4] خیر خواہ ہند: یکم ستمبر ۱۸۴۷ء، ص ۱۵ ہارورڈ [5] ایضاً ص ۱۵

انشا کی کتاب اونھوں نے تحصیل کیں......اور کچھ ہندسہ اور رقم اور حساب روزمرہ سے آگاہی ہوئی اور اُنھوں نے فوراً قلم دان اُٹھایا اور کچہری میں کاروبار روزمرہ سیکھنے لگے۔۔یہی اسباب باعث کم شیوع ہونے علوم مفیدہ کا ہندوستان میں ہے۔.....(یہ لوگ کس طرح خلقت کی توجہ طرف امور ریاست کے پھیر سکتے ہیں......(ان کو چاہیے کہ اپنی عقل اور ذہن سے) مثل فاضلوں قدیم کے ایسی کلیں اور آلات اختراع کریں کہ اون کے استعمال سے خلقت کو عقل اور دولت حاصل ہو......(اہل فرنگ نے) یہ سبب اچھے قاعدہ تربیت کے اور تحصیل کتب مفیدہ کے اور باعث عمل میں لانے مشاہدات اور تجربات کے کیا کیا باتیں نکالی ہیں......ایک ایجاد ہونا جہاز دخانی کا اور دوسرے دخانی گاڑی کا۔"[1]

رام چندر یہ سائنسی تہذیب اردو کے ذریعہ پھیلانا چاہتے تھے۔اس معاملہ میں ان کی نظر تاریخ اور تعلیم کے اصولوں پر تھی۔فریڈرک اعظم اور چارلس پنجم نے جرمن زبان کو حقیر سمجھا، اسے اپنی قوت سے رائج نہ ہونے دیا لیکن بالآخر وہی سائنسی علوم کا گنجینہ بنی اور فرانسیسی سے آگے بڑھ گئی۔ پرتگالی اور فارسی کو اب ہندوستان میں کتنے لوگ جانتے ہیں؟ ٹھیک اسی طرح "انگریزی ایک بیگانی زبان ہے اور اسی واسطے اوس کا تحصیل کرنا نسبت فارسی کے مشکل تر ہے۔"[2] اگر ذہن کے جالے دور ہو سکتے ہیں اور ان طاقتوں کو نئے نقش و نگار سے سجایا جاسکتا ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ "علوم اور فنون کی کتابیں اردو میں ترجمہ کی جائیں۔"[3]

رام چندر نے دلی ورنا کولر ٹرانس لیشن سوسائیٹی[4] یا "انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنۂ ملکی" کا

---

[1] خیر خواہ ہند یکم ستمبر ۱۸۴۷ء، ص ۱۳-۱۴ [2] خیر خواہ ہند: اکتوبر ۱۸۴۷ء، ص ۳۱ ہارورڈ

[3] خیر خواہ ہند: اکتوبر ۱۸۴۷ء، ص ۳۱ ہارورڈ

[4] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: خیر خواہ ہند اکتوبر ۱۸۴۷ء ص ۳۴۔ رسالہ اردو جلد ۱۹۳۳ء، ص ۴۴۷ اور Calcutta Review, Vol.14, July-Dec.1850,pp.187-188 کلکتہ ریویو کے اس پرچہ میں لکھا ہے کہ یہ سوسائیٹی ۱۸۴۶ء تک ۱۴ ہزار صفحے سولہ ہزار روپے کی لاگت سے چھاپ چکی ہے۔ان میں زیادہ تر کتابیں ریاضی، سائنس، انجینری، سروے آراضی، زراعت، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات اور قانون سے متعلق ہیں۔ اخبار الاخیار مظفر پور ضلع ترہت کی اشاعت مورخہ یکم اگست ۱۸۶۹ء میں لکھا ہے "روڑکی انجینئرنگ کالج اور آگرہ اور لاہور کے میڈیکل کالج کا ورناکلر ڈیپارٹمنٹ اس بات کا ثبوت کامل ہے کہ اردو زبان کو یہ قابلیت حاصل ہے کہ بذریعہ اس کے تعلیم علوم یورپ کی بخوبی ہوسکتی ہے۔" اس کے بعد اخبار مذکور نے آگرہ کالج، ڈاکٹر اشپرنگر، دہلی اورینٹل سوسائٹی کے زیر اہتمام ان اردو تراجم کا ذکر کیا ہے جو اعلیٰ درجہ کے ہیں اور یورپی زبان سے اردو میں ہوئے ہیں (ص ۳۳۱) (قیام کلکتہ کی یادداشتیں از مقدمہ نگار)۔

جابجا ذکر کیا ہے جو ۱۸۴۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے پہلے سکریٹری پرنسپل بوترو (Boutros) اور ان کے بعد ڈاکٹر اشپرنگر مقرر ہوئے لیکن اس کے کاموں میں بہت بڑا حصّہ دلی کالج کے استادوں اور بعض سینئر طالب علموں کا تھا جن میں رام چندر کا نام دونوں حیثیتوں سے نمایاں ہے۔ اس انجمن کی کوشش سے ترجمہ کے صحیح اصول وضع ہوئے، بہت سی انگریزی کتابیں اردو میں منتقل ہوئیں اور اس کا دامن سائنسی علوم سے بھر گیا۔ اس سے کچھ پہلے حیدر آباد دکن کے شمس الامرا کبیر ثانی کے اہتمام سے مغربی سائنس کی کتابوں کے اردو میں تراجم ہوئے (۱۸۳۷ء و ۱۸۴۱ء) لیکن دلی کالج کے مصنفین اور اس کے مترجم رام چندر کا کام نہ صرف زیادہ منظم اور وسیع تھا بلکہ وہ اردو زبان کے ایسے معیاروں اور ترجمہ کے ایسے اصولوں پر مبنی تھا کہ آج بھی ہم ان سے کام لے سکتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر زیادہ فطری اور لسانیاتی تھا اور ان کی زبان میں فارسی سے زیادہ، دلی کی بولی کا رس اور کس بل تھا۔

اردو نثر کی تاریخ میں رام چندر کی یہ تقدیمی حیثیت بھی لائق احترام ہے کہ اُنھوں نے اردو کو مضمون یعنی ''اسے'' سے روشناس کرایا اور ان سائنسی عنوانات پر مقالات لکھے جن کی کمی ہم آج بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں ہمارے شوق کی واماندگی نے شاعری اور تصوف کی پناہیں ڈھونڈ لی تھیں اور یہ دونوں سرحد ادراک سے پرے اور سائنسی حقائق سے دور تھیں۔ اسی لیے اردو نثر صدقِ بیان سے عاری تھی اور اس کا ذخیرۂ الفاظ تنگ نائے غزل تک محدود تھا۔ رام چندر کے مضامین میں نثر کی وضاحت اور راستی تو ہے لیکن اس کا حسنِ تناسب نہیں۔ اس وقت سائنس پر مضامین لکھنے کے معنی دراصل ایک نئی زبان کے وضع کرنے کے تھے جس سے ہمارے کان ناآشنا تھے۔ اس لیے ان سے قواعد کی پابندی، زبان کے چٹخارہ اور اسلوب کی دل آویزی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ افلاطون کے مکالمات کا ایک مسودہ جو اس کی وفات کے بعد ملا ہے، اس میں ایک پیراگراف ستر دفعہ لکھا گیا ہے۔ دلّی کالج کے محمد حسین آزاد کا اسلوب واقعی ''ہر صفحش چمنے'' اور ''ہر سطرے انجمنے'' ہے لیکن ان کے مسودے مسلسل اصلاح و ترمیم سے ''لالہ زار'' بن گئے ہیں۔ رام چندر کے یہاں یہ ریاضت مفقود ہے۔ بعض مضامین انھوں نے بول کر لکھوائے ہیں اور غالب کی زبان میں دل لگا کر اور قلم سنبھال کر نہیں لکھا۔ ان کی نثر ان کے مسلک و مشن کے زیر اثر' ان اسلوبی نفاستوں کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے، جس کو دراصل مغربی اثرات کی موافقت میں ردِّ عمل اور تبدیل شدہ حالات سے مفاہمت کی ایک ادبی کوشش سمجھنا چاہیے۔

رام چندر نے صحافی کی حیثیت سے جو خدمات انجام دی ہیں، ان سے بھی ایک ادبی مورخ

دامن کشاں نہیں گزر سکتا۔ اس معاملہ میں بھی ان کا نظریہ وہ تھا کہ:

''خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

بلکہ ان کی صحافت چند مقاصد کے تابع تھی۔ خیر خواہ ہند کی پہلی اشاعت میں اپنے اغراض و مقاصد انگریزی کے سرورق پر بیان کرتے ہیں:

۱: اہل ہند کو صاف اور سلیس زبان میں مفید علمی معلومات بہم پہنچانا
۲: ان کے اخلاقی کردار کو سنوارنے کے لیے بہترین تجویزیں پیش کرنا
۳: ان رکاوٹوں کو دور کرنا جو قوم (Nation) کی حیثیت سے ان کی تہذیبی ترقی میں مانع ہیں۔
۴: پڑھنے والوں کو شمالی مغربی صوبہ کے ورنا کلر لٹریچر سے باخبر کرنا

نوٹ: یہ اردو کا ماہنامہ اگرچہ رتبہ میں کم ہے لیکن انگریزی اور یورپی زبانوں کے طرز پر نکالا گیا ہے۔[۱]

یہاں رام چندر نے ''نیشن'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور اپنے اخبار اور رسالہ میں حب الوطنی[۲]، قوم کے امراض و اوہام اور اس کی ترقی کے وسائل و ذرائع پر مضامین لکھے ہیں اور وہ بھی سریندر ناتھ بنرجی، بپن پال اور ہریش چندر سے بہت پہلے، جب کہ یہ حضرات ہماری زبانوں میں ''قوم'' اور ''ملک'' کے الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔[۳] رام چندر کا یہ رجحان دراصل انگریزی تعلیم کا مرہون ہے جس نے بقول شخصے ہڈیوں میں جان پیدا کر دی تھی۔[۴]

رام چندر کی جو تحریریں فوائد الناظرین اور خیر خواہ ہند یا محب ہند کے صفحات پر نظر آتی ہیں، ان

۱۔ خیر خواہ ہند مورخہ یکم ستمبر ۱۸۴۷ء جلد اوّل صفحہ، نیز ملاحظہ ہو فوائد الناظرین، مورخہ ۱۶ر ستمبر سنہ ۱۸۴۷ء، قیام حیدر آباد کی یاداشتیں مملوکہ مقدمہ نگار۔

۲۔ فوائد الناظرین ج ۵، نمبر ۲۱ مورخہ، ۲۰ر اکتوبر سنہ ۱۸۵۰ء رام چندر ''حب الوطنی کو کارفرما کر'' ہندوستانیوں کو ''دخیل کاروبار گورنمنٹ'' کرنا چاہتے تھے۔ ان کو افسوس ہے کہ ''کم ہمتی جو اہل ہند کا خاصہ ہے اس کی باعث سے وہ ہمیشہ غلامی میں رہے ہیں اور دیکھیے کب تک رہیں گے'' ان کو آزاد گورنمنٹ کا تصور ہی نہیں'' رام چندر نے تعلیم نسواں، ضبط و نظم، گونگوں اور بہروں کی تعلیم، تقدیر، عام توہمات، اوقات کے صرف، برق و صاعقہ، خوردبین، بخارات، امید، بالغوں کی تعلیم وغیرہ موضوعات پر بھی مضامین شائع کیے ہیں۔

3- B.T.McCully: English Education and the origins of thd Indian Nationalism, New York,1940,p.240

4- B. T. McCully--p.242

پر ان مقاصد کا پرتو ہے۔ اس لیے ان کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن تاریخ کی یہ بوالعجبی بھی خوب ہے کہ ان کے اجتہادات کو فراموش کر دیا گیا اور جدید ادب کی قیادت اور امامت کا تاج سرسید کے سر پر رکھا گیا، حالاں کہ رام چندر کی تاریخی اولیت میں شبہ نہیں اور ان کا تعلیمی اور لسانی نقطہ نظر بھی سرسید کے مقابلہ میں زیادہ صحت مند ہے۔ سرسید کی مجبوریاں تسلیم مگر وہ رام چندر کی طرح اورینٹل کالج کے حامی نہیں تھے اور قومی سیرت کی تشکیل بھی اپنی بنیادوں سے زیادہ مغربی بنیادوں پر کرنا چاہتے تھے۔ انگلستان سے آکر وہ مشرقیت کے تصور کو بہت زیادہ فرسودہ اور اردو کو بڑی حد تک تہی دامن سمجھنے لگے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے ڈاکٹر لائٹنر (W.G.Leitner) سے بڑے بڑے معرکے ہوئے جو پنجاب میں جدید سائنسی علوم کی تعلیم اردو کے ذریعہ دینا چاہتے تھے۔[1] لیکن تاریخ کی اس بوالعجبی کے (جس کا اوپر ذکر کیا گیا) مختلف اسباب ہیں۔ اوّل تو تاریخی اولیت اور ادبی امامت لازم وملزوم نہیں ہیں۔ ادبی امامت بغیر تاریخی اوّلیت کے بھی ممکن ہے۔ دوسرے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں دہلی کالج کو زبردست نقصان ہوا۔ ۱۸۷۷ء میں اسے بند کر دیا گیا۔ اس کی ''اقدار'' ختم ہوگئیں اور انگریزوں کی پالیسی کا وہ دور شروع ہوا جس کا مقصد ملکی اختلافات کو بڑھانا تھا۔ تیسرے رام چندر نے ''فرزند آذر'' کی سنت پر عمل کر کے اپنے ''غیر مقلد'' ہونے کا ثبوت تو دے دیا لیکن اس کی قیمت بھی بڑی ادا کی۔ ان کے کام کا دائرۂ اثر محدود ہوگیا اور وہ خود بھی پایانِ عمر میں عیسائی مبلغ ہو کر رہ گئے! اس کے برخلاف راجہ رام موہن رائے اور سرسید سوادِ اعظم سے نہیں پھرے۔ اس راہ میں بڑی کڑیاں جھیلیں اور بڑی کڑی باتیں اُٹھائیں۔ سرسید کو تو دجال، کافر، عیسائی، نیچری سب ہی کچھ کہا گیا لیکن وہ برابر قدیم و جدید کو قریب لانے کی کوشش کرتے رہے اور اُنھوں نے اپنی پُرسوز شخصیت سے نہ صرف معاشرہ کے تعاونی اجزا کو بیدار کر دیا بلکہ اپنے گرد ایک وسیع حلقہ بھی پیدا کر لیا۔ اسی لیے ان کی حیثیت حال میں مقید فرد کی نہیں، مستقبل پر اثر انداز ہونے والی تحریک کی ہے۔ رام چندر سائنس اور ریاضی کے استاد تھے، قومی لیڈر نہیں۔ اسی لیے ان کی عبارت روکھی ہے اور اُس جوشِ بیان اور زورِ قلم سے خالی ہے جو سرسید کی خصوصیت ہے۔ رام چندر کے کارنامے عصری اسٹیج پر ضرور رونما ہوئے اور اُنھوں نے لذتِ کاوش کے مقابلہ میں ذوقِ نظر بھی فراہم کیا لیکن ان کی پرچھائیاں شاید فضا میں تحلیل ہوگئی ہوتیں اگر سرسید اور ان کے رفقا (جن میں بعض رام چندر کے شاگرد تھے) ان کے کام کے بعض حصّوں سے فائدہ نہ اُٹھاتے اور ان کو اپنی تحریک کا جزو بنا کر عام نہ کرتے بلکہ یوں

1- J.M.S.Baljon-The Reforms and Religious Ideas of Sir Sayyid Ahmad Khan: Lahore, 1958 p. 45-Footnote.

کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ رام چندر نے سرسید کا راستہ آسان کردیا۔ اگر دہلی کالج کی یہ بنیاد نہ ہوتی تو جدید نثر کا یہ ایوان رفیع بھی اتنی جلد قائم نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ تاریخی تسلسل کی ہر کڑی بجائے خود اہم ہے بلکہ وہ ارتقا کے عمل کو سنوارتی ہے اسی لیے رام چندر کی خدمات کا عدم اعتراف ناسپاسی ہی نہیں، تاریخی غلطی بھی ہے۔

رام چندر کی علمی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُنھوں نے فکر و نظر اور ترک و اختیار کے نئے پیمانے دے کر اور صحافت، تنقید و ترجمہ اور مقالہ نگاری کے نئے معیار قائم کرکے اردو نثر کی کشتِ ویران کو رہگوار باد ہونے سے بچالیا اور اس میں یہ صلاحیت پیدا کردی کہ وہ آنے والے زمانہ کا ساتھ دے سکے۔ اس میں دل کو کھینچنے والے ابھار کم ہیں لیکن اس پر ایک بڑے مقصد کی چھوٹ، نیک نئے تمدن کا پرتو ہے۔ ان کی تحریروں اور مضمونوں کو پڑھ کر انشاپردازی کا لطف نہیں آتا، ادبی مسرت حاصل نہیں ہوتی لیکن یہ نثر نئے زمانہ کا اشاریہ ہے۔ اس میں رہبری وار رہنمائی کی صلاحیت اور افادیت اور عقلیت کی جلوہ گری ہے۔

رام چندر کا کام یقیناً اس کا مستحق ہے کہ اس کا ادب کے بڑے نقشہ میں جائزہ لیا جائے اور اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کی جائے۔ دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو نے یہ مانوگراف اسی ضرورت کے پیش نظر تیار کروایا ہے جو دراصل ایک پروگرام کا حصّہ ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ دبستان دہلی کی تمام اہم شخصیتوں اور تحریکوں پر تحقیقی مانوگراف تیار کرائے جائیں تا کہ تاریخ کے ضروری گوشے سامنے آجائیں، ادب کی کھوئی ہوئی کڑیاں مل جائیں اور اس کی مفصل اور جامد تاریخ مرتب کرنے میں سہولت ہو۔

رام چندر پر یہ مانوگراف اس سلسلہ کی پہلی کوشش ہے اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس خدمت کو صدیق الرحمن قدوائی صاحب نے شعبہ اردو کی طرف سے بڑی محنت اور سلیقہ کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اُنھوں نے دہلی، رام پور، پٹنہ، کلکتہ اور حیدرآباد کے کتب خانوں میں بیٹھ کر مواد جمع کیا ہے اور اسے اس حسن ترتیب سے جلوہ گر کیا ہے کہ عہد متعلقہ کی ایک تصویر اور رام چندر کے رام چندر کے ذہن اور زمانے کے نقوش سامنے آگئے ہیں۔ قدوائی صاحب نے مستند مآخذ کی مدد سے نہ صرف حیاتِ رام چندر کی ترتیب، صحیح تاریخوں کی دریافت اور ان کے رسائل و تصانیف کی نشان دہی میں کاوش کی ہے بلکہ تنقیدی اور عمرانی اصولوں کو سامنے رکھ کر ان کے افکار و خیالات کا بھی جائزہ لیا ہے اور اردو ادب میں ان کے درجہ کا تعین کیا ہے۔ مجھے امید ہے ان کی یہ سعی مشکور ہوگی اور اس سے ہماری بصیرتوں میں اضافہ ہوگا۔

اگر ''شب ہائے ہجر'' کو بھی شمار میں رکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ رام چندر پر ایک اچھے

مانوگراف کا خیال ۱۹۵۳ء سے ہمارے ذہن میں تھا۔ جب قدیم دلی کالج نمبر مرتب ہوکر منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں دہلی یونی ورسٹی کے ارباب اختیار اور قبلۂ چشم و دل ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے اس منصوبہ کو پسند فرمایا اور اسے عملی شکل دینے کے لیے صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب کا تقرر ہوا جنھوں نے دن رات ایک کر کے اس مانوگراف کو تیار کیا اور اس نقش کی درستگی میں ''دل و نگاہ و نفس'' لگا دیا۔ رام چندر پر یہ کتاب اگست ۱۹۶۱ء سے پہلے شائع ہو چکی ہوتی لیکن اسی زمانہ میں میرا امریکہ آنا ہو گیا اور مجھے ندامت اور افسوس ہے کہ اس کے پرنٹر پرنسپل شہاب الدین دسنوی صاحب کو مقدمہ کے انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑی لیکن اس تاخیر سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھے انڈیا آفس لائبریری لندن، لائبریری آف کانگریس واشنگٹن اور ہارورڈ یونی ورسٹی لائبریری میں کہیں نہیں ملا اور ان صفحات پر پہلی دفعہ جلوہ گر ہوا ہے۔ میں اس کتب خانہ کے منتظمین کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے مجھے مطالعہ کی تمام سہولتیں بہم پہنچائیں۔ ان ہی کی مدد سے خیر خواہ ہند یا محب ہند کے جو پرچے مل سکے ان کے مضامین کی تشریحی فہرست بھی ضمیمہ ۲ میں دے دی گئی ہے تاکہ قدوائی صاحب نے جو 'فوائد الناظرین' سے شروع کیا تھا وہ بقدر امکان پورا ہو جائے۔ آخر میں دسنوی صاحب کی عنایت اور نوازش کا شکریہ واجب ہے جن کی اعانت کے بغیر یہ کتاب کبھی بھی اتنی خوب صورت شائع نہ ہوتی۔

شعبۂ علوم ہند۔ یونی ورسٹی آف وس کان سن
مے ڈی سن: جمعہ ۱۸ / اکتوبر ۱۹۶۲ء

خواجہ احمد فاروقی

مخففات

اس کتاب کے حواشی میں مندرجہ ذیل مخففات استعمال کیے گئے ہیں:

N.A.I. :	National Archives of India
Memoirs:	A Memoire of Professor Yesudas Ram Chandra of Delhi, by Edwin Jacob.
Treatise :	A Treatise on the Problems of Maxima and Minima, by Ram Chandra(With Editor's preface by Prof. Augustus De Morgan)

پیش لفظ

اردو نثر کے ارتقا کی تاریخ میں قدیم دہلی کالج کا جو اہم حصّہ ہے اس کی طرف ابھی تک خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ دہلی کالج محض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں یہ ایک تہذیبی تحریک کا داعی بھی تھا، جس نے اپنی سرگرمیوں سے سارے شمالی ہند کو متاثر کیا۔ اس کا مقصد مشرق و مغرب کا ذہنی و فکری بُعد کم کرنا، دونوں تہذیبوں کی اعلیٰ ترین اقدار کو ایک مرکز پر مجتمع کرنا اور ہندوستانی تہذیب کی ان اندرونی قوتوں کو جو سیاسی و معاشی خلفشار کی بدولت شل ہو رہی تھیں دوبارہ سرگرم عمل کرنا تھا۔ اس تحریک کا سب سے اہم اور قابل قدر پہلو یہ تھا کہ اس نے مغرب کے اثر سے مغلوب ہو کر ہندوستانی تہذیب کی اعلیٰ اقدار کو بھلایا نہیں بلکہ مختلف تہذیبوں کے امتزاج کے عمل کو جو ہمیشہ سے ہندوستان کے تہذیبی ارتقا کا محرک تھا اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق ایک بار پھر جاری کرنے کا عزم کیا۔ اردو زبان ملک کے اس عظیم تہذیبی سرمایے کا ہی ایک اہم جزو تھی اس لیے وہ اس تحریک سے نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ اس کی توسیع اور فروغ کا وسیلہ بھی بنی۔ چناں چہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بھی یہ دور ایک اہم ارتقائی منزل ثابت ہوا جس نے مستقبل کے لیے بیش بہا سرمایہ چھوڑا۔ اس لیے اردو زبان و ادب کے مطالعے میں اس دور کے اداروں اور شخصیتوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

دہلی کالج قومی بیداری کی ایک وسیع تحریک کا جزو تھا جو مختلف گوشوں میں بہ یک وقت پروان چڑھ رہی تھی۔ اس کا آغاز بنگال سے ہوا تھا، سیاسی و معاشی نظام میں تبدیلیوں کے ساتھ بیداری کی یہ لہر دہلی پہنچی اور پھر سارے شمالی ہند پر محیط ہوگئی۔ شمالی ہند میں اس اہم تحریک سے وابستہ شخصیات میں رام چندر سے زیادہ ممتاز تھے۔ ذہنی و فکری اعتبار سے انھیں راجا رام موہن رائے اور سرسید احمد خاں کے گروہ میں شامل کیا جاسکتا ہے مگر ایک حیثیت سے وہ ان سے

ممتاز بھی ہیں۔ راجا رام موہن رائے اور سر سید احمد خاں کی اصلاحی تحریکات مشترک اصول و نظریات کی حامل ہونے اور قومی ضروریات کے ادراک و احساس رکھنے کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں سے علاحدہ علاحدہ مخاطب تھیں، جب کہ دہلی میں پروان چڑھنے والی تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے قطعاً سیکولر تھی۔ رام چندر ہندوؤں اور مسلمانوں سے بہ یک وقت مخاطب تھے اور ان کے نزدیک ہندوستان کی عام ذہنی پس ماندگی ہی اس کی تباہی کا سبب تھی جس کے لیے ہندو اور مسلمان یکساں طور پر ذمہ دار تھے اور انھیں اس تاریکی سے نکالنے کے لیے ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت تھی جو دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ثابت ہوسکیں۔ ہندوستان کے مختلف النوع عناصر کی جداگانہ خصوصیات کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ اسے بنیادی طور پر ایک قوم تصور کرتے تھے اور اسی نقطہ نظر کو وہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیلانا چاہتے تھے۔ جس دور میں قومیت اور قوم پرستی کے تصورات کا ہندوستان میں محض آغاز تھا، اس وقت ان نظریات کی تبلیغ ایک حیرت انگریز کارنامہ تھا۔ اس سے ایک اعلیٰ سیاسی و سماجی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ ان ہی کی بدولت اردو زبان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اس دور تغیر میں جب کہ عام طور پر مستقبل کی راہ بھائی نہیں دیتی تھی وہ ملک کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ طرز فکر کی ترجمانی کے قابل ہوئی۔ اس سے خود اردو زبان و ادب میں نئے موضوعات، نئے اسالیب اور نئے رجحانات نمودار ہوئے اور ایسی تبدیلیاں آئیں جن کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی۔

افسوس ہے کہ یہ عظیم الشان تحریک ۱۸۵۷ء کے سانحے کی نذر ہوگئی۔ مشرق و مغرب کے صحت مند امتزاج کا جو آزادانہ عمل شروع ہو چکا تھا اور شمالی ہند میں دہلی کالج کی سرکردگی میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا اپنے عروج پر پہنچنے سے بہت پہلے، غلامی کے آغاز کے ساتھ ساتھ ختم ہوگیا اور رام چندر جیسی شخصیات بھی دراصل اسی کی نذر ہوکر گوشۂ گمنامی میں پہنچ گئیں۔ یہ ساری داستان بس اس دور کے اخبارات، سرکاری دستاویزات اور دوسری یادداشتوں ہی میں محفوظ رہ گئی۔ ایک عرصے بعد سی۔ ایف۔ اینڈریوز (C.F. Andrews) نے اپنی مشہور تصنیف Zakaullah of Delhi کے ذریعے دہلی کالج، اس سے وابستہ شخصیات اور اس تہذیبی رجحان کو جو کہ حکومت برطانیہ کی حکمتِ عملی کی بدولت بھلایا جا چکا تھا پھر ملک کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس طرف تھوڑی بہت توجہ دی جانے لگی۔ پرسی ول اسپیر (Percival Spear) نے اپنی کتاب Twilight of the Moghals میں مغلوں کے دورِ زوال میں جنم لینے والے اس امید افزا پہلو پر روشنی ڈالی۔ مولوی عبدالحق نے "مرحوم دہلی کالج" کے نام سے اپنی اہم تحقیقی تالیف میں دہلی کالج کے بارے میں مفصل معلومات بہم پہنچائی اور اس ادارے کی ممتاز شخصیتوں کے

بارے میں بھی بیش بہا مواد پیش کیا۔ چوں کہ اس کتاب کا موضوع بہت وسیع تھا اس لیے رام چندر کی زندگی اور کارناموں پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی پھر بھی اس کے ذریعے اردو میں پہلی بار رام چندر کے کارناموں کی نشان دہی ہوئی اس لیے یہ کتاب اہمیت رکھتی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب کے علاوہ اظہار الحسن صاحب، عتیق صدیقی صاحب، عبدالستار صدیقی صاحب، قالم علی سجن لال صاحب، امداد صابری صاحب اور پنڈت برج موہن کیفی مرحوم نے بھی رام چندر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کے علمی، ادبی کارناموں کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے اہم اور قابلِ قدر مواد پیش کیا۔ ان حضرات کی زیادہ تر توجہ صحافت پر رہی اور رام چندر کی زندگی کے بارے میں انھوں نے مولوی صاحب کی تحقیق سے ہی استفادہ کیا۔ ابھی چند دن ہوئے ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد سے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تالیف کی ہوئی ایک اور کتاب "رام چندر: اردو کے ارتقا میں ان کا حصّہ" شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب اس لیے اہم ہے کہ اس میں رام چندر کے مضامین کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ مولفہ نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں رام چندر کی زندگی اور کارناموں پر قدرے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے مگر کتاب کا مقصد مضامین کا انتخاب تھا شاید اسی لیے اس میں بھی رام چندر کی شخصیت، تصانیف اور افکار و خیالات کا مفصل جائزہ نہیں لیا جاسکا اور نہ اس سیاسی و سماجی تحریک کے پس منظر میں رام چندر کی شخصیت اور کارناموں کو دیکھا گیا جس کا رام چندر کی ذہنی تربیت میں بنیادی حصّہ تھا۔

راقم الحروف نے اس کمی کو پورا کرنے کی ایک حقیر کوشش کی ہے۔ مگر اس میں مزید چھان بین کی ابھی بہت گنجائش باقی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اس کتاب میں جو خامیاں رہ گئی ہیں انھیں دوسرے حضرات دور کریں گے۔

میں نے اس سلسلے میں رام چندر کے رسالے اور اخبار کے علاوہ اس دور کے دوسرے اخبارات اور سرکاری دستاویزات سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ دو اور کتابوں سے بھی جو شاید دوسرے فاضل محققین کو ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی تھیں اور جن کی اس سلسلے میں بنیاد اہمیت ہے، جا بجا استفادہ کیا گیا۔

اس میں سے ایک خود رام چندر کی مشہور تصنیف رسالہ مسائل کلیات و جزئیات "A Treatise on the Problems of Maxima & Minima" کا سنہ ۱۸۵۹ء کا چھپا ہوا لنڈن اڈیشن ہے اس کا مقدمہ جو پروفیسر آگسٹس ڈی مارگن (Augustus D. Morgan) پروفیسر ریاضی لندن یونی ورسٹی نے لکھا تھا اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں

رام چندر کی خودنوشت سوانح کے بھی چند حصّے شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے شاید زیادہ تر اسی سے استفادہ کیا تھا کیوں کہ رام چندر نے اپنے بارے میں جو باتیں سہواً لکھ دی تھیں وہ عبدالحق صاحب کے ہاں بھی نظر آتی ہیں۔

دوسری کتاب A Memoire of Professor Yesudas Ram Chandra of Delhi ہے رام چندر کی یہ سوانح مسٹر ایڈون، جیکب (Edwin Jacob) نے لکھی تھی جو ۱۹۰۲ء میں دہلی ایس، جی، پی، مشن (Delhi S.G.P. Mission) کی جوبلی کے موقع پر شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ان کی زندگی کے مذہبی پہلو پر روشنی زیادہ ڈالی گئی ہے پھر بھی اس سے بہت سی ایسی باتوں کا پتہ چلتا ہے جو ابھی تک معلوم نہیں تھیں۔ یہ دونوں کتابیں ہر دیال لائبریری (سابق ہارڈنگ لائبریری) دہلی میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب میں ہردیال لائبریری (دہلی) نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (نئی دہلی) رضا لائبریری (رام پور) خدا بخش لائبریری (پٹنہ) نیشنل لائبریری (کلکتہ) ادارۂ ادبیات اردو، کتب خانہ سالار جنگ، اسٹیٹ لائبریری اور عثمانیہ یونی ورسٹی لائبریری (حیدرآباد) کے بیش بہا ذخیروں سے بھی بہت مدد ملی۔ میں ان سب کتب خانوں کے معزز مہتمموں اور کارکنوں کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں اور اس کام میں ہر ممکن تعاون کیا۔ جناب قاسم علی سجن لال صاحب ریڈر شعبہ تاریخ عثمانیہ یونی ورسٹی (حیدرآباد) کی عنایات کا خاص طور پر ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے ذاتی کتب خانے سے مستفید ہونے کا موقع دیا اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

یہ کتاب پہلی بار دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کی طرف سے "دبستان دہلی" سے متعلق تحقیقی اسکیم کے تحت پیش کی گئی تھی۔ یہ بات میرے لیے باعث فخر ہے کہ اس منصوبے کا پہلا کام میرے سپرد کیا گیا۔ یہ بھی میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب (صدر و بانی شعبہ اردو) کی نگرانی میں مجھے ریسرچ فیلو کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ میں وہاں لکچرر اور ریڈر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ فاروقی صاحب کی ہی بدولت دہلی یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو قائم ہوا اور تحقیق و تدریس کو فروغ ہوا۔ ان کی گہری دل چسپی حوصلہ افزائی اور شفقت و عنایت کا میں ہمیشہ ممنون رہوں گا کہ اس کے بغیر میں یہ اہم ذمہ داری لینے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اب ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی صفات خصوصاً علمی و ادبی خدمات آئندہ بھی یاد رکھی جائیں گی۔ دہلی یونی ورسٹی اور شعبہ اردو نے مجھے جس کام کے قابل سمجھا اسے نباہنے کی میں نے کوشش کی ہے۔ کہاں تک کامیاب ہوسکا ہوں اس کا فیصلہ ناظرین کرام ہی کرسکیں گے۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

پہلا باب

رام چندر کا زمانہ

رام چندر کے کردار و افکار کی نشو و نما میں ان کے عہد اور اس کے بارے میں ان کے شعور کا غیر معمولی حصہ ہے۔ وہ حالات سے متاثر بھی ہوئے اور ان پر اثر انداز بھی۔ انھوں نے اپنے زمانے کے ہندوستان کے مسائل کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد جو نتائج اخذ کیے تھے ان کی اشاعت کو اپنا نصب العین بنایا۔ ان کے کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے اس پس منظر کا جائزہ لینا ضروری ہے جس میں ان کی شخصیت جلوہ گر ہوئی۔

رام چندر کا دور ہندوستان میں شہنشاہی نظام کے انحطاط کا آخری دور تھا۔ سترہویں صدی کی معاشی خوش حالی اور بیرونی بازاروں میں اس کی تجارتی ساکھ رفتہ رفتہ اس کے بڑھتے ہوئے سیاسی بحران کی نذر ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں معاشی تنظیم کے فقدان اور اپنے قومی و بین الاقوامی تجارتی مفاد سے بے پروائی کی بدولت انگلستان اور دوسرے یورپی ممالک نے اپنے ملکی مفادات کے پیش نظر ہندوستانی اشیا کی برآمد کے خلاف کامیاب مدافعانہ اقدامات کیے۔ سیاسی خلفشار نے انھیں یہاں کی اندرونی صنعت و تجارت پر بھی حاوی ہونے کا موقع دیا جس سے انھوں نے حتی الامکان فائدہ اُٹھایا۔ اس طرح ہندستان رفتہ رفتہ اپنی آزاد اور مقتدر حیثیت کھو کر ایک بڑھتے اور پھیلتے ہوئے سامراج کے سیاسی و معاشی نظام کا جزو بن گیا۔ ہندوستان کی تمام کمزوریاں انگلستان کی قوت میں اضافے کا باعث بنیں اور برطانیہ کے معاشی اقتدار کے جلو میں اس کا سیاسی اقتدار بھی اس سرزمین پر چھاتا چلا گیا۔[1]

''اصلاح'' ''نشاۃ ثانیہ'' اور پھر امریکی اور فرانسیسی انقلابات کی بدولت پیدا ہونے والی بیداری و

---

[1] Tara Chand: History of Freedom Movement in India, Vol.1, pages. 359-92

ذہن اور آزادی فکر کے ساتھ ساتھ تجارت وصنعت کی ترقی، نئی سرزمینوں کی دریافت اور نئے آلات کی ایجاد نے یورپی اقوام کو تجربات کا زبردست سرمایہ بہم پہنچایا۔ مغربی دنیا میں صنعتی انقلاب رونما ہوا۔ سیاسی مرکزیت نے ''قومیت'' اور ''قوم پرستی'' کو جنم دے کر ملکوں کے بکھرے ہوئے داخلی عناصر کی شیرازہ بندی کی۔ یورپ میں ''قوم پرستی'' کا تصور بہ یک وقت مدافعانہ بھی تھا اور جارحانہ بھی۔ ایشیا کی سرزمین کو اس نے اپنے بازو آزمانے کے لیے بہت موافق پایا۔ یہاں استحصال کے امکانات کے اعتبار سے ہندوستان مقابلتہً زیادہ زرخیز تھا۔ یورپی ممالک میں انگلستان اپنی بحری قوت، دوسرے ممالک سے سمیٹی ہوئی دولت، سیاسی تجربے اور مصلحت اندیشی کے لحاظ سے زیادہ طاقت ور تھا۔ چناں چہ فرانس اور پرتگال سے ایک مدت کی کشمکش کے بعد ہندوستان انگلستان ہی کے حصے میں آیا۔ فرانس اور پرتگال کے ہاتھ زمین کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آئے۔

ہندستان کے بیش تر علاقوں میں عملی اختیار حاصل کر لینے کے بعد جنرل لیک (Gen. Lake) کی فوجوں نے ۱۸۰۳ء میں سندھیا اور اس کے فرانسیسی حلیفوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کیا اور شاہ عالم کو اپنے حفظ وامان میں لے لیا۔ بادشاہ کے ذاتی اخراجات کے پیش نظر اس کی پنشن مقرر کردی گئی۔ اور قلعہ معلی کی فصیل شہنشاہ ہند کے دائرۂ اختیار کی حد قرار پائی۔ یہ ہندوستانی شہنشاہیت کے دور آخر کا آغاز تھا۔ کسی ملک کی تاریخ میں اس سے زیادہ غیر معمولی سانحہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ خود اس کا حکمراں ایک بیرونی طاقت کو اپنے دارالسلطنت کے نظم ونسق کا کفیل بنانے پر آمادہ ہوجائے۔ چناں چہ اس کے نتائج نے دہلی کے عام باشندوں کو رفتہ رفتہ مجبور کیا کہ وہ اپنی شکست کی وجوہ پر غور کریں۔

انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے آئے تھے اور ابتدا میں ان کا مقصد بھی یہاں کے معاشی اہمیت رکھنے والے علاقوں میں اثر ورسوخ حاصل کرنا تھا۔ اس وقت ان کے نزدیک تجارتی کاروبار کی اہمیت بنیادی تھی اور سیاسی سرگرمیاں اس کے ضمن میں آتی تھیں۔ مگر جوں جوں ملک کے سیاسی حالات بگڑتے گئے اور معاشی زندگی پر حاوی ہونے کے لیے سیاسی اداروں کی اہمیت کا احساس بڑھتا گیا۔ کمپنی کے ارباب حل وعقد حکام کی حیثیت حاصل کرتے گئے اور کچھ عرصے بعد ہی کمپنی ہندستانیوں کے لیے ''کمپنی بہادر'' بن گئی۔ مگر چوں کہ کمپنی بنیادی طور پر کوئی سیاسی ادارہ نہ تھی اور نہ اس کے نمائندے اور کارندے سیاسی مصلحت اور تاجرانہ مفاد کو ہم کنار کرنے کی سمجھ اور صلاحیت رکھتے تھے اس لیے ضرورت تھی ایسے لوگوں کی جو کمپنی کے مفاد کے ساتھ ساتھ حکومت برطانیہ کے اعتماد کے بھی امانت دار ہوں۔ اسی کے پیش نظر ۱۷۷۳ء میں کمپنی کو برطانوی پارلیمنٹ

نے اپنے زیر نگرانی لے لیا۔[1] اس سے قبل کمپنی کی حکومت کے طور طریقے بہت بھیانہ اور ہندوستانیوں کے لیے انتہائی نفرت انگیز تھے، وارن ہیسٹنگز (Waren Hastings) کے تقرر کے بعد جب کمپنی صرف تجارت اور مالیات کی ذمہ دار رہ گئی اور سیاسی معاملات پارلیمنٹ کے قوانین کے تابع ہو گئے تو نظم و نسق کے قواعد بھی مرتب ہونے لگے۔ ملک میں اصلاحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ انتظامی امور میں احتیاط اور ہوشیاری سے کام لیا جانے لگا اور ملک کے حالات پہلے سے بہتر ہو گئے۔ اب نظم و نسق نہ صرف کمپنی کے پہلے انتظام سے بہتر تھا، بلکہ مغل نظام حکومت سے بھی زیادہ باقاعدہ اور باسلیقہ تھا۔[2] معاشی استحصال کے لیے سیاسی اقتدار کی اہمیت کو محسوس کرنے کے بعد ملک میں انگریزوں کی سیاسی سرگرمیاں بھی حاوی اور تیز تر ہو گئیں۔ گو کہ یہ تبدیلی برطانیہ نے خود اپنے مفاد کے پیش نظر کی تھی مگر اس سے پیدا ہونے والے حالات کسی حد تک ہندوستانیوں کے لیے بھی خوشگوار تھے۔ پولس، عدالت، ڈاک اور رسل و رسائل کے نئے نظام نے لوگوں کو خاص طور پر متاثر کیا۔ دہلی والے جو مدتوں سے امن و سکون کے متلاشی تھے۔ نئے حفاظتی اقدام اور سہولتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ برطانوی قبضے کے فوری نتائج انھیں مفید نظر آئے۔[3] دور رس اور نقصان دہ نتائج سے واقف ہونے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ سامراج کا اصل روپ ابھی رحمتوں اور عنایتوں کے نقاب میں چھپا ہوا تھا، نقابوں پر نقاب پڑتے جاتے تھے اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کی نظریں ان کی رنگینی میں محو ہونے لگی تھیں۔ کبھی کبھی اگر ان نقابوں کے اڑنے سے اس کی رخ کی جھلک دکھائی بھی دیتی تو وہ اپنی تمام برائیوں کے باوجود ہندوستان کی پنشن یافتہ شہنشاہیت کے شکن آلود چہرے اور مسخ شدہ خط و خال سے کہیں زیادہ نظر فروز تھی۔

میر کی دلی انگریزوں کے قبضے سے پہلے کی دہلی تھی۔ بادشاہ نابینا اور عملاً بے دست و پا ہو چکا تھا۔ وہاں کل کی خبر کسی کو نہ تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب کس سمت سے کون حملہ کر بیٹھے گا اور آئے دن لوٹ مار کرنے والوں میں سے کون بالآخر بازی لے جائے گا۔ دلی جیسا ''عالم میں انتخاب'' شہر

---

[1] Tara Chand: History of Freedom Movement in India, Vol.1, pages. 280-286

[2] Tara Chand: History of Freedom Movement in India, Vol.1, pages. 293

[3] فواید الناظرین- دہلی ۱۰ر جولائی ۱۸۸۸ء

''رعایا ہندوستان نے کسی اور عمل داری میں اس قدر امن نہیں حاصل کیا جیسا کہ اب میں اکثر جہلا کو اس عمل داری کا شاکی پاتا ہوں۔ مگر باعث فقط تعصب اور بے علمی ہے۔ چوں کہ یہ لوگ مدت سے امن میں ہیں اور غدر کا منہ نہیں دیکھا اس سبب سے اس عمل داری کی قدر نہیں جانتے۔ بزرگوں کی زبانی سننے میں آتا ہے کہ شاہراہیں قرب میں دارالخلافہ کے ایسی غیر محفوظ تھیں کہ ہزاروں مقاموں میں ڈکیت مسافروں کی گھات میں بیٹھے رہتے تھے اور دست ظلم کا دراز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ مثل مشہور تھی کہ ''دان کی کمائی بڑھیا کے پل پہ گنوائی''، ''شکر خدا کا کہ ہمارے حاکمان حال نے ایسے ظالم رہزنوں سے پناہ دی......''

دیکھتے دیکھتے ویران ہو گیا۔ اہل ہنر "یورپ کے ساکنوں" سے رحم و کرم کی آس لگائے ہوئے ایک ایک کر کے ادھر کو سدھار گئے۔ شرفا کو دستار سنبھالنی دوبھر ہو گئی اور امرا اور وساد انے دانے کو محتاج ہو گئے۔ بقول میر:

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں

تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

ان حالات کے بعد سکون اور ٹھہراؤ کا قائم ہونا دلّی والوں کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ چناں چہ اب ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آنے لگا جو نئی حکومت کا وفادار تھا۔ انگریزوں کے ذریعے مغرب کی ترقی اور وہاں کے حالات میں روز بروز خوش گوار تبدیلیوں کی خبریں بھی یہاں پہنچنے لگیں۔ پریس کے قیام نے انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک کے حالات سے اور زیادہ واقفیت اور دلچسپی پیدا کر دی۔ لوگ اب اس ملک میں بھی وہ کرشمے دیکھنے کے منتظر ہو گئے جن کی ابھی تک صرف خبریں ان کے کانوں تک پہنچی تھیں۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ انگریز جیسی "روشن خیال" اور "ترقی یافتہ" قوم کی سرپرستی کو بھی لازم سمجھنے لگے تھے۔ انگریز حکام ان کے لیے محافظ، نجات دہندہ اور رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ سیاسی حالات میں خلفشار دور ہو جانے کے بعد اب نہ پہلی سی بے چینی رہی تھی اور نہ اس حد تک بے یقینی اور مستقبل سے بے خبری تھی جو انگریزوں کے قبضے سے پہلے دہلی پر چھائی ہوئی تھی۔ انگریزوں کی قوت اور عزم کو دیکھنے کے بعد ہونے والی تبدیلیوں کا رخ بھی پہچانا جا سکتا تھا۔ اب دانشوروں میں مشرق کی پس ماندگی اور مغرب کی ترقی کے اسباب پر غور کیا جانے لگا تھا اور حسرت و یاس کی جگہ نئی نئی خواہشیں اور امیدیں پروان چڑھ رہی تھیں۔

اس رجحان کی طرف ترغیب دلانے میں بڑا حصہ انگریزی زبان اور جدید علوم کی اشاعت کا تھا۔ مشنریوں کی بدولت یہاں اس کی ابتدا ہوئی اور پھر حکام کی مدد سے مقبولیت بڑھتی گئی۔ ہندوستان میں اس وقت تعلیم کے مراکز مدرسے اور مکتب ہوا کرتے تھے جن کی آمدنی زکوٰۃ و خیرات پر منحصر تھی۔ یہ عام طور پر خدا کی راہ میں قائم کیے جاتے تھے اور شاید اس لیے شرفا اپنے بچوں کو یہاں بھیجنا معیوب سمجھتے اور اتالیق یا استاد کے ذریعے انھیں گھر پر تعلیم دلانا پسند کرتے تھے۔ جب سارے ملک پر کسمپرسی کا عالم طاری ہوا تو یہ ادارے بھی بے یار و مددگار رہ گئے۔ یہاں درس و تدریس کے طور طریق نہ صرف صدیوں پرانے تھے۔ بلکہ ان کے رہے سہے معیاروں میں بھی پستی آ چکی تھی۔ پھر بھی رائج طریقۂ تعلیم اس وقت یہی تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور حالات بدلتے گئے یہ

نظام نہ صرف بے محل بلکہ نقصان دہ بھی ہوتا گیا۔ جدید دور میں یہ اب بھی وہی پرانے اذہان ڈھال رہا تھا جن میں فرسودہ خیالات ونظریات پیوست تھے اور جن کے طرزِ فکر اور زندگی کے تقاضوں میں بُعد اور تضاد تھا۔ اسی لیے جب انگریزوں نے اپنی ضروریات کے پیشِ نظر مختلف علاقوں میں نئے مدارس قائم کیے تو انھیں غیر متوقع مقبولیت حاصل ہوئی اور ہر جگہ ایک قابلِ لحاظ تعداد میں لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔[1] ان کی مقبولیت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انگریزی ہی کی بدولت کمپنی کی سرکار میں، جواب عملی طور پر سارے ملک پر حاوی تھی، محرری، نقل نویسی اور منصفی کی خدمات پر تقرر ہوسکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ کمپنی سے تعلق بڑھنے کی بنا پر دیسی حکم رانوں کو بھی اپنے عملے اور دفاتر میں انگریزی داں افراد کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ چوں کہ دولت اور اختیار محدود ہونے کے سبب راجاؤں اور نوابوں کے دربار اب بہت سکڑ چکے تھے۔ اس لیے ضرورت مندوں کو اپنی دست گیری کے لیے سرکار انگریزی ہی کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ معاشی منفعت کی بدولت انگریزوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے انگریزوں نے بروقت فائدہ اور اُٹھایا جہاں جہاں انھیں اختیار حاصل ہوتا گیا وہاں ایسے مدارس بھی قائم ہوتے گئے جن میں انگریزی زبان اور مغربی علوم کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی اس مہم کا بنگال میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس حوصلہ افزا صورتِ حال کو دیکھ کر دوسری جگہوں پر بھی جدید تعلیم کی تحریک زور پکڑ گئی۔ ہندوستانیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے نزدیک انگریزی وسیلۂ ملازمت کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھی۔ ان کا مقصد اس کے ذریعے ملک کو مغرب کے سیاسی وسماجی نظریات سے متعارف کرا کر اسے دورِ جدید کے تقاضوں سے آشنا کرنا اور ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش لا کھڑا کرنا تھا۔ اس اصلاحی تحریک کا آغاز بھی بنگال سے ہی ہوا جہاں اس کے روحِ رواں راجہ رام موہن رائے تھے۔ شمالی ہند میں دہلی کالج اور رام چندر نے اصلاحی نظریات کی تبلیغ کی اور یہی سلسلہ انیسویں صدی کے آخر میں سرسید اور علی گڑھ تحریک تک پہنچا۔

مگر یہ نیا طریقۂ تعلیم ابھی بہت ہی محدود طبقے میں تسلیم کیا جاتا تھا۔ شمالی ہند میں اصلاحی نظریات کے حامل افراد بھی تعداد کے اعتبار سے بہت کم اور راجہ رام موہن رائے جیسی برگزیدہ شخصیت سے محروم تھے۔ یہاں نئے خیالات کی مخالفت بہت زیادہ تھی اور ان کو اپنانے کی ضرورت کا احساس بہت کم۔ مذہبی علماء کے نزدیک انگریزی پڑھنا کفر کے برابر تھا۔ جدید تعلیم کے خلاف وسیع پیمانے پر مہم چل رہی تھی۔ فتوے جاری کیے جاتے تھے۔ قدیم مذہبی عقائد کا اثر، سماجی دباؤ اور علماء کی

---

[1] Reoport of the General Committee of Public Instruction for 1833 to Lord W. C. Bentinek, G. G. in Council.
Ref. N. A. I. Home (Public) Deptt.: O.C. 24; 25th March 1835.

گرفت اتنی سخت تھی کہ جدید تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی ہمت کرنے والے لوگ اب بہت کم تھے۔ اور صرف وہی لوگ اس طرف مائل ہوتے جو ضرورت مند تھے۔

انگلستان میں چوں کہ تعلیم حکومت کی ذمہ داری نہیں تھی اور تعلیمی ادارے قطعاً آزادانہ طور پر چلتے تھے اس لیے ابتدا میں کمپنی کی توجہ بھی اس طرف نہ گئی۔ جدید تعلیم کا آغاز یہاں دراصل عیسائی مشنریوں اور چند سرگرم انگریز کارکنوں کی کوششوں سے ہوا۔ مگر جلد ہی سیاسی ضروریات کی بنا پر اس کی اہمیت کا احساس انگریز حکام کو بھی ہونے لگا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان میں تعلیم کی طرف توجہ دی اور ۱۸۱۳ء میں پہلی بار ایک لاکھ روپے کی رقم تعلیم پر خرچ کرنے کے لیے منظور کی گئی[1] اس وقت ایک بحث یہ چھڑی کہ حکومت کو مشرقی علوم والسنہ کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے یا انگریزی زبان اور مغربی علوم کو فروغ دینے کی زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے (Lord Macaulay) نے انگریزی تعلیم کے حق میں ایک طویل اور مدلل دستاویز (Minute) پیش کی، جو اس بحث میں حرف آخر ثابت ہوئی اور اس کی بنیاد پر تعلیمی پالیسی مرتب ہوئی[2] اب حکومت کے سامنے مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی باشندوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں لایا جائے جو کمپنی کے نظام کے قیام واستحکام میں معاون ثابت ہو سکے۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے باشندے کم از کم معاوضے پر کمپنی کی ملازمت کے لیے تیار تھے۔ جب کہ انگریز ملازمین کو ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ معاوضہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کو یہاں لانے بسانے اور ان کے معیار کے مطابق ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری بھی کمپنی ہی پر عائد ہوتی تھی۔ چناں چہ ارباب کمپنی نے خود اپنی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی سرگرمیوں کی سرپرستی کی اور اس سے فائدہ بھی اُٹھایا۔ مذہبی تحریکوں کی طرف سے انگریزی نظام تعلیم کی مخالفت کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ اسے قومی مفاد کے خلاف سمجھتے تھے اور حکومت کی نیت پر بھی انھیں اعتبار نہیں تھا۔ بات بڑی حد تک صحیح تھی مگر مذہبی تنگ نظری، قومی تعصب، جدید تقاضوں سے بے خبری اور مغربی علوم سے ناواقفیت کی بنا پر ان کے یہاں وہ توازن نہیں رہا جو جدید ضروریات کے صحیح ادراک اور قومی مفاد کو وسیع پس منظر میں دیکھنے کے لیے ضروری ہے۔ یہاں خلوص بے پناہ مگر شعور محدود تھا۔ اسی لیے مغربی علوم سے آشنا طبقے کو یہ تحریکیں متاثر نہ کر سکیں اور جیسے جیسے جدید طرز تعلیم پھیلتا گیا ان کا اثر کم ہوتا گیا۔

(۲)

ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور میں متنوع تہذیبی اقدار کے امتزاج کا عمل جاری رہا ہے۔ ہمارا شمالی

---

[1] Zellner : Education in India , Pages : 50

[2] Zellner : Education in India, Pages : 58-60

سلسلہ کوہ اگر بیرونی حملہ آوروں کے لیے سد باب ثابت ہوا ہے تو مختلف تہذیبوں کے نمائندوں کے خیر مقدم کے لیے اس کے پٹ کھلے بھی رہے ہیں۔ یہاں کے ساحل و سمندر بین الاقوامی سیاحت و تجارت کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوئے۔ انگریزوں کے ساتھ ایک نئے تمدن کے آثار کا جلوہ گر ہونا اس قدیم ملک کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہاں تہذیب کی وہ اقدار جو یہاں کے باشندوں کے لیے اجنبی تھیں، جانچ اور پرکھ کے بعد، بتدریج ہی اپنی صحت اور افادیت کو تسلیم کرا سکتی تھیں۔ پھر ارباب کمپنی کے توسط سے ہندوستان میں جو تہذیب آئی وہ، جیسا کہ ڈاکٹر سید عابد حسین کا خیال ہے، مغرب کی اصل تہذیب ہونے کی بجائے ''کالونی'' میں بسنے والے کم عمر اور ناپختہ کار انگریزوں کی تہذیب تھی۔[1] اس کے علاوہ ملک کی سیاست میں انگریزوں کے رویے سے بے اطمینانی اور حکمران طبقے کے سیاسی و معاشی مفاد اور مذہبی و نسلی اختلافات کی بنیادیں اس قدر گہری تھیں کہ مغرب کے ان اداروں کو بھی جو ہندوستان کے لیے مفید ہو سکتے تھے، عیسائیت کے مماثل سمجھا گیا اور جدید علوم و سماجی اصلاحات کی مخالفت مذہبی بنیادوں پر کی جانے لگی۔ عیسائیت اگر اس سرزمین پر ایک جارحانہ معاشی و سیاسی نظام کے ساتھ قدم نہ رکھتی تو دوسرے مذاہب کی طرح شاید اسے بھی جلد ایک ''ہندوستانی مذہب'' کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہوتا۔ مگر پادریوں نے صوفیوں، سنتوں اور بھکشوؤں کی طرح حکومت وقت سے بے نیاز ہو کر عوام سے تعلق قائم کرنے کی بجائے برطانوی اقتدار کے سایے سایے بڑھنے کی کوشش کی اور اسی لیے ان کے مذہب کو سامراجی نظام سے ممیّز نہ کیا جا سکا۔

ہندوستان میں مغربی تمدن کے آثار انگریزوں کے سیاسی اقتدار سے بہت پہلے مختلف یورپی اقوام کے تاجروں اور سیاحوں کے ذریعے آہستہ آہستہ نمودار ہونا شروع ہو چکے تھے۔ ہندوستانی نظام میں جب تک قوت اور جان باقی رہی، مغربی اقدار حاوی نہ ہو سکیں۔ مگر جب سیاسی و معاشی زندگی میں انتشار شروع ہوا تو ملک کی تہذیب میں بھی پریشانی اور برہمی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔[2] مغرب کی سیاسی قوتوں سے ہندوستانی نظام اور مفادات کے تصادم نے مغربی علوم اور تہذیبی اقدار کی طرف بھی سرد مہری پیدا کر دی۔ مذہبی علماء کی رہنمائی میں انگریزوں کے خلاف مدافعانہ تدابیر اختیار کی گئیں جو بد قسمتی سے انگلستان کی جارحانہ تدابیر کے مقابلے میں تقریباً بے اثر تھیں۔ اس وقت انگریزوں کے قبضے سے بچنے کا اگر کوئی طریقہ تھا تو وہ صرف یہ تھا کہ مغربی فلسفہ و علم، صنعت و حرفت کے جدید طریقوں اور نئے سیاسی و معاشی نظریوں سے اس ملک میں بھی استفادہ

---

[1] ڈاکٹر عابد حسین: قومی تہذیب کا مسئلہ، ص ۱۹۴-۱۹۵ء

[2] ڈاکٹر عابد حسین: قومی تہذیب کا مسئلہ، ص ۱۴۴-۱۵۲ء

کیا جاتا۔ جدید وسائل سے مسلح قوم کا مقابلہ کرنے کے لیے یہاں بھی اگر اس سے بہتر نہیں، تو کم از کم ان ہی وسائل کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی جو دشمن کے قبضۂ قدرت میں تھے۔ ایسا نہ ہو سکا، اس لیے اس جدو جہد میں ہندوستان کو شکست ہوئی۔ ان ہی حالات میں ہندوستانیوں کا وہ طبقہ بھی وجود میں آ چکا تھا جو اپنی بہت سی کمزوریوں اور مغرب کی بعض خوبیوں سے واقف تھا اور یہ محسوس کرتا تھا کہ جدید دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے بہت کچھ مغرب سے سیکھنا پڑے گا۔ اس کے نزدیک انگریزوں کو خضر بنائے بغیر قدامت پرستی اور پس ماندگی کی اس ظلمات سے نکلنا دشوار تھا اور اسی لیے وہ انگریز حکام کے ساتھ تعاون کو بھی لازم سمجھتا تھا۔ کمپنی اور برطانوی پارلیمنٹ اس گروہ کے افراد کے نزدیک ہندوستان اور ''حضور والا'' کی خیر خواہ تھی۔ برطانیہ نے خود اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے جن اداروں کو قائم کیا تھا ان کے فوری نتائج سے یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ حکومت کا اصل منشا ہندوستان کی فلاح ہے۔ چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ برطانیہ جیسی ''رعایا پرور'' سرکار کا سایہ ان کے سروں پر قائم رہے۔

۱۸۵۷ء سے قبل تمام امور میں انگریزوں کے مکمل اختیار کے باوجود اب بھی ہندوستانیوں کی نگاہوں کا مرکز، دلوں کا آسرا اور آئینی وفاداری کا حق دار صرف مغل شہنشاہ تھا۔ اسے ابھی تک ہندوستان کی عظمت و عزت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ تیموری شان و شوکت اب بھی باقی تھی۔ بادشاہ کے نام کے ساتھ ابھی تک وہی القاب لگائے جاتے تھے جو اکبر و جہانگیر کے ناموں کے ساتھ واقعی کوئی معنی رکھتے تھے۔ ''صاحبان کلاں'' اور ''صاحبان والا شان'' عام لوگوں کی نگاہوں میں ''ظل الٰہی'' کے فقط باج گزار تھے اور شاہی پنشن سلطنت کے وفاداروں کی طرف سے پیش کی ہوئی نذر سمجھی جاتی تھی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لوگ بھی انگریزوں کے خیر خواہ ہونے کے باوجود ابھی تک خاندان تیموری کی اقبال مندی کے دست بدعا تھے۔ ہندوستان کے حکمراں خاندانوں کی تباہی پر ان کا دل کڑھتا تھا۔ دہلی کے اخبارات میں قلعے کے بگڑے ہوئے حالات پر تنقیدیں اور ''حضور والا'' کے غور و فکر کے لیے تجویزیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ قران السعدین (۱۴ر نومبر ۱۸۵۴ء) میں کیپٹن ڈگلس (Capt. Douglas) کی اس تجویز کو بہت سراہا گیا تھا کہ قلعے میں شہزادوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ کھولا جائے، جہاں انھیں جدید علوم و فنون سکھائے جایا کریں تا کہ ان کی توجہ فضولیات سے ہٹ کر مفید کاموں کی طرف راغب ہو، اور اُمید ظاہر کی گئی کہ دہلی کالج کے اساتذہ اس سلسلے میں پورا پورا تعاون کریں گے اور اہل قلعہ اس موقع سے فائدہ اُٹھائیں گے:

''بات کچھ مشکل نہیں۔ اگر ایک دو خرچ پتنگ بازی، ناچ رنگ وغیرہ اور

تضیع وقت وزر گوارانہ رکھیں تو یہ امر سہل تھوڑے دنوں میں جمعیت پانچ چھ سو روپے ماہواری کے اسی رنگ ڈھنگ سے ممکن ہے۔''

مہتمم اخبار کو اُمید تھی کہ اگر شہزادوں کو ''اہل اور نیک چلنوں کی صحبت ملے'' تو دوسروں کے مقابلے میں وہ زیادہ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

دہلی اردو اخبار (۱۳ر مارچ ۱۸۵۳ء) نے املاک اودھ کے فروخت ہونے کی خبر پر ایک شذرے میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اب نوبت ''سنگ وخشت اور چوب وغیرہ'' سے گزر کر ''درواز ہائے مکان مشہور دلکشا'' اور مکانات سالم کے چوک ہائے سنگ اور چھجہ ہائے سنگ کے اکھڑنے تک پہنچی۔ اسی ''اخبار'' کے ایک پچھلے شمارے (۲۳ر مئی ۱۸۴۱ء) میں قلعہ معلیٰ کے حالات کے بارے میں ایک دلچسپ خط شائع ہوا تھا:

''کہتے ہیں کہ مختار تو تجربہ کار اور بظاہر نام مرزا شاہرخ بہادر کا لیکن ایک حکیم جواب معالج ہیں حضور والا کے اور دو ایک لڑکے راجہ جے سکھ رائے کے، اور کوئی ملازادہ جو حافظ کر کے مشہور ہے اور چند حواشی اس قسم کے مجتمع ہیں۔ جو چاہتے ہیں سو کرتے ہیں۔ امورات سلطنت میں اب یہ لوگ اختیار تام رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ طبیب نبض دیکھنی جانے، قارورہ پہچانے، بنیا مہاجن کار دوکان داری جانے، ملازادہ لڑکے پڑھانا جانے۔ امورات مہمات سلطنت سے ان کو کیسا نسبت۔ جب یہ لوگ مدار مہمات سلطنت ہوں تو کیا حال ہووے۔ الراقم محمد۔''

اسی طرح قلعے کے ملازمین کی شکایات، تنخواہ کا نہ ملنا، کارندوں کے مظالم، بادشاہ کی بے پروائی اور شہزادوں کی بے راہ روی پر دہلی اردو اخبار، قران السعدین اور فوائد الناظرین کے صفحات پر متعدد شذرات، اطلاعات، خطوط اور مضامین نظر آتے ہیں۔ جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کا یہ عام طور پر مطالبہ تھا کہ خاندان مغلیہ کے افراد اور دوسرے دیسی حکمراں اپنے آپ کو سنبھالیں اور اپنے ناموس اور رعایا کی تمناؤں کا پاس کریں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی قوی تر ہوتا جاتا تھا کہ ایسی خواہشات کا پورا کرنا اب ''حضور والا'' کی دست رس سے بہت دور ہے۔ انگریزوں کی حکومت کے تحت شہر میں جان و مال کو محفوظ پا کر وہ نئے نظم ونسق کے استحکام اور فروغ کے بھی خواہش مند تھے۔ چناں چہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں اگر ایک طرف ہندوستانی اور برطانوی طاقتوں کے درمیان تصادم تھا اور دوسری طرف نئے نظام تعلیم کے پروردہ ہندوستانی ذہنوں میں بھی دو متضاد خواہشات

کا ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ اس ہیجان میں یہ سوال کہ تقاضائے وفا کیا ہے، عارضی طور پر ان کے دل و دماغ پر بوجھ بن گیا تھا، مگر بغاوت کی ناکامی کے بعد ملکۂ برطانیہ کے مکمل اقتدار کو تسلیم کر لینا ان کے لیے دشوار بھی نہ تھا۔ ایک وہم دور ہو چکا تھا۔ دوسرا شک اب حقیقت بن گیا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں ''لبرل ازم'' (Liberalism) کو بہت مقبولیت حاصل تھی۔ وہاں کے ادب، فلسفے اور سیاست پر بھی یہی نقطہ نظر حاوی تھا۔ چناں چہ ہندوستان کے انگریزی داں طبقے اور اس کے حلقۂ اثر میں آنے والے لوگوں کو جس مغربی فلسفے سے استفادے کا موقع ملا اس پر بھی ''لبرل ازم'' (Liberalism) کا اثر غالب تھا۔ یورپ کے ملکوں میں مطلق العنان شہنشاہوں کے خلاف بغاوتیں اور جمہوری طاقتوں کی فتوحات ہندوستانی مفکرین کے لیے جو خود بھی ایک مطلق العنان شہنشاہیت کا بوجھ اپنے ملک کے کاندھوں پر محسوس کر رہے تھے، بڑی فکر انگیز اور حوصلہ افزا تھیں۔ قران السعدین اور فوائد الناظرین کے صفحات پر ۱۸۴۸ء میں برپا ہونے والے یورپی انقلابات کا ذکر جا بجا نظر آتا ہے۔ ان خبروں کے ساتھ اس بات پر بار بار زور دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ شخصی حکومت کسی ملک کے لیے بھی فائدہ مند بھی نہیں ہو سکتی اور جن ممالک کے لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں وہ ایسی حکومتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

انفرادی آزادی، اظہار رائے کا حق، حکومت پر اثر انداز ہونے والے ذرائع کی تلاش اور عوام کو موقع بہ موقع ان کے استعمال کا اختیار، یہ ''لبرل ازم'' (Liberalism) کے وہ اہم اصول تھے جو یورپ کے متعدد ممالک میں مطلق العنان حکومتوں کے طور طریقوں کے خلاف برسرپیکار تھے، مگر ہندوستان میں اس کی نشوونما ابھی بہت ہی محدود حلقے میں ہو رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر یہ نقطۂ نظر خاصا بے ضرر بھی ہو چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ہندوستانی ''لبرل ازم'' اپنے ملک میں بادشاہ اور عوام کے تعلقات کو جانچتا تھا اور انگلستان اور ''لبرل ازم'' سے متاثر ہونے والے دوسرے مغربی ممالک کے عوام اور حکومتوں کے تعلقات کو مثال تصور کرتا تھا۔ چناں چہ ایک خوش فہمی یہ تھی کہ انگریزوں کا اقتدار جیسے جیسے مستحکم ہوگا، یہاں بھی ''لبرل ازم'' کی برکتیں نازل ہوتی جائیں گی۔ ان کی نگاہوں سے ابھی بیرونی حکومت کی نوعیت اور فطرت اوجھل تھی۔ وہ ابھی غلام اور سامراجی ملک کے تعلقات کا صحیح تجزیہ کرنے اور بیرونی قبضے کے دوررس نتائج کے بارے میں سوچنے کی بجائے، حاکم ملک کے اندرونی سیاسی تعلقات، دولت کی فراوانی، آزادی رائے، سائنس اور صنعت وحرفت کی ترقی، قومی طاقت، حوصلوں اور جوش وخروش کو دیکھتے تھے، اور اسی لیے حکومت برطانیہ سے ایسی توقعات رکھتے تھے جنھیں پورا کرنے کی اجازت خود برطانیہ کا سیاسی و معاشی مفاد نہیں دے سکتا تھا۔ اس وقت ہندوستان کی نگاہ پر ہی نہیں برطانیہ کے رخ پر بھی بہت سے پردے

پڑے ہوئے تھے۔ نگاہ کو بے محابا اور جلوے کو بے حجاب ہونے کے لیے بیسویں صدی کے آغاز تک انتظار کرنا پڑا۔

رام چندر اور دہلی کالج کے حلقۂ اثر میں آنے والے لوگوں کے یہاں یہی انداز فکر حاوی نظر آتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں اس طبقے کی کوششیں اس لیے اہم ہیں کہ ان کا مقصد اس ملک کی غیر ذمہ دار حکومت اور غافل عوام کو جھنجھوڑنا تھا۔ اسی لیے ان کے کردار و افکار کو غلامانہ نہیں، بلکہ قوم پرستی کے ایک مخصوص نقطۂ نظر کا حامل سمجھنا چاہیے جو اپنے دور کے حالات کے پیش نظر متوازن تو نہیں مگر دوسرے رجحانات کے مقابلے میں توازن کی طرف زیادہ مائل نظر آتا ہے۔ یہ رجحان "دساوری انگریزی تہذیب" [1] سے متاثر ہندوستانیوں کے احساس کم تری، سرکار پرستی اور نقالی سے مختلف تھا۔ ان کے فکر و کردار کی جڑیں اسی ملک کی زمین میں قائم تھیں اور ان کی نشو و نما بھی یہاں کی بدلتی ہوئی آب و ہوا کے مطابق ہوئی تھی۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی بگڑی ہوئی صورت میں بھی مغرب کے عزم و استقلال اور حوصلہ مندی کی ایک جھلک ضرور دیکھ لی تھی اور مطالعے و مشاہدے کے ذریعے اس کے سرچشمے تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ لوگ انگریز کی غلامی کے نہیں، مغربی تہذیب کے صالح عناصر کے علم بردار تھے، جن کے پرچار میں انھوں نے بڑی جرأت اور استقلال کا ثبوت دیا۔ اس کے لیے انھوں نے تعلیمی اداروں، علمی محفلوں اور تبلیغ و اشاعت کے تمام نئے وسیلوں کو استعمال کیا۔ ان کی کوششوں کا رفتہ رفتہ اثر بھی ہوا۔ علمی و ادبی سرگرمیاں بڑھنے لگیں۔ نئے تقاضوں اور ضرورتوں کا ادراک ہونے لگا۔ قدیم و جدید عقائد و نظریات پر مفصل، دقیق اور مفید بحثیں ہونے لگیں۔ اب وہ لوگ بھی جنھوں نے قدیم طرز پر تعلیم و تربیت حاصل کی تھی کسی نہ کسی طور پر جدید رجحانات سے متاثر ہونے لگے تھے۔ غالب کے وہ اشعار جو انھوں نے "آئین اکبری" پر تقریظ لکھنے کی درخواست پر سید احمد خان کو لکھ کر بھیجے تھے، انیسویں صدی کے حساس اور باشعور ذہن کے انداز فکر کا پتہ دیتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کا معرکہ اور اس میں ہندوستان کی شکست ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک سانحہ تھا۔ انحطاط اور بحران کے دور میں ہوش مندی کی جو لہر اٹھی تھی وہ زور اور قوت حاصل کرنے سے پہلے ہی بکھر گئی۔ مشرق و مغرب کی تہذیبوں کے امتزاج کا آزادانہ عمل اچانک رک گیا۔ ترقی کی قوتیں اسیر ہو گئیں۔ وہ تحریکیں اور ادارے جو ان قوتوں کو وجود میں لانے میں پیش پیش تھے، پامال کر دیے گئے۔ سامراجی حکومت کے بندھن سخت ہو گئے اور ہندوستان کو باوقار طور پر نئے دور میں قدم رکھنے کا موقع نہ مل سکا۔

---

[1] ڈاکٹر عابد حسین: قومی تہذیب کا مسئلہ، ص ۱۹۵-۱۹۶ء

اس زمانے میں شمالی ہند کا ایک اہم تعلیمی ادارہ مدرسہ غازی الدین تھا۔ یہ مدرسہ ۱۷۹۲ء میں اجمیری دروازے کے باہر عالم گیر ثانی کے وزیر نواب غازی الدین خاں نے قائم کیا تھا اور ایک عرصے تک اپنے بانی کے نام سے مشہور رہا۔[1] یہاں عربی و فارسی، قرآن و تفسیر، حدیث و فقہ، ہیئت و نجوم اور دیگر رسمی علوم کا درس دیا جاتا تھا۔ دہلی کی علمی زندگی میں یہ مدرسہ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں شہرت حاصل کر لی تھی اور دور دور سے لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا کرتے تھے۔[2] اسے شہر کی ہنگامہ خیز فضا سے ہٹا کر شہر پناہ کے باہر اس خیال سے قائم کیا گیا تھا کہ عام زندگی کا شور وشغف تحصیل علم میں حائل نہ ہو۔ اور دراصل اپنے علمی ماحول کی بنا پر ہی اس مدرسے کو خاص قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ آج بھی علمی اداروں کے لیے اسی قسم کا ماحول سازگار سمجھا جاتا ہے۔ دہلی میں شاید یہ پہلا ادارہ تھا جو اس خیال کے پیش نظر قائم کیا گیا تھا۔

طرز تعلیم یہاں بھی جدید ضروریات کے مطابق نہ تھا اس لیے اس کی سرگرمیاں رفتہ رفتہ محدود ہوتی گئیں، دہلی پر مستقل حملوں نے اس کالج کو بالکل تباہ کر دیا اور صرف بانی کی قبر اور عمارت بچ رہی۔[3] مگر جب حکومت نے نئی تعلیمی پالیسی مرتب کی تو اس کا مدرسے پر بھی خوش گوار اثر پڑا۔ ۳ر دسمبر ۱۸۲۴ء کو پہلی بار حکومت نے "دہلی کے مسلم نوجوانوں کی تعلیم کے لیے چھ سو روپے ماہوار" کی رقم منظور کی۔ ۱۴ر جولائی ۱۸۲۶ء کو اُس پر چار سو روپے ماہوار اور پھر ۱۸ر اکتوبر ۱۸۲۷ء کو سر چارلس مٹکاف (Sir Charles Metcalfe) ریذیڈنٹ کمشنر دہلی کی اس سفارش پر کہ ایک انگریزی جماعت بھی کھولی جائے، ڈھائی سو روپے ماہانہ کی امداد کا مزید اضافہ ہوا (مگر یہ رقم محض اس نئی کلاس کے لیے مخصوص نہیں تھی) اپریل ۱۸۲۸ء میں یہ انگریزی جماعت کھول دی گئی۔[4] دہلی میں پہلی بار انگریزی زبان اور مغربی علوم کی طرف توجہ ہوئی اور اس کے ساتھ مدرسہ غازی الدین کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ۱۸۲۹ء میں نواب اعتماد الدولہ، وزیر لکھنؤ، نے

---

[1] مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج ص ۳

[2] Letter by Asst. A. G. of N. W. Province and Member of Loal Committee to I. H. Tylor, Secty.

[3] Letter by Asst. A. G. G., N. W.P. Member of Local Committee to I. H. Tylor Secty. of the Local Committee, Dated 15th March 1839. Ref. N.A.I. Home (Public) Deptt. 1840, 15th July O.C. 8-14 and K. W.

[4] Note by I. R. Colvin, Private Secretary to the G. G. Dated June 22, 1840, Ref. N. A. I. Home (Public) Deptt. O. C.9 15th July 1840

مدرسے میں مشرقی علوم کے لیے ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی رقم وقف کردی جس سے اس شعبے کو بھی بہت بڑا سہارا مل گیا۔[1] مشرقی اور انگریزی شعبوں کے منظم ہو جانے کے بعد مدرسے نے ایک نئی شکل اختیار کرلی اور ''دہلی کالج'' کے نام سے ملک کے گوشے گوشے میں مشہور ہوا۔

کالج کی زندگی میں انگریزی اور مشرقی شعبے برابر کی اہمیت رکھتے تھے۔ مشرقی شعبے کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں مغربی علوم کا درس اردو زبان کے ذریعے دیا جاتا تھا۔ انگریزی شعبے کے سینئر طلباء اپنے اساتذہ کی نگرانی میں اور مشرقی شعبے کے طلبا و اساتذہ کے تعاون سے انگریزی کی اہم کتابوں کو اردو میں منتقل کرتے تھے۔ جنھیں مشرقی شعبے میں نصابی کتابوں کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔[2] مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا مسئلہ حکومت اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے درمیان ایک عرصے تک زیر بحث رہا۔ دہلی کے حکام اور کالج کے ارباب حل وعقد اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں تھے۔ چناں چہ ان لوگوں نے عملی طور پر اس سلسلے میں گہری دل چسپی کا اظہار کیا۔ سیاست، معاشیات، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ اور سائنس سے متعلق انگریزی کی متعدد اہم کتابوں کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ اسی مقصد کے پیش نظر ''ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی'' (Vernacular Translation Society) کا قیام عمل میں آیا۔ اس سوسائٹی کو حکام کی سرپرستی اور اساتذہ کا سرگرم تعاون حاصل تھا۔ یہ زیادہ عرصے تک نہ چل سکی مگر جب تک قائم رہی اس نے مفید کام انجام دیے۔[3] کالج کے فارغ التحصیل طلبا نے یہاں کے ماحول میں حاصل کیے ہوئے جذبہ و جوش کی بدولت مختلف شعبہ ہائے حیات سے متعلق تراجم اور تصنیفات و تالیفات کا کام برابر جاری رکھا اور بہت جلد ان کی سرگرمیوں نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ یہاں کے طلبا جہاں کہیں بھی گئے انھوں نے اپنا وسیع حلقۂ اثر قائم کیا اور ملک کی علمی و ادبی زندگی میں جلد ہی قابل رشک مقام حاصل کرلیا۔ ان لوگوں میں رام چندر، مولوی کریم الدین، پیارے لال آشوب، محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ کے نام بہت نمایاں ہیں۔

شمالی ہند میں ذہنی بیداری اور جدید علوم وفنون سے دل چسپی پیدا کرنے میں دہلی کالج نے جو اہم حصہ لیا اس کا اندازہ بہت کچھ اس دور کے اخبارات، تصانیف اور یادداشتوں سے ہوسکتا ہے۔ یہاں کی علمی محفلیں، جماعت کے خاص اسباق، تحریر و تقریر کے مقابلے دہلی کے پڑھے لکھے لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بن گئے تھے۔ اخباروں میں کالج کی اہم خبریں خصوصیت کے ساتھ شائع کی جاتی

---

1. Thornton's Gazetteer of India. 1845, Vol. II, Page 112
2. Treatise, Pages xvi.
3. فوائد الناظرین، دہلی۔ ۶ رمارچ ۱۸۴۸ء، ملاحظہ ہو مضمون مجلسوں سے بیان میں۔

تھیں۔ کوئی نیا سائنسی تجربہ ہوتا تو اسے مشہور کیا جاتا اور شہر کے لوگوں کو آمادہ کیا جاتا تھا کہ وہ کالج میں آ کر اپنی آنکھوں سے سائنس کے حیرت انگریز کرشمے دیکھیں۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اشپرنگر (Sprenger) نے ''قران السعدین'' [1] کے نام سے ہفتہ وار اخبار بھی جاری کیا تھا۔ جس میں مغربی ممالک کی خبریں، سائنس کے موضوعات پر کالج والوں کے مضامین، دوسرے اخبارات کے اقتباسات اور انگریزی سے تراجم شائع کیے جاتے تھے۔ انگریز اساتذہ کے ساتھ ہی ساتھ مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی امام بخش صہبائی جیسے برگزیدہ حضرات بھی اس ادارے سے وابستہ تھے۔ آزردہ طلبا کا امتحان لینے کے لیے آیا کرتے تھے۔ مضمون نگاری کے مقابلے میں اول آنے والے طالب علم کو ان کی طرف سے ایک طلائی تمغہ بھی دیا جاتا تھا [2]۔ صہبائی کالج کے شعبۂ علومِ مشرقی میں فارسی کے استاد تھے۔ علمی تبحر کے باعث یہاں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ ان حضرات کی دلچسپی کے طفیل وہ لوگ بھی جن کے ذہن کی تربیت قدیم ماحول میں ہوئی تھی اور جو مغربی اقدار کو سراسر الحاد سے تعبیر کرتے تھے، اس نئے علمی و تہذیبی مرکز کے زیر اثر نئے ڈھنگ سے سوچنے پر مجبور تھے۔ دہلی کالج کے اس نئے وقار سے متاثر ہو کر امرا بھی اب اپنے بچوں کو یہاں بھیجنے لگے تھے۔ [3]

حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند میں مشرق و مغرب کی اعلیٰ اقدار کو یکجا کرنے کی پہلی کوشش دہلی کالج میں کی گئی۔ اس نقطہ پر قدیم و جدید اب مرکوز ہونے لگے تھے۔ یہاں کی خوش گوار علمی فضا میں نسل و رنگ، زبان و معاشرت اور وضع قطع کا فرق تحلیل ہو رہا تھا۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات یہاں عام طور پر استوار رہتے تھے۔ کالج کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اسے جن انگریزوں سے واسطہ پڑا وہ جابر حکام نہیں، شفیق اور وسیع القلب اساتذہ تھے۔ ان کا رویہ دوستانہ تھا۔ اس سلسلے میں کالج کے تھرڈ ماسٹر مسٹر فرنچ (Mr. French, Third Master) کا واقعہ دلچسپ اور قابل ذکر ہے۔ کالج کے لائبریرین نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مسٹر فرنچ (French) کے حکم کو خلاف قاعدہ پا کر اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر مسٹر فرنچ (French) کو غصہ آیا اور وہ لائبریرین کے ساتھ بہت بری طرح پیش آئے۔ بات پرنسپل تک پہنچی اور ان سے جواب طلب کیا گیا۔ مسٹر فرنچ (French) نے ''تمام دیسی ماتحتوں اور ملازموں'' کی شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ ان کے رویے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ''یورپی آقاؤں'' کو اپنے برابر کا سمجھتے ہوں۔ اس پر کالج کے پرنسپل مسٹر ایف بوترو (F. Boutros) بہت ناراض ہوئے اور اس سلسلے

---

[1] مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج، ص ۴۵ و ۵۳
[2] ؍؍ ؍؍ ص ۱۵۲ [3] ؍؍ ؍؍ ص ۳۳-۳۴

کی تمام خط و کتابت اپنے نوٹ کے ساتھ مقامی کمیٹی کے ممبروں، مسٹر ٹی ٹی مٹکاف (T.T. Metcalfe) اور مسٹر اے۔ روس (A. Ross) کے پاس بھیج دی۔ اسی نوٹ میں ایک جگہ انھوں نے لکھا تھا:

''......دیسی اساتذہ جن کا وہ (مسٹر فرنچ) اس قدر حقارت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، سب اس کالج کے پرانے طلبا ہیں جو انگریزی زبان سے واقف، سائنس کی تعلیم سے بہرہ مند اور بہت ہی باعزت کردار کے لوگ ہیں۔ مسٹر فرنچ کے رویے سے اگر وہ مجروح ہوں اور کسی حد تک مخالفانہ خفگی کا اظہار کریں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ وہ اگر ہر لحاظ سے مسٹر فرنچ کی ''برابر'' نہیں تو کم از کم بعض باتوں میں ان سے بہتر تو ہیں۔''

اس خط کے پیش نظر مقامی کمیٹی نے محکمہ عامہ (حکومت ہند) سے درخواست کی کہ مسٹر فرنچ (French) کو برخاست کر دیا جائے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا اور اس کے لیے احکامات جاری کر دیے گئے۔[1] اس اقدام سے کالج کے وقار میں اضافہ ہوا۔ کالج کے باہر بھی انگریز اساتذہ کا طرز عمل دوستانہ رہتا تھا۔ اسی لیے دہلی کی صحبتوں میں ارباب کالج نے خاص مقام حاصل کر لیا تھا۔ کالج شہر کی ہماہمی سے دور رہنے کے باوجود کوئی جزیرہ سا نہیں بن گیا تھا بلکہ شہر کے لوگوں سے اس کا گہرا رابطہ تھا۔[2] علمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں کالج کے حضرات نمایاں حصہ لیتے تھے اور ان کے علم و فضل کی بنا پر دہلی والوں کی نگاہوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔

کالج کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہیں آنے والے دور کے چند اعلیٰ ترین ذہنوں کی ساخت و پرداخت ہوئی۔ جنھوں نے قومی زندگی میں مختلف طریقوں سے بہت نمایاں حصہ لیا۔ تہذیبی جمود کو توڑنے کی کوشش کی، علمی و ادبی دنیا میں نئی روایتوں کی طرح ڈالی۔ مذہبی عقائد میں

---

[1] Ref. No. A. I. Home Deptt. Public Proceedings, O.C. 36, 37, 38. Dated Ist March to 12th April 1843.

[2] محمد حسین آزاد: آب حیات (مطبوعہ لاہور) ۱۹۵۰ء، ص ۴۶۷، ''جن دنوں شاہ صاحب سے معرکے ہو رہے تھے منشی فیض پارسا دہلی کالج میں مدرس حساب تھے اور ان دنوں جوانی کے عالم میں شاعری کے جوش و خروش میں تھے۔ انھوں نے مدرسے میں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ قائم کیا اور اسے انشاء اردو کی ترقی کا جزو اعظم ٹھہرا کر صاحب پرنسپل سے مدد لی۔ ان دنوں میں مدرسہ اجمیری دروازے کے باہر تھا۔ شہر کے دروازے ۹ بجے بند ہو جاتے تھے۔ گڈھ کپتان سے اجازت لی کہ مشاعرہ کے دن دو بجے تک اجمیری دروازہ کھلا رہا کرے۔ غرض مشاعرہ مذکورہ اس شان و شکوہ سے جاری ہوا کہ ایسا مشاعرہ دلی میں نہیں ہوا............''

لچک اور وسعت کی ضرورت پر زور دیا اور ہر جگہ فراخ دلی اور وسیع النظری کو اپنا شعار بنایا۔ چناں چہ نذیر احمد نے کالج کے فیضان کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی "ٹالریشن" گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد علی بصیرۃ یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا اور اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو کیا بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا، تنگ خیال ہوتا، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا۔"[1]

۱۸۵۷ء میں دہلی کالج کو اتنا زبردست نقصان پہنچا کہ پھر اس کی حالت نہ سنبھل سکی۔ ہندوستانیوں نے یہ سمجھا کہ یہ ادارہ اور اس کے متعلقین بیرونی حکومت کے طرف دار ہیں۔ کالج میں انگریز پرنسپل اور اساتذہ کی موجودگی، انگریزی زبان اور مغربی علوم پر زور، طلبا اور اساتذہ کی طرف سے مغربی سیاسی نظریات اور نظام کی حمایت اور اخبارات و رسائل کے ذریعے ملک کے طول و عرض میں اس کا پرچار، دو پرانے طلبا رام چندر اور چمن لال کا قبول عیسائیت، یہ سب باتیں کالج کی تباہی کا جواز بن گئیں۔ پرنسپل مسٹر ٹیلر (Tylor) جو جان بچا کر بھاگ نکلے تھے، پکڑے گئے اور ختم کر دیے گئے۔[2] رام چندر تو چند دن چھپے رہنے کے بعد بچتے بچاتے انگریزوں کے کیمپ میں صحیح سلامت پہنچ گئے[3] مگر چمن لال کو قتل کر دیا گیا۔[4] دہلی اردو اخبار کے وقائع نگار نے اپنی آنکھوں سے کالج کے لٹنے کا منظر دیکھا۔

"جانب مدرسہ جو نظر کی تو دیکھا کہ تمام اسباب میز و کرسی و تصاویر، صدہا ہزار روپے کے آلات وادوات تجربہ اور ہزارہا روپے کا کتب خانہ انگریزی و فارسی و نقشجات سب لوگ لوٹے لیے جاتے ہیں۔ انجام کو یہاں تک نوبت پہنچی کہ شطرنجی وغیرہ فرش لے کر فرش زمین یعنی چوکہ

۱؎ دہلی کالج اردو میگزین، قدیم دلی کالج نمبر، ۱۹۵۳ء ص۔ ۱۶۵

۲؎ دہلی اردو اخبار۔ ۱۷ ارمئی ۱۸۵۷ء

۳؎ Treatise, pages xxi-xxii

۴؎ دہلی اردو اخبار۔ ۱۷ ارمئی ۱۹۵۵ء

ہائے سنگ اور چوکھٹ و دروازے تک نکال لے گئے۔ غرض کہ تمام
حالات بدیدہ عبرت دیکھتا ہوا حقیر غریب خانہ آیا۔"[1]

بغاوت رفع ہو جانے کے بعد کالج پر انگریزوں کا غضب نازل ہوا، پرنسپل کی موت کا ذمہ دار ہندوستانی اساتذہ کو ہی سمجھا گیا تھا اس لیے اس کی سزا کا مستحق بھی کالج ٹھہرا۔ حکومت کی توجہ رفتہ رفتہ ادھر سے ہٹنے لگی اور کالج کی پرانی حیثیت ختم ہو گئی۔ نیا علمی مرکز لاہور قرار پایا اور ۱۸۷۷ء کے بعد کالج بند کر دیا گیا۔[2] ۱۸۵۷ء کے بعد کالج جیسا بھی رہا بہر حال چل رہا تھا اور لوگوں کو اب بھی اس سے امیدیں باقی تھیں۔ دہلی کالج ہندوستانی علم و تہذیب کا ایک مشہور و معروف مرکز رہ چکا تھا، اس لیے دہلی کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی کالج بند ہونے کی خبر پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ بمبئی کے اخبار 'مخبر سرور' نے اس سلسلے میں ایک طویل مضمون شائع کیا اور کالج کو بند کرنے کے لیے حکومت نے جو عذر پیش کیے تھے ان کے جوابات دیے۔[3] مگر اب کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو حکومت کی مرضی کو بدل سکتی۔

ملک پر مکمل قبضے کے بعد ہندوستانی تہذیب کی بیخ کنی کی منظم کوششوں میں اضافہ ہو گیا۔ سرکاری مدرسوں کے ذریعے ایسے اذہان ڈھالنے کی کوشش شروع کی گئی جو آزادانہ غور و فکر کی صلاحیت سے عاری ہوں اور سامراجی نظام کے استحکام میں مددگار ثابت ہوں۔ ایسے حالات میں دہلی کالج جیسے ادارے کا جہاں "جسم ہندی میں جان انگریزی" ڈالنے کی بجائے اس جسم میں رہنے والی جان کو توانائی عطا کرنے کی کوشش کی جارہی تھی، بری طرح متاثر ہونا لازم تھا۔

(۴)

اگر مخصوص خیالات کی تبلیغ کے لیے منظم اجتماعی عمل کو "تحریک" کہا جا سکتا ہے تو دہلی کالج اور اس کے زیر اثر جاری ہونے والی سرگرمیوں کو تحریک سے تعبیر کرنا غلط نہ ہوگا۔ دہلی کالج میں مطبع العلوم اور مجمع فوائد العام کا قیام، ان کے زیر اہتمام اخبارات و رسائل کی اشاعت، ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی (Vernacular Translation Society) اور پھر کالج کی بربادی کے بعد

---

[1] دہلی اردو اخبار۔ ۱۷ رمئی ۱۸۵۷ء

[2] Imperial Gazetteer of India, 1908, Provincial Series, Vol., pages 300

[3] مخبر سرور بمبئی۔ ۱۲ صفر المظفر ۱۲۹۴ھ مطابق ۲۶ رفروری ۱۸۷۷ء

دہلی سوسائٹی کے ذریعے اپنے نظریات کی تبلیغ اور ان کو عمل میں لانے کی کوششیں اس کا بین ثبوت ہیں۔[1]

سی ایف ۔ اینڈ ریوز (C.F. Andrews) کا یہ خیال بہت حد تک صحیح ہے کہ بنگال میں ہندوستانی نشاۃ ثانیہ نے اپنا پہلا اظہار زبان و ادب کے ذریعے کیا جب کہ دہلی اور شمالی ہند میں دہلی کالج کی رہنمائی میں سائنس کی طرف توجہ زیادہ دی گئی۔[2] مگر سائنس سے یہ دلچسپی خود ادب کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ اس کی بدولت ادب میں حقیقت پسندی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سائنسی مضامین کو اردو زبان میں منتقل کیا گیا۔ بڑی تعداد میں علمی مضامین لکھے جانے لگے۔ رجعت اور ترقی کی قوتوں نے قدیم و جدید فلسفہ و علم کی بنیاد پر زور قلم کے ذریعے ایک دوسرے پر فتح پانے کی کوشش کی اور اس طرح اردو زبان و ادب میں بھی صحت مند تغیرات نمودار ہوئے۔

اردو نثر کی تاریخ میں دہلی کالج، علی گڑھ تحریک اور فورٹ ولیم کالج کے درمیان ایک کڑی ثابت ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد نثر پر جمود طاری ہونے کے بجائے دہلی کالج اور اس سے متعلق حضرات کی بدولت چند اعلیٰ روایات کی داغ بیل پڑی اور ادب میں نمو اور بالیدگی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج سے یہ اس بنا پر ممتاز تھا کہ یہاں ہندوستانیوں کو اردو کے ذریعے مغربی علوم و ادب سے آشنا کرانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جب کہ فورٹ ولیم کالج کا اصل مقصد حکومت کی ضروریات کے پیش نظر انگریزوں کو مشرقی علوم و ادب اور زبانوں سے واقفیت بہم پہنچانا تھا۔ یہ فرق ان دونوں اداروں کی شائع کی ہوئی کتابوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ علی گڑھ کالج اور دہلی کالج میں کوئی بنیادی اختلاف نہ ہونے کے باوجود ایک اہم فرق یہ تھا کہ علی گڑھ کالج میں مغربی علوم کی تدریس کا ذریعہ انگریزی ہی کو بنایا گیا جب کہ دہلی کالج نے اردو کو بطور ذریعۂ تعلیم تسلیم کیا اور اس زبان کے ذریعہ ہندوستان میں مغربی علوم کی اشاعت کو ترجیح دی۔ دہلی کالج میں پہلی بار مختلف موضوعات سے متعلق منتخب اور اعلیٰ پایے کی تصانیف کو اردو میں منتقل کر کے انھیں کالج کے نصاب میں داخل کیا گیا۔ ترجمے کا کام اردو میں اس سے پہلے بہت کم ہوا تھا۔ خصوصاً علمی مضامین لکھنے یا ترجمہ کرنے کی روایت تقریباً مفقود تھی۔ اسی لیے انھیں اردو میں علمی تراجم کی ابتدائی شکل سمجھنا چاہیے۔ پھر بھی اصطلاحات اور ہم معنی الفاظ وضع کرنے کی طرف توجہ، انگریزی زبان سے مناسب اور موزوں الفاظ مستعار لینے کی کوشش اور لفظی ترجمے کی بجائے ادائیگی مفہوم کی اہمیت کا احساس قابل ستائش ہے۔ اس سلسلے میں ورنا کولر ٹرانسلیشن سوسائٹی

---

[1] ان اداروں کا تفصیلی ذکر دوسرے باب میں ملاحظہ ہو۔

[2] Andrews (C.F.): Zakaullah of Delhi, pages-42

(Vernacular Translation Society) کے مرتب کیے ہوئے اصولوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ ترجمے کی بنیادی باتوں سے بخوبی واقف تھے[1] روایات کے فقدان، اردو نثر کی کم مائیگی اور زبان کے محدود ہونے کی بنا پر وہ انھیں پوری طرح برت نہیں سکے۔

دہلی کالج سے پہلے اردو نثر کا بیشتر حصہ داستانوں اور قصہ کہانیوں پر مشتمل تھا۔ مذہبی موضوعات پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھا جاتا تھا مگر ان کی تعداد نسبتاً بہت کم تھی۔ دہلی کالج کے حلقے نے اردو میں متنوع مضامین کے ایک بیش بہا ذخیرے کا اضافہ کیا۔ یہی مضامین شمالی ہند میں ذہنی بیداری کے آغاز کا سبب بنے۔ اس ادارے کی کوششوں سے پہلے اردو مشرقی علوم اور عربی فارسی کی ادبی و لسانی روایات سے تو استفادہ کر سکی تھی، مگر مغرب سے تقریباً غیر متعارف تھی۔ دہلی کالج کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو زبان اور اردو داں حلقے کو یورپی ادب اور فلسفے سے آشنا کرایا۔ فکر و خیال کے دھاروں پر جغرافیائی حدود کے جو بند بندھے تھے وہ ٹوٹنے لگے، اور اردو بھی فکری اعتبار سے جدید عالم گیر تہذیبی وحدت کا جزو بن گئی۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد اردو نثر زیادہ تر صحافت کے سہارے آگے بڑھی۔ صحافت سے غیر معمولی طور پر متاثر اور اس کی مرہونِ منت ہونے کی بنا پر اس دور کی اردو نثر میں صحافت کی خوبیاں بھی ملتی ہیں اور خامیاں بھی۔ ترقی کے ابتدائی مدارج میں ہونے کے سبب، متنوع اسالیب کی کمی اور تحریر میں خام کاری کے باوجود اردو زبان و ادب کو اس دور نے جو کچھ دیا، اس کا پلہ بہت بھاری ہے۔ پریس کے قیام اور اخبارات و رسائل کے اجرا سے پڑھنے والوں کے حلقے میں توسیع ہوئی اور ادب امرا کے درباروں، اور شرفا کے دیوان خانوں سے نکل کر ہر پڑھے لکھے تک جا پہنچا۔ لکھنے والے پڑھنے والوں سے قریب تر ہوئے۔ ادب سماجی افکار و احساسات کی غیر شعوری عکاسی کی منزل سے گذر کر شعوری اظہار کی منزل میں آیا۔ نئے حالات، نئے مسائل فکر و خیال کے لیے مہمیز ثابت ہوئے اور ہر شعبۂ حیات سے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر سے فکر انگیز مضامین لکھے جانے لگے۔

اردو نثر نے شاعری کے مقابلے میں کم عمر ہونے کے باوجود دورِ جدید میں شاعری سے پہلے قدم رکھا۔ جس زمانے میں دہلی کی شاعری پر بھی ''لکھنویت'' کا سایہ پڑتا جا رہا تھا، نثر میں حقیقت پسندی، مقصدیت، افادیت اور نقطۂ نظر کی اہمیت کا احساس نمایاں ہونے لگا تھا۔ حالی کی ''چپ کی داد'' ''مناجات بیوہ'' اور ''حب الوطن'' سے بہت پہلے رام چندر عورتوں کی تعلیم، بیواؤں اور یتیموں کی سرپرستی اور علمی، سماجی و اخلاقی ترقی کے لیے اجتماعی کوششوں کی اہمیت پر مضامین لکھ چکے تھے۔

---

[1] مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج، ص ۱۲۷-۱۳۰

موضوع اور مفہوم کے اعتبار سے نثر اس وقت نظم سے زیادہ ترقی یافتہ تھی، مگر ہیئت، اسالیب اور اصناف کے لحاظ سے نظم نثر سے بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ نثر ابھی روایات اور تجربات کے سرمائے سے محروم تھی۔ مگر اسی نثر نے نذیر احمد، ذکاء اللہ، آزاد اور حالی کے یہاں آکر نیا آب و رنگ پایا۔ اس کے انداز میں تیکھا پن اور خال و خط میں دل کشی آئی۔ طرز اظہار میں پختگی اور اسالیب میں تنوع ظاہر ہوا۔ صحافت سے تعلق تو رہا مگر اس کا بوجھ کم ہو گیا، اور نثر خود اپنے معیار متعین کرنے لگی۔ مگر ان سب عناصر کی تخم ریزی اسی اگلی نسل کے ہاتھوں ہو چکی تھی، جس کے ممتاز ترین نمائندوں میں رام چندر تھے۔ ان کے شاگردوں یعنی نذیر احمد، آزاد اور ذکاء اللہ کے یہاں دہلی کالج کے زیر اثر ظہور میں آنے والی نثر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی اور عین اسی مقام پر ان ہی حضرات کے توسط سے دہلی کالج کا یہ عظیم الشان ورثہ علی گڑھ تحریک کو منتقل ہو گیا۔

دوسرا باب

حالاتِ زندگی

(۱)

رام چندر نے جب جنم لیا تو دہلی پر عملی طور سے انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور اب وہ یہاں اپنے نظم ونسق کے استحکام کے لیے کوشاں تھے۔ مغل بادشاہ کا تاج و تخت اب بھی برقرار تھا مگر حکم ''کمپنی بہادر'' کا چلتا تھا۔ دہلی والوں کے جان و مال کے محافظ، روٹی کپڑے کے کفیل، داد فریاد کے سننے والے، غرض کہ سب کچھ اب انگریز ہی تھے۔ سیاسی و معاشی نظام میں اہم تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ کاشت کار اور اہل حرفہ اپنے اپنے حال پر روتے تھے۔ امرا کی رسّی جل چکی تھی مگر بل ابھی باقی تھے۔ درمیانی طبقے کی تقدیر میں پہلے بھی ملازمت تھی اور اب بھی اسے نوکری ہی کرنی تھی۔ مغل گئے تو انگریز آ گئے۔ اس طبقے کے افراد کے لیے اگر فرق ہوا تو یہ کہ کمپنی کے تحت اس کی حالت پہلے سے کچھ سدھر ہی گئی۔ نیا نظام اس طبقے کا سرپرست تھا اور اسی لیے یہ اب بڑھنے اور پھیلنے لگا تھا۔

رام چندر بھی ۱۸۲۱ء میں دہلی کے ایک ایسے ہی متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد رائے سندر لال ماتھر کمپنی کے محکمۂ مالیات میں ملازم تھے۔ وہ پہلے نائب تحصیل دار اور پھر تحصیل دار کی حیثیت سے ضلع کے صدر مقام پانی پت میں مقیم رہے۔ ۱۸۳۱ء میں جب رام چندر ۹ برس کے ہی تھے، رائے سندر لال چل بسے، جس سے گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا، اور ان کی بیوہ پر خود اپنی گذر بسر کے علاوہ چھ بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اچانک آ پڑی۔ رام چندر کی ماں بڑی سلیقہ مند اور صابر و شاکر خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے فرائض کو بڑی خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا۔ شوہر کے انتقال کے بعد اعزا کا سہارا لینا ان کی خوددار طبیعت کو گوارا نہ تھا۔ اس لیے زیورات بیچ کر اپنے اور اپنے بچوں کے جملہ اخراجات کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ بچوں کی تعلیم کی طرف انھوں نے خاص توجہ دی۔ سب بچوں کی ابتدائی تعلیم رواج کے مطابق کچھ گھر پر

ہوئی، اور کچھ مکتب میں۔ اس کے بعد انھیں انگلش اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ یہاں اس وقت ہر طالب علم کو دو دو روپے اور اول و دوم جماعتوں کے طلبا کو پانچ پانچ روپے بطور وظیفے کے دیے جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۳۳ء میں جب رام چندر اس اسکول میں داخل ہوئے تو تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے چھوٹے موٹے اخراجات کی گنجائش بھی نکل آئی۔ چھ برس تک وہ یہیں پڑھتے رہے۔ اپنی ذہانت، محنت اور شرافت کی بدولت ابتدائی مدارج میں کامیاب ہوئے اور اساتذہ و طلبا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ یہیں انھیں ریاضی کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ اسکول میں تو ریاضی کی تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہ تھا، وہ محض اپنی دلچسپی سے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس مضمون سے رفتہ رفتہ ان کا شغف بڑھتا گیا اور اسکول چھوڑنے تک انھوں نے اس میں اچھی خاصی استعداد حاصل کرلی۔ یہی ذاتی مطالعہ مستقبل میں ریاضی داں کی حیثیت سے ان کی شہرت کی بنیاد بنا۔[1] ابھی رام چندر گیارہ برس کے تھے کہ ان کی شادی کی بات چلی۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے تو پوت کے پاؤں پالنے ہی میں دیکھ لیے تھے، اس لیے ان پر بہتوں کی نظر پڑی۔ اتفاق سے شہر کے ایک رئیس خوشحال رائے نے جب شادی کے لیے اپنی لڑکی کا زائچہ بنوایا تو وہ رام چندر کے موافق نکلا۔ خوشحال رائے کی دولت اور رسوخ کی بنا پر پنڈتوں پروہتوں کی ہمدردیاں ان ہی کے ساتھ تھیں، اس لیے ان کی رائے بھی خوشحال رائے کی مرضی کے مطابق ہی رہی۔ دولت اور حسب ونسب کے باعث رام چندر کے خاندان والوں کو بھی یہ رشتہ بہت پسند آیا۔ مزید امور کی زیادہ تحقیق کرنا اس وقت کا دستور نہیں تھا۔ برادری میں جو لوگ باعزت، ذمہ دار اور قابل اعتبار سمجھے جاتے تھے ان کا اصرار ہی کافی تھا۔ چنانچہ لڑکی گونگی بہری نکلی۔ مگر کیا کیا جاتا۔ زائچے دونوں کے ملتے تھے، لڑکی کا نام سیتا اور لڑکے کا رام چندر ہونا بھی نیک شگون تھا، پھر دنیوی اعتبار سے بھی رشتہ کوئی ایسا برا نہ تھا۔ چنانچہ شادی طے ہوگئی۔ تمام تقریبات بڑے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ منائی گئیں۔ خوشحال رائے نے لڑکی کی شادی میں جی کھول کر روپیہ خرچ کیا، مگر رام چندر کے ہاں سب رسمیں بڑے سادہ طریقے پر ہوئیں۔ بس فرائض پورے کردیے گئے۔ شادی کے پہلے دن ان کی سسرال سے سونے کی سات مہریں، چاندی سونے کے ورقوں میں پان اور بہت سارو پیہ نقد آیا۔ دولھا کے یہاں سے پیتل کے برتنوں میں مٹھائی بھیجی گئی اور پانچ روز تک گانے بجانے، ناچ رنگ اور دعوتوں کا سلسلہ جاری رہنے کے بعد رام چندر کی شادی ہوگئی۔[2]

ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی باپ کے انتقال کا غم اور گھر کی ذمہ داریوں کا بار ہی کیا کم تھا، پھر کم سنی کی شادی، اور وہ بھی ایک ایسی خاتون سے جو شوہر کے لیے سہارا بننے کی بجائے خود سہارا چاہتی

۱۔ Memories, pages-5

۲۔ Memories, pages-5-7

تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ تعلیم کا شوق اور کسی نہ کسی طور اسے جاری رکھنے کی فکر، ایک نوعمر کے ذہن کو کچل کر رکھ دینے کے لیے عام طور پر اتنی مصیبتیں کافی ہوتی ہیں۔ رام چندر ذہین اور سمجھدار تھے اس لیے وہ جھیل گئے ورنہ ان حالات میں معمولی ذہن کے لوگ اپنی ساری صلاحیتیں کھوکر ہزاروں حسرتیں سینے سے لگائے ہوئے زندگی کے دن جیسے تیسے کاٹ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ذہن کے کسی گوشے سے کوئی آواز آتی بھی ہے تو وہ کھوئی ہوئی صداؤں کی بازگشت سے زیادہ نہیں ہوتی، خوابیدہ آرزوئیں جاگتی بھی ہیں تو انھیں تھپک تھپک کر سلا دینے ہی میں عافیت نظر آتی ہے۔ وہ اپنے خوابوں کو حقائق سے ہم کنار دیکھنے کی بجائے دونوں کو متصادم پاتے ہیں۔ ان میں زور آزمائی کی قوت ختم اور مفاہمت فکست خوردگی کی حد تک بڑھ جاتی ہے اور چٹانوں سے ٹکرا کر ٹوٹ جانے والی لہر کی طرح بالآخر وہ بھی بکھر جاتے ہیں۔

رام چندر نے اپنے زمانے کے مصائب کا بڑی بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ وہ اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر کے ان چٹانوں سے ٹکرائے، بار بار ٹکرائے، ہر بار جیتے اور ہر ٹکراؤ کے بعد ان کی قوتوں میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ مگر اس منزل پر پہنچنے کے لیے انھیں بہت کچھ قربان بھی کرنا پڑا۔ ابتدائی واقعات کے بوجھ نے ان کی جذباتی زندگی کو ہلکان کر دیا۔ احساس ذمہ داری نے بچپن کی بے فکری کو اور معصومانہ فرض شناسی نے شگفتگی مزاج کو مغلوب کر لیا۔ سنجیدہ مسائل کے بوجھ سے ان کا ذہن ہمیشہ گراں بار رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں اپنی زندگی میں ''بچپن'' نصیب نہیں ہوا۔

ماں کا زیور، سسرال سے ملا ہوا اثاثہ اور اسکول کا قلیل وظیفہ کب تک اور کس کس کے کام آتا۔ چناں چہ چھ برس تک کسی نہ کسی طرح تعلیم جاری رکھنے کے بعد انھیں مجبوراً اسکول چھوڑ کر محرومی کی ملازمت اختیار کرنی پڑی۔[1] ایک قوی دماغ کو زمانے کے سرد و گرم نے مفلوج کر دینے کی بجائے ایک طرف نرمی، لچک، تحمل اور قناعت عطا کی تو دوسری طرف ذوق عمل اور عزم محکم۔ ملازمت کے دنوں میں بھی حصول علم کا شوق باقی رہا اور تین برس اس امید پر گزار دیے کہ اس شوق کو پورا کرنے کا وقت آ ہی جائے گا۔ چناں چہ ۱۹۴۱ء میں ملازمت ترک ہوئی اور تعلیم کا سلسلہ دوبارہ جاری ہوا۔[2] وہی انگلش اسکول اب دہلی کالج کا انگریزی شعبہ بن گیا تھا۔ رام چندر پھر یہیں داخل ہو گئے۔ دوران تعلیم میں اُنھوں نے غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار کیا اور تیس روپے کا سینیئر اسکالر شپ بھی حاصل کیا۔[3] تراجم کے کام میں بھی اساتذہ کی مدد کرنے لگے۔ ہر حلقے میں ان کی قدر کی جانے لگی اور بہت جلد کالج کے ممتاز لوگوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ بھائیوں کی

۱۔ Treatise page xvi

۲۔ " "

۳۔ " "

تعلیم، ماں کی دیکھ بھال اور دوسری گھریلو ذمہ داریوں کو بھی پہلے کی طرح حسن و خوبی کے ساتھ نباہتے رہتے۔

(۲)

رام چندر جب کالج میں داخل ہوئے تو یہاں پرنسپل بوترو (Boutros) کی سرکردگی میں تراجم کا کام شروع ہو چکا تھا۔[1] رام چندر نے بھی اپنے اساتذہ کے ساتھ تحریک میں دل چسپی اور انہاک کے ساتھ حصہ لیا۔ ابتدا میں وہ اپنے استادوں کے صلاح و مشوروں سے منتخب انگریزی کتابوں کے ترجمے کیا کرتے تھے، جب کالج میں خود ان کا تقرر بطور استاد ہو گیا تو وہ بھی اپنے طالب علموں سے اس کام میں مدد لینے لگے۔ یہی تراجم مشرقی شعبے کے طلبا کے نصاب میں شامل کر دیے جاتے تھے اور یہی دہلی و شمالی ہند میں مغربی سائنس اور فلسفے سے ابتدائی واقفیت کا سبب بنے۔ ۱۸۴۳ء میں ان انفرادی کوششوں کو منظم کرنے کے لیے، انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی (Vernacular Transslation) کا قیام عمل میں آیا۔[2] اسے حکام کا تعاون حاصل تھا اور یہاں بھی کالج کے اساتذہ اور طلبا ہی پیش پیش تھے۔ سوسائیٹی نے ترجمے کے چند بنیادی اصول مرتب کیے تھے۔ ترجمہ کرنے والوں کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔[3] مولوی عبدالحق صاحب نے سوسائیٹی سے شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست میں ۱۲۸ نام لکھے ہیں۔[4] کالج میں ڈاکٹر اشپرنگر (Sprenger) نے جومسٹر بوترو (Boutros) کے بعد پرنسپل ہو کر آئے، مطبع العلوم، رسائل اور کتابوں کی اشاعت میں بڑی سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ کالج کے طلبا اور اساتذہ نے اخبارات و رسائل کے ذریعے جدید علوم و نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مجمع فواید العام کے نام سے ایک انجمن بھی قائم کی تھی۔ دہلی کالج کے حضرات سے متعلق ہونے کی بنا پر یہ سب انجمنیں یکساں مقاصد کے تحت چند افراد کی سرکردگی میں کام کر رہی تھیں۔ اس لیے عملی طور پر ان میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ ہاں دائرۂ عمل ضرور مختلف تھا۔ انگریزی کتابوں کے تراجم کالج کے اندر طلبا کی ذہنی تربیت میں حصہ لیتے تھے اور کالج کے باہر مجمع فواید العام کے اخبارات جدید رجحانات کو دور دور تک پھیلاتے تھے۔ رام چندر کا پہلا اخبار فواید الناظرین ایک عرصے تک اسی سوسائیٹی کے زیر اہتمام شائع ہوتا رہا۔[5] جنوری ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر اشپرنگر (Sprenger) کی تحریک پر ایک

---

[1] خطبات گارساں دتاسی مطبوعہ ۱۹۳۵ء (انجمن ترقی اردو)، ص ۴۷ ۶

[2] مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج، ص ۱۳۳

[3]، [4] عبدالحق: مرحوم دہلی کال، ص ۱۳۳، ۱۳۹ تا ۱۴۵

[5] مجمع فواید العام کے زیر اہتمام شائع ہونے والے شمارے۔ ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد میں موجود ہیں۔

اور اخبار 'قران السعدین' جاری کیا گیا[1] یہ ہفتہ میں ایک بار شائع ہوتا تھا اور اس کا مقصد مشرقی و مغربی تہذیبوں کی اعلیٰ اقدار کو فروغ دینا اور ان میں امتزاج پیدا کرنا تھا۔ اخبار میں خبروں کے ساتھ انگریزی کے اہم مضامین کے تراجم اور جدید علوم سے متعلق طلبا اور اساتذہ کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ نئی نئی ایجادوں، دریافتوں اور تحقیقات پر خاص طور سے مضامین لکھوائے جاتے تھے۔ کالج کی سرگرمیوں سے متعلق پابندی سے اطلاعات شائع ہوتی تھیں۔ جماعتوں میں کیے جانے والے سائنسی تجربات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاتا تھا اور انھیں دیکھنے کے لیے شہر والوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ دہلی کالج کی یہ سرگرمیاں اگر ایک طرف نوجوانوں کے لیے کشش رکھتی تھیں اور انھیں نئے ڈھنگ سے سوچنے پر مجبور کرتی تھیں تو دوسری طرف ایک بہت بڑا طبقہ ان لوگوں کا تھا جن کے نزدیک انگریزی زبان اور مغربی علوم نہ صرف مشرقی اخلاق وتمدّن کے خلاف تھے بلکہ کفر والحاد سے کم نہ تھے۔ خود رام چندر اس تحریک کا ذکر ان الفاظ میں کرتے تھے:

> ''یہ تراجم شعبہ مشرقی میں نصابی کتابوں کے طور پر جاری کیے گئے۔ چناں چہ دو تین سال کے اندر عربی و فارسی شعبوں کے طلبا کسی حد تک انگریزی علوم سے واقف ہو گئے۔ قدیم فلسفے پر مبنی نظریات جو عربی کے ذریعہ پڑھائے جاتے تھے۔ جدید سائنس کے قرین عقل اور تجرباتی نظریات کے سامنے ماند پڑ گئے۔''[2]

اس عظیم الشان کام میں بہت بڑا حصہ رام چندر کا تھا۔ دہلی کالج، ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائیٹی اور مجمع فوائد العام، تینوں اداروں کے سرگرم اراکین میں وہ سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں تھے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی اُنھوں نے اپنی محنت، ذہانت اور خلوص کے ذریعے اساتذہ اور کالج کے منتظمین کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ چناں چہ کالج سے فارغ التحصیل ہوتے ہی ۲۸ر فروری ۱۸۴۴ء کو انھیں شعبہ علوم مشرقی میں بحیثیت استاد ریاضی رکھ لیا گیا[3] تقرر کے وقت تنخواہ پچاس روپیہ ماہوار مقرر ہوئی مگر مارچ ۱۸۴۸ء میں بڑھا کر سو روپے ماہوار کر دی گئی[4] تقرر کے بعد مصروفیتوں میں اور

---

[1] فوایدالناظرین ۱۲ر جنوری ۱۹۵۶ء نیز ملاحظہ ہو مقدمہ ''کربل کتھا'' مؤلفہ فضل علی فضلی۔ شائع کردہ شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی: ''اشپرنگر نے ..... پینی میگزین کے طرز میں ایک باتصویر اور ہفتہ وار اردو رسالہ جاری کیا جس کا نام ''قرآن السعدین'' تھا۔ گویا مشرق و مغرب، زہرہ اور مشتری تھے جن کا قرآن اس رسالے میں ہوا تھا......''۔

[2] Trreatise, page - xv [3] Memories, page 137

[4] قرآن السعدین، ۲۰ر مارچ ۱۹۴۸ء

اضافہ ہوگیا۔ مارچ ۱۸۴۵ء میں اُنھوں نے 'فوایدالناظرین' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا، پھر ستمبر ۱۸۴۷ء میں ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ ابتدا میں اس کا نام 'خیرخواہ ہند' تھا مگر چوں کہ اس نام سے ایک اور رسالہ مرزاپور سے بھی نکلتا تھا اس لیے اس کا علم ہونے پر اسی رسالے کا نام 'محبّ ہند' رکھ دیا گیا۔ یہ دونوں پرچے دہلی کالج سے شروع ہونے والی اصلاحی تحریک کا ایک اہم جزو تھے۔ ان کے ذریعے رام چندر نے علم و ادب کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اردو نثر کے نئے طرز کی داغ بیل پڑی۔ مضمون نگاری کا آغاز اور تھوڑے ہی عرصے میں مفید اور کارآمد علمی مضامین کا ایک بیش بہا ذخیرہ وجود میں آ گیا۔ مگر چوں کہ اس اخبار اور رسالے کے ذریعے ایسے نظریات کی تبلیغ کی جاتی تھی جو عام عقائد کے خلاف تھے۔ داستانوں اور لطائف کی جگہ اس وقت کے عام مذاق سے بلند چونکانے اور جھنجھوڑنے والے مضامین شائع ہوتے تھے، اس لیے انھیں زیادہ خریدار میسّر نہ آسکے۔ چند روشن خیال ہندستانیوں اور انگریز افسروں کے سہارے دس برس تک جاری رہنے کے بعد مجبوراً ۱۸۵۵ء میں ان کی اشاعت بند کردینی پڑی۔[1] 'فوائدالناظرین' اور 'محبّ ہند' جب تک جاری رہے، پڑھنے والوں کے اذہان پر صحت مند اثرات ڈالتے رہے۔ بند ہوئے، تو اپنی مسلم تاریخی حیثیت قائم کرگئے۔ ان سے نہ صرف اس دور میں استفادہ کیا گیا اور بہت جلد اسی قسم کے متعدد اور جرائد جاری ہوگئے بلکہ مستقبل کے ادب اور صحافت کے لیے بھی اُنھوں نے ایک عظیم الشان سرمایہ چھوڑا۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ رام چندر نے زمانۂ طالب علمی میں شروع کردیا تھا۔ اس کے بعد اس کام میں اور زیادہ محو ہوگئے۔ دہلی کالج میں اپنے قیام کے دوران اُنھوں نے گیارہ کتابیں شایع کیں۔ ریاضی ان کا خاص مضمون تھا اس لیے بیشتر کتابیں اسی سے متعلق تھیں۔ ان کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف جس نے ان کے نام اور قابلیت کو یورپ تک پہنچایا وہ تھی "A Treatise on the Problems of Maxima and Minima" اس کتاب کی اشاعت پر علمی حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس زمانے میں کسی ہندوستانی سے ریاضی پر اس پایے کی کتاب لکھنے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس لیے جب رام چند کی کتاب شائع ہوئی تو ہر طرف سے نہ صرف اس کا استقبال ہوا بلکہ حیرت کا بھی اظہار کیا گیا۔ تعریف کے ساتھ ساتھ تنقیدیں بھی ہوئیں۔ کلکتہ ریویو نے اس کتاب پر جو تبصرہ کیا اس سے رام چندر کو سخت صدمہ پہنچا۔ اپنی سوانح میں اُنھوں نے لکھا ہے:

"مسائل کلیات و جزئیات' پر کتاب لکھتے وقت میں نے بہت سے ہوائی

---

[1] دہلی کالج میگزین۔ قدیم دہلی کالج نمبر ۱۹۷۳ء، ص ۶۲

قلعے بنائے مگر میرے ان کھوکھلے خیالی ڈھانچوں کو کلکتہ ریویو والوں (اور دوسروں) نے مسمار کردیا۔"[1]

مگر کلکتہ ریویو نے بھی کتاب کی علمی حیثیت پر شک کرنے کے باوجود اس کے مصنف کی ذہنی اُپج اور ذوق تجسّس کو بہت سراہا تھا اور امید ظاہر کی تھی کہ وہ آئندہ اس سے بھی بڑے کارنامے انجام دیں گے۔[2]

اسی زمانے میں رام چندر نے کلکتہ کا قصد کیا۔ کلکتہ ان دونوں ملک کا حسین ترین خطہ سمجھا جاتا تھا۔ ساحلی شہر، اہم بندرگاہ، تجارتی مرکز اور کمپنی کی حکومت کا صدر مقام ہونے کی بنا پر اسے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انگلستان کے طرز کی عالی شان عمارتوں "سبزہ ہائے مطرا" اور "نازنین بتان خود آرا" کی بدولت یہ ہندوستانیوں کے خوابوں کا شہر بن گیا تھا۔ فاصلے کی دوری، وقت کی کمی اور محدود ذرائع آمدورفت کے باعث کلکتے پہنچنا ہر شخص کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ اس دوری نے اسے اور زیادہ پُراسرار بنا دیا تھا۔ وہ ہندوستان کی سرزمین پر انگلستان کا ٹکڑا سمجھا جاتا تھا۔ رام چندر جو انگلستان کے واقعات سُن سُن کر پہلے ہی سے اس کے گرویدہ تھے کلکتہ جائے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ کلکتہ ریویو کی تنقید دیکھنے کے بعد انھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ خود کلکتے جائیں اور وہاں کے بااثر اور علم دوست حضرات پر اپنی کتاب کی اہمیت جتائیں۔ چناں چہ ۱۸۵۱ء میں وہ کالج کے امتحان کے زمانے میں تین ماہ کی چھٹی لے کر کلکتے گئے۔[3] یہاں اُنھوں نے کلکتہ ریویو کے اعتراضات کا جواب لکھا جو 'انگلش مین' (Englishman) میں شائع ہوا۔ دہلی کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر اشپرنگر (Sprenger) کی وساطت سے وہ سپریم کونسل کے ممبر اور مجلس قانون (Law Commission) اور مجلس تعلیم (Education Commission) کے صدر ڈرنک واٹر بیتھیون (Drinkwater Bethune) سے بھی ملے۔ مسٹر بیتھیون نے رام چندر کی کتاب کے ۳۶ نسخے لے کر انھیں دو سو روپے پیش کیے اور یہی نسخے اُنھوں نے یورپ کے چند ماہرین ریاضی کے پاس بھیج دیے۔[4] لندن یونی ورسٹی کے پروفیسر مسٹر آگسٹس ڈی مارگن (Augustus de Morgan) اس کتاب کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز (Court of Directors) کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور

۱۔ Treatise page xvi

۲۔ Calcutta Review, Volume xiv, July - Dec. 1850, page xxxvii

۳۔ Treatise page xix

۴۔ Treatise page xix

تجویز پیش کی کہ اسے دوبارہ چھپواکر ان کے ایک نوٹ کے ساتھ یورپ کے سربرآوردہ ریاضی دانوں کے پاس بھیجا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس کتاب کی قدر و قیمت کے پیش نظر مصنف کے علمی کارنامے کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اپنے ملک میں بھی کوئی مناسب اعزاز پیش کیا جائے۔اس تجویز پر کورٹ آف ڈائرکٹرز (Court of Directors) نے ہندوستان کی مجلس تعلیم عامہ اور شمالی مغربی صوبے کے حکام کی رائے سے یہ طے کیا کہ رام چند کو ایک خاص تقریب میں معززینِ شہر کے سامنے ایک خلعت پنج پارچہ (جس کی قیمت تین سو روپے ہو) اور دو ہزار روپیہ نقد بطور انعام پیش کیے جائیں۔کورٹ آف ڈائرکٹرز کی منظوری سے یہ کتاب پروفیسر مارگن کے اہتمام میں ۱۸۵۹ء میں لندن سے دوبارہ شائع ہوئی۔اس میں ان کا لکھا ہوا ایک طویل 'پیش لفظ' بھی شامل تھا، جس میں ہندوستان میں علم ریاضی کے تاریخی پس منظر کو پیش کرتے ہوئے اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔رام چندر کو متعارف کرانے کے لیے ان کے حالات زندگی بھی پیش کیے تھے جو خود رام چندر نے پروفیسر مارگن کی فرمائش پر لکھ کر بھیجے تھے۔[1]

کورٹ آف ڈائرکٹرز (Court of Directors) کے فیصلے کے مطابق رام چندر کو یہ اعزاز پیش کرنے کے لیے ۱۳ر جنوری ۱۸۵۹ء کو دہلی میں ایک خاص تقریب منعقد کی گئی، جس میں دہلی کے کمشنر اور دوسرے حکام اور عمایدین شہر کی موجودگی میں محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر ولیم۔ڈی۔ آرنلڈ (William D. Arnole) نے ایک طویل تقریر میں رام چندر کی خدمات کو سراہا اور پھر انھیں خلعت و انعام سے نوازا گیا۔خلعت کورٹ آف ڈائرکٹرز (Court of Directors) کی طرف سے رام چندر کی علمی خدمت کے صلے میں پیش کی گئی اور دو ہزار روپے کا نقد انعام کمشنر دہلی کی طرف سے انھیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں حکومت کی مدد اور تعاون کے صلے میں عطا کیا گیا۔[2]

"رسالہ مسائل کلیات و جزئیات' (A Treatise on the Problem of Maxima & Minima) جب ۱۸۵۰ء میں پہلی بار شائع ہوا تو رام چندر کی عمر تقریباً انتیس برس کی تھی۔

---

[1] پروفیسر مارگن کا خط اور اس سلسلے میں کورٹ آف ڈائریکٹرز اور شمالی مغربی صوبے کے حکام کے خطوط نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی میں محفوظ ہیں حوالہ جات درج ذیل ہیں:

1. Letter to the Court, No. 11 of 1857
2. Public Department, No. 137 of 1858
3. Home Education Deptt. No. 11-3 of 1858
4. " " Education letter to the Governor General, No. 10.

[2] Memoirs, page 140 - 141

اس عمر میں اتنا بلند علمی مرتبہ حاصل کرلینا یقیناً غیر معمولی بات تھی۔ پروفیسر مارگن (Morgarn) نے اس کتاب کے بارے میں جو کچھ لکھا اور مصنف کی قابلیت اور صلاحیت کا جن الفاظ میں اعتراف کیا، وہ ان کے لیے بجا طور پر باعثِ فخر تھا۔ اس کی اہمیت اس بنا پر اور زیادہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں شمالی ہند میں جدید سائنس کی تعلیم کا محض آغاز تھا، کتابیں کم دستیاب ہوتی تھیں، جو ملتی تھیں وہ سب انگریزی میں تھیں، جس سے یہاں واقفیت ابھی برائے نام تھی۔ ان حالات میں مغربی تعلیم کی اہمیت کا نہ صرف احساس بلکہ عملی طور پر اسے ملک میں رائج کرنے کی کوشش اور خود ذاتی محنت سے اس میں کمال حاصل کرلینا، رام چندر کی بالغ نظری اور پختگی شعور کی دلیل ہے۔ ان کی شخصیت کے وزن و وقار کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ان مخصوص حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں رام چندر نے تعلیم حاصل کی اور جن کا بچپن سے لے کر کالج کی ملازمت تک انھیں مقابلہ کرنا پڑا۔

(۳)

رام چندر کی زندگی کا اہم ترین واقعہ خود ان کے قول کے مطابق قبول عیسائیت تھا۔[1] اُن کے عقائد میں تبدیلی تو اُسی وقت سے آچلی تھی جب اُنھوں نے مغربی سائنس اور فلسفہ کا مطالعہ شروع کیا۔ مطالعے میں توسیع کے ساتھ ساتھ فکر میں تشکیک و تجسّس کے عناصر بھی پروان چڑھتے رہے۔ حالات نے بچپن سے ہی سنجیدہ اور متین بنا دیا تھا۔ انگریزی کے مطالعے نے انھیں اپنی سرحدوں سے پار دیکھنے کی بصیرت عطا کی۔ ریاضی، طبیعات اور ہیئت کے مطالعے نے ذہن کو تحلیل و تجزیاتی طرز فکر کا عادی بنا دیا۔ اکتسابِ علم، ان کے ادراک کو اقتضائے فطرت کے مطابق ڈھالتا رہا۔ ہر شے کو ٹھونک بجا کر دیکھنا ان کی عادت بن گئی۔ تسلیم شدہ خیالات کو وہ جانچنے اور پرکھنے لگے اور قومی رسم و رواج اور عقائد و نظریات کو تجربے، مشاہدے، مطالعے اور تغیر زمانہ کا تابع سمجھنے لگے۔ تبدیلیٔ مذہب کو بھی ان کے اس نظامِ فکر کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ دوسرے مذاہب کے خلاف اعتراضات اور عیسائیت کے حق میں ان کے دلائل کی صحت کو جانچنا یہاں بے محل ہوگا۔ غور کرنے کی بات صرف یہ ہے کہ تبدیلیٔ مذہب کا واقعہ ان کے کردار کے کن پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے اور اس کے بعد ان کی جو شخصیت اُبھرتی ہے وہ قطع نظر ان کے مذہبی عقائد کے، لائقِ احترام ہے یا نہیں؟

رام چندر بت پرستی سے تو بہت پہلے برگشتہ ہو چکے تھے۔ کچھ عرصے تک وہ بنگال کی اصلاحی تحریک

---

[1] Treatise, pages - xix-xx

سے بھی متاثر رہے۔[1] وحدانیت پر ایمان لے آنے کے بعد ان کے نزدیک کسی مذہب کو ماننے کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ وہ وحی والہام کے منکر اور خالق ومخلوق کے درمیان ''کثرت آرائی کی وحدت'' کی بنا پر حائل ہو جانے والے پردوں کو چاک کرنے کے درپے ہو گئے۔ بہت دن تک وہ اس عقیدے پر اس پختگی کے ساتھ قائم رہے کہ جب کبھی شہر کے سرکردہ ہندو مسلمان انھیں قائل کرنے میں ناکام ہو کر ان پر عیسائی ہو جانے کا الزام لگاتے تو رام چندر جواباً اُنھیں چیلنج کرتے کہ وہ کسی مشنری (Missionary) کو بھی ان کے روبرو لے آئیں اور دیکھ لیں کہ وہ انھیں قائل کرنے میں ناکام ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ مستقل مولویوں، پنڈتوں اور پادریوں کی توجہ کا مرکز بنے رہے مگر ان کی عقل پرستی نے روحانیت کو اُبھرنے کا موقع نہ دیا اور ایک مدّت تک اسی منزل پر رہے جہاں ۔

کھینچتا ہے کوئی دامن تو گریبان کوئی

رام چندر اس منزل سے کس طرح گزرے، اس کے بارے میں اُنھوں نے خود کافی تفصیل سے لکھا ہے:

> ''کبھی کبھی مسٹر تھامپسن مجھے بازار میں روک کر سمجھاتے تھے کہ میں اپنی عاقبت کی فکر کروں۔ وہ مجھے اردو اور فارسی میں چھپے ہوئے رسائل وغیرہ بھی دیا کرتے۔ میں ان سے بغیر کچھ کہے، نئے عہدنامے (New Testament) وغیرہ کا کوئی حصّہ لے لیتا تھا جنھیں گھر پہنچ کر کونے میں ڈال دیتا اور کچھ نہ پڑھتا۔''[2]

''(میں) اپنی ریاضی کی کتاب مکمل کر لینے کے بعد اور کلکتہ جانے سے قبل ہی ''بشارت عیسوی'' کا معتقد ہو گیا تھا۔ دل میں اس اعتقاد کے جاگزیں ہونے سے پہلے میرے ذہن میں دو غلط خیال تھے'' ان میں پہلا خیال تو یہ تھا کہ انگریز خود عیسائیت کو نہیں مانتے ہیں کیوں کہ بحیثیت سرکار کے وہ اس کی تعلیم پر زور نہیں دیتے۔ دوسرے یہ کہ جو شخص بھی خدائے واحد کو مانتا ہے اس کے لیے کسی اور مذہب کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔[3]

پہلا خیال اس وقت دور ہوا جب دف مسٹر ٹیلر (Tylor) کے کہنے پر کوٹلہ سے آئے ہوئے ایک

---

[1] Treatise, pages XVII - XVII

[2] Treatise, page XVII

[3] Treatise, page XX (واوین کے بعد پروفیسر مارگن کے الفاظ ہیں)

طالب علم کے ساتھ انھیں پہلی بار گرجا گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں اُنھوں نے چند پڑھے لکھے اور روشن خیال انگریزوں کو جن کی وہ بہت عزت کرتے تھے مسیح کے سامنے خشوع وخضوع کے ساتھ سر جھکائے، دعائیں مانگتے ہوئے دیکھا۔ اس منظر سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ واپس آتے ہی انجیل کا مطالعہ شروع کر دیا۔[1] رفتہ رفتہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھتی گئی کہ محض بت پرستی کو برا سمجھنا اور ایک خدا پر ایمان لانا ہی نجات کے لیے کافی نہیں اس کے لیے حضرت مسیح کے حفظ وامان میں رہنا بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے عیسائیت کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ قرآن اور گیتا کو انگریزی تراجم کے ذریعے پڑھا اور انھیں صحیح طور پر سمجھنے کے لیے عربی اور سنسکرت کے علما سے مدد لی۔[2] مختلف مذاہب کی تعلیمات وعقائد کا تقابل اور موازنہ کیا۔ اس سلسلے میں مولویوں اور پنڈتوں سے بڑے بڑے مباحثے اور مناظرے بھی منعقد کیے۔ مگر ان کا اصل معرکہ مسلمانوں سے تھا، وحدانیت کا اعتراف اُنھیں اسلام سے قریب تر لے آیا تھا۔ بت پرستی سے نفرت کی بنا پر ہندومت کی طرف لوٹنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا، انتخاب اسلام اور عیسائیت میں سے کرنا تھا، چناں چہ ان کے مباحثے اور مناظرے زیادہ تر مسلمانوں سے ہی ہوئے۔ مولویوں کے دلائل اُنھیں مطمئن نہ کر سکے اس لیے وہ عیسائیت کی طرف راغب ہونے لگے۔ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں انھیں عیسائیت کے مطالعے کا موقع بھی نسبتاً زیادہ ملا تھا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت سے متعلق سارا مواد انگریزی زبان میں بہ آسانی دستیاب ہو سکتا تھا جب کہ اسلام کے بارے میں تمام اہم کتابیں عربی وفارسی اور ہندومت سے متعلق صرف سنسکرت میں تھیں۔ پریس ابھی نیا نیا تھا اس لیے ان کتابوں کی اشاعت بھی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ پرانی قلمی کتابیں نایاب تھیں۔ چناں چہ ان مذاہب کے مطالعے کا انحصار زیادہ تر ان مفسرین پر تھا جو رام چندر کے خیال میں مغربی فلسفہ وعلوم سے ناآشنا ہونے کی بنا پر ناقابلِ اعتبار تھے۔ ہندوستان کی پسماندگی کا باعث ان کے نزدیک توہم پرست اور راسخ العقیدہ مولوی اور پنڈت تھے جب کہ انگلستان کی ترقی ان کے خیال میں بہت حد تک مسیحی اخلاقی کی مرہون منت تھی۔ کالج کے ذریعے انگریز اساتذہ اور حکام سے تعلق ہونے کی وجہ سے عیسائی مشنریوں سے بھی رام چندر کا تعلق رفتہ رفتہ بڑھتا رہا۔ ایک حد تک تو اُنھوں نے اپنے دل ودماغ کو ان کے اثر سے بچانے کی کوشش کی، مگر بہت دن تک وہ اپنی عقل پرستی پر قائم نہ رہ سکے اور کشاں کشاں مسیحی روحانیت کی آغوش میں چلے گئے۔

مکمل طور پر عیسائیت پر ایمان لے آنے کے بعد اصطباغ حاصل کرنا سب سے زیادہ مشکل مرحلہ

---

1. Treatise, pages-xx
2. Treatose, page xvi

تھا، یہاں خاندانی نام ونمود اور ذاتی تعلقات آڑے آتے تھے اور سماجی رسم و رواج راہ میں حائل تھے۔ چناں چہ ایک عرصے تک وہ یہی سمجھتے رہے کہ قبول عیسائیت کا اعلان ضروری نہیں، محض اسے دل سے قبول کر لینا ہی کافی ہے۔[1] اپنی کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں مالی طور پر زیر بار ہو جانے کی بنا پر یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں تبدیلی مذہب کا سبب حرص و غرض مندی کو نہ ٹھہرا دیا جائے۔ اسی زمانے میں کلکتہ کے مدرسے میں انھیں ایک اعلیٰ ملازمت کی اُمید ہوئی تھی۔ مدرسے کے پرنسپل سے انھیں یہ بھی توقع تھی کہ وہ ان کی کتاب کو کونسل آف ایجوکیشن (Council Education) سے سفارش کر کے انگریزی مدارس کے لیے منظور کرا دیں گے، مگر ساتھ ہی ساتھ پرنسپل صاحب کی شرط یہ تھی کہ وہ عیسائیت کا علی الاعلان اقرار نہ کریں، چناں چہ ایک عرصے تک وہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے۔[2] مگر مطالعے کے دوران میں انجیل کی چند سطروں نے دامن دل کو بارہا کھینچا اور وہ ساتھ ساتھ کھنچتے چلے گئے۔

> "No man, when he lighteth a candle, coverth it with a vessel or putteth it under a bed; but setteth it on a candle stick, that they which enter in may see the light. For nothing is secret that shall not be made manifest; neither anything hid, that shall not be known and come aboard."[3]

> (''کوئی شخص شمع جلا کر اسے پیالے سے ڈھک نہیں دیتا، نہ اسے بستر کے اندر رکھتا ہے بلکہ اسے شمع دان پر لگاتا ہے تاکہ اندر آنے والے روشنی دیکھ سکیں، کیوں کہ راز ایسا نہیں ہے جو عیاں نہ ہوگا اور نہ کوئی پوشیدہ شے ایسی ہے جو ظاہر نہ ہوگی'')

اس چراغ کی لو تیز تر ہو کر قلب و جگر کو تپانے لگی۔ تبدیلی مذہب کی پوشیدگی دل و دماغ پر بار ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ اُنھوں نے اپنے قریبی حلقے میں مسیحیت کا اقرار شروع کر دیا اور بہت جلد یہ خبر دور دور تک پھیل گئی۔ شہر میں تہلکہ مچ گیا، اعزا و اقربا، دوستوں اور بزرگوں نے انھیں باز رکھنے کے

---

1. Treatise, pages-xxi
2. Memoirs, page 59.
3. Memoirs, page 63

(انجیل کی یہ سطریں رام چندر نے ۱۹؍ اگست ۱۸۵۲ء کو اپنی ڈائری میں نقل کی تھیں)

لیے سو سو جتن کیے، مگر ان کے ارادے میں ذرا بھی تبدیلی نہ آئی۔ ایڈون جیکب (Edwin Jacob) تو اپنے والد کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے یہاں تک لکھتے ہیں کہ خود بہادر شاہ ظفر نے ان کو بلایا اور کوشش کی کہ وہ مشرف بہ اسلام ہو جائیں مگر رام چندر نہ صرف یہ کہ خود راہ پر نہ آئے بلکہ قلعہ کے ایک ملازم غلام نثار کو بھی عیسائی کرلائے[1] بالآخر اُنھوں نے اپنے دل و دماغ کو علی الاعلان تبدیلی مذہب کے لیے تیار کرلیا۔ ۱۱رجولائی ۱۸۵۲ء کو اپنے ایک ساتھی ڈاکٹر چمن لال (سب اسسٹنٹ سرجن دہلی) کے ہمراہ سینٹ جیمز چرچ (St. James Church) پہنچے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک بڑے مجمع کے سامنے اصطباغ حاصل کیا[2] عیسائیوں میں ان کے اس اقدام پر بڑی خوشی منائی گئی۔ رام چندر اپنے تجربہ اور شرافت نفس کی بنا پر دہلی کے بہت باعزت و بااثر لوگوں میں سے تھے، ایسے شخص کا عیسائی ہو جانا صرف ایک فرد کا 'راہ پر آنا' نہیں بلکہ یہ عیسائیت کی فتح سمجھی گئی۔ دوسری طرف دہلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بہت سے احباب واعزا تو آخر میں اس پر بھی راضی تھے کہ رام چندر عیسائیت پر تو قائم رہیں مگر اصطباغ لینے سے احتراز کریں۔ مگر رام چندر تو اس منزل سے پہلے ہی گزر چکے تھے۔ اُنھوں نے جب اس مشورے کو بھی ٹھکرا دیا تو لعنت و ملامت اور قطع تعلق کا سلسلہ بندھ گیا۔ ماں، بیوی، بچوں اور بھائیوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ایک شاگرد نے اس موقع پر دو قطعات کہے۔ شروع شروع میں استاد کے احترام کی بنا پر سناتے ہوئے شرماتے تھے مگر لوگوں کے اصرار پر جھجکتے جھجکتے سنانے لگے۔

ہزدہ صد پنجاہ و دو یاز دہم جولائی ماسٹر ڈاکٹر ہند کرشتاں گشتند

ایں ندا از دہن خلق خدا برترشد آمدن بر دولعینان بہ جہنم رفتند

....

رام چندر بہ مذہب عیسیٰ طوقِ لعنت کشید در گردن

ہاتف نغمہ زد کہ آں بے آب در جہنم رسید تر دامن

ایک اور صاحب نے بھی چند اشعار کہے جنھیں خود رام چندر نے ۱۲راگست ۱۸۵۲ء کو اپنی ڈائری میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

''ہم عیسائیت قبول کرنے والوں کے خلاف ایک نظم کہی گئی ہے۔ مگر یہ

---

[1] Memoirs, page 84

[2] Memoirs, page 84

عیسائیت کی قوت کا ایک اور ثبوت ہے۔ یہی سب کچھ بلکہ اس سے کہیں
زیادہ حواریوں اور اگلے عیسائیوں کے ساتھ ہوا تھا۔"[1]

اشعار تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ انھیں نقل کیا جائے مگر ان سے لوگوں کے غم و غصّے کا پتا چلتا ہے۔
اشعار سے کہیں زیادہ اہم وہ جملے ہیں جو رام چندر نے ان سب سے متاثر ہو کر تحریر کیے تھے۔ اسی
جذبے نے انھیں سب کچھ جھیل جانے کی طاقت عطا کی۔ دوستوں اور عزیزوں کی خفگی شہر والوں
کے طعنے تشنے اور دشنام طرازیاں ایک طرف اور انجیل کا یہ پیغام ایک طرف۔

"Blessed are ye, when men shall hate you and and, when they shall separate you from their company and shall reproach you and cast out your name as evil..........in the like manner did their fathersunto the prophets."

ترجمہ:

"تمھارے لیے باعثِ رحمت ہوگا جب لوگ تم سے نفرت کرنے
لگیں گے اور تمھیں ملزم ٹھہرائیں گے، جب وہ تمھارا ساتھ چھوڑ دیں گے
اور تمھارے نام کو کسی بری شے کی طرح ٹھکرائیں گے ان کے اجداد نے
بھی پیغمبروں کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔"[2]

رام چندر نے نہ صرف سب کچھ خاموشی کے ساتھ جھیلا بلکہ جن لوگوں نے ان کی طرف سے
آنکھیں پھیر لی تھیں، ان سے انتقام تو درکنار ان کے دوستانہ رویّے میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ہر
ماہ کی تنخواہ اب بھی پہلے کی طرح ماں کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، ماں نے بیٹے کا جیب خرچ البتہ
اس کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے بڑھا دیا، بھائیوں کے گھر آنا جانا جاری رہا، نو برس تک بیوی اور
لڑکیاں علاحدہ رہیں مگر ان کے اخراجات وہ اب بھی پہلے کی طرح پورے کرتے رہے۔[3]

---

1. Memoirs, page 83
2. Memoirs, page 57
مسز جیمس سی۔ لیوس (Mrs. James C. Lewis) نے "یسوع داس" کو ان کی تبدیلی مذہب کے
موقع پر چند مذہبی کتابیں تحفتاً پیش کرتے ہوئے "سطریں" لکھ کر بھیجی تھیں۔
3. Memoirs, page 86

تبدیلی مذہب کے بعد لوگ عام طور پر پچھلا رشتہ منسوخ سمجھ کر دوسری شادی کسی ہم مذہب خاتون سے کر لیتے تھے، مگر رام چندر نے یہ گوارا نہ کیا۔ دوسروں کی طرح اپنا محلہ چھوڑ کر انگریزوں کی بستی میں بھی پناہ نہیں لی، ہاں اپنے نام سے پہلے ''یسوع داس'' ضرور بڑھا لیا، مگر وہ مشہور رام چندر ہی کے نام سے رہے، وہ خود بھی اپنا پہلا نام ہی زیادہ لکھتے تھے ''یسوع داس'' کے اضافے کا مقصد شاید صرف یہ تھا کہ ''یسوع'' کے نام کی برکت رہے اور ''یسوع'' کے سامنے ان کی بندگی میں کوئی شبہ نہ رہے۔

سماجی دباؤ سے بیٹھ جانے کی بجائے وہ مخالفوں کا مقابلہ کرنے کے لیے عیسائیت کی تبلیغ میں کہیں زیادہ جوش و خروش سے حصہ لینے لگے۔ دہلی میں مشن اور سینٹ سٹیفن چرچ کا قیام بہت کچھ ان ہی کی مالی امداد اور کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔[1] مگر ان سب باتوں کے باوجود اپنے سماج سے ان کا رشتہ کبھی نہ ٹوٹا ان کے رکھ رکھاؤ اور وضع قطع سے ''صاحبیت'' کی بجائے ہندوستانیت ہی ظاہر ہوتی تھی، اسی لیے ۱۸۵۷ء میں دہلی کی فتح کے بعد انگریز افسروں نے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا جو عام ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ چناں چہ اُنھوں نے دہلی کے فوجی گورنر، کرنل ایچ۔ پی۔ برن (H.P.Barn) کو ایک خط کے ذریعے چند افسوس ناک ذاتی تجربات سے مطلع کرتے ہوئے لکھا کہ بغاوت کے دوران اُنھوں نے جو تکالیف اُٹھائیں اور جن خطرات کے درمیان وہ رہے، ان سے کم از کم یہ تو اطمینان تھا کہ اگر مار ڈالے گئے تو صاحب ایمان کی حیثیت سے مریں گے اور یہ موت ویسی ہی ہوگی جو مسیحیت کے ابتدائی مبلغوں کو نصیب ہوئی تھی، مگر:

> ''اب جب کہ ایک ہندوستانی عیسائی کو خود عیسائی افسروں کی طرف سے محض گوری چمڑی نہ ہونے کی بنا پر خطرہ ہے تو مشکل ہی سے وہ سکون باقی رہ گیا ہے۔ یہ حال تو دہلی کے ان باغیوں کا بھی نہ تھا جو غلط مذہب پر یقین رکھتے تھے۔ وہ لوگ ایک مسلمان یا ہندو سے بھائی کی طرح ملتے تھے، وہ

---

[1] اس چرچ میں دہلی کے ممتاز عیسائیوں کے نام کی سنگ مرمر اور پیتل کی تختیاں آویزاں ہیں۔ ان ہی تختیوں میں پیتل کی سب سے بڑی اور بیل بوٹوں سے مزین تختی یسوع داس رام چندر کے نام کی ہے:

"In memory of Yesudas Ramchandra, one of the first converts of Delhi, baptized in St. James, Church, in 1851; Professor in Delhi College and appointed by the Government Tutor to two successive Maharajas of Patiala. Steadfast in faith and consistent in his life, he won the trust of both Englishmen and natives, Died 11th August, 1880, ages 60 years. "A devout man and one who served God."

صرف عیسائیوں سے اور ان لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ جو ان کے دوست سمجھے جاتے تھے۔ میری یہ درخواست محض ہندوستانی عیسائیوں کے لیے نہیں ہے کیوں کہ وہ تو دہلی میں بہت ہی کم ہیں، بلکہ ہندوؤں اور کچھ مسلمانوں کے لیے بھی ہے جنھیں شہر میں رہنے کی اجازت تو دے دی گئی ہے مگر جو انگریز سپاہیوں خصوصاً انگریز افسروں کی وجہ سے خطرے میں ہیں۔"[1]

بغاوت رفع ہو جانے کے بعد انھیں دہلی کی غارت گری سے سخت صدمہ ہوا۔ شہر کی بربادی کے مزید منصوبوں کے بارے میں سن سن کر انھیں اور بھی تشویش تھی، چناں چہ ایک اور ذاتی خط میں لکھتے ہیں:

"کچھ یورپین اب پورے شہر کو ڈھا دینے کی باتیں کرتے ہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ ہندوستان اور یورپ کے سچے عیسائی حضرات حکومت کو یہی مشورہ دیں گے کہ مسلمانوں نے اس شہر کو ایک مسیحی شہر بنایا جائے۔ یہی مسیحی انتقام ہے۔"[2]

رام چندر اس صبر آزما دور میں ایسے مخالفین سے جس تحمل اور عفو درگزر کے ساتھ پیش آئے اس کی بدولت ان کا پچھلا احترام قائم رہا گو کہ ان کی عیسائیت میں کبھی ضعف نہیں آیا۔ یوم سینٹ اسٹیفنز (St.Stephen's Day) کے موقع پر جب اُنھوں نے دہلی کے تمام عیسائیوں کو اپنے یہاں دعوت پر بلایا تو لوگ اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر کھڑے ہوئے حیرت کے ساتھ تکتے تھے کہ مختلف ذاتوں کے لوگ جو چند دن پہلے ایک ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے اب ایک جگہ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے اور آپس میں بے تکلفی کے ساتھ ہنس بول رہے تھے۔ رام چندر کے اس مسیحی اخلاق نے بہت جلد اپنا کام اور اُن کی ذات سے قرب رکھنے والے لوگوں میں سے کچھ علی الاعلان عیسائی ہو گئے۔ کچھ زبان سے تو اقرار نہ کر سکے مگر دل سے عیسائیت کی طرف مائل ہونے لگے اور کچھ لوگ عیسائیت کے بارے میں رام چندر کی مثال کے پیش نظر نئے سرے سے سوچنے پر مجبور ہوئے۔ خود ان کے بھائی رائے شنکر داس جو ایک عرصے سے عیسائیت کے مطالعے میں مشغول تھے عیسائیت پر ایمان لا چکے تھے، مگر زبان سے اقرار نہ کر سکے۔ رام چندر کے مشہور اور معزز شاگرد مولوی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد جنھیں ان سے بہت لگاؤ تھا استاد کے عیسائی ہو جانے

---

[1] S. N. Sen. Eighteen Fifty seven, pages 119-121

[2] Memoirs, page 105 (اقتباس از مکتوب بنام ریورینڈ جیکسن مورخہ ۱۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء دہلی)

کے بعد بھی ان سے جدا نہ ہوئے چناں چہ شہر میں عام طور پر ان لوگوں کو بھی عیسائی سمجھا جانے لگا۔ ہر طرف سے لعنت اور ملامت ہوئی مگر رام چندر سے ان کی محبت اور عقیدت کم نہ ہو سکی۔ ذکا اللہ تو اپنے عقائد پر ہمیشہ قائم رہے اور لوگوں کے لعن طعن سے نہ تو ان کے خیالات میں کوئی فرق آسکا اور نہ رام چندر سے ان کے قرب میں[1] مگر نذیر احمد کے قدم ضرور ڈگمگا گئے اور ایک عرصے تک وہ اسلام، عیسائیت اور الحاد کے درمیان کشاکش میں مبتلا رہے۔ ''حیات النذیر'' کے مصنف نے ان کے بارے میں بہت دل چسپ انکشاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں[2]

''عیسائیت کی طرف رجحان ہوا تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ ریائی نمازوں کی التحیات میں اشہدان محمداً عبدہ ورسولہ کی جگہ اشہدان عیسی ابن اللہ، کہنے لگے، مگر عیسیٰ کا خدا اور خدا کا بیٹا ہونا دل میں اچھی طرح جمتا نہ تھا، پھر جھجکتے جھجکتے وہی (اشہدان محمداً عبدہ ورسولہ) کہنے لگے، مونہ (منہ) سے اقرار دل سے انکار، غرض مولانا کسی وقت میں عیسائی تھے، کسی وقت میں مسلمان، کسی وقت میں کچھ بھی نہیں۔ وہ اس بات کی بھی کوشش کرتے تھے کہ مذہبی خیالات کو سرے سے سر میں آنے ہی نہ دیں، مگر کوئی نہ کوئی اتفاق پیش آتا ہی رہتا تھا کہ وہ خدا سے بے تعلق محض نہیں ہونے دیتا تھا۔''

ایڈون جیکب (Edwin Jacob) نے آگرہ کرسچن ٹریکٹ اینڈ بک سوسائٹی (Agra Christian Tract & Book Society) کی رپورٹ برائے ۱۸۵۲ء سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں رام چندر عربی کی پہلی جماعت کے ایک طالب علم کا ذکر کرتے ہیں جسے لوگ طرح طرح کے طعنے دیتے تھے اور کافر کہنے لگے تھے، مگر وہ طالب علم سب کو چیلنج کرتا تھا کہ اسے کافر کہنے والے اس کے سامنے اسلام کا برحق ہونا ثابت کر دیں۔ اسے اپنے جرم کی پاداش میں بہت تکلیفیں اُٹھانی پڑیں اور دہلی کے صدر امین نے ڈرا دھمکا کر ایک تحریر پر اس کی مہر بھی ثبت کروالی جس میں عیسائیت سے انکار اور اسلام کا اقرار کیا گیا تھا۔ رام چندر کا بیان ہے کہ رازدارانہ طور پر وہ مجھ سے اقرار کرتا ہے کہ صرف جبر و اذیت نے اسے عیسائیت قبول کرنے سے باز رکھا۔[3] میرے خیال میں یہ بیان نذیر احمد ہی کے بارے میں ہے۔

ماں باپ کے توسط سے مخصوص مذہبی عقائد پر عمل کرنا کوئی خاص بات نہیں، مگر خود اپنی سمجھ سے کام لے کر اور شدید مخالفتوں کے باوجود نیا مذہب اختیار کرنا یقیناً ایک غیر معمولی بات ہے۔ رام چندر ایک دو پشت پہلے سے عیسائی ہوتے یا مرتے دم تک ہندو ہی رہتے تو شاید شعور و احساس، خلوص و

---

[1] C. F. Andrews: Zakaullah of Delhi, pages vii-x and 60-62

[2] افتخار عالم بلگرامی: حیات النذیر (مطبوعہ ۱۹۱۲ء) ص ۲۶۸

[3] Memoirs, pages 49-52

ایثار، عزم واستقلال اور صبر وتحمل کی ایک دنیا ہماری نگاہوں سے اوجھل رہ گئی ہوتی۔ ان کی زندگی میں اہمیت، مذہب سے کہیں زیادہ تبدیلی مذہب کی ہے۔ یہ ان پہ ان کے کردار کی عظمت کی ایک دلیل ہے کہ اتنی اہم تبدیلی کے باوجود انھوں نے توازن واعتدال نہیں کھویا اور کبھی ایک خاص سطح سے نیچے نہیں اُترے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مذہبی عقائد کی مخالفت اور تبدیلی مذہب کے اقدام کی مذمت تو کی گئی مگر ان کی ذات سے نفرت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ دراصل یہی کسی شخص کے خلوص اعتقاد کے ناپنے کا پیمانہ ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ کس مذہب کا پیرو ہے۔

(۴)

رام چندر کی زندگی میں دوسرا کڑا وقت وہ تھا جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت برپا ہوئی۔ رام چندر اور چمن لال[1] ان لوگوں میں سے تھے جن کی سپاہیوں کو خاص طور سے تلاش تھی۔ چمن لال تو پکڑے گئے اور ختم کر دیے گئے مگر رام چندر اپنے احباب واعزا کی مدد سے بچ نکلے۔ اپنے چھپنے، بھاگنے اور خیریت کے ساتھ دہلی واپس پہنچنے کی تفصیل اُنھوں نے خود قلم بند کی ہے۔ ریورینڈ جیکسن (Rev.Jackson) کو ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

> ''گزشتہ ماہ مئی کی ۱۱ر تاریخ کو خدا کے فضل سے عیسائیوں کے قتل عام میں محفوظ رہا۔ جس وقت باغی گزر رہے تھے میں بھی بازار میں ٹہل رہا تھا اس بات سے قطعاً بے خبر کہ وہ میرے عیسائی بھائی اور دوست چمن لال کو گولی مار چکے ہیں۔ مگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس کافر مجمع میں کسی نے بھی باغیوں کو میرا پتہ نہ دیا۔''[2]

پروفیسر مارگن (Morgan) کی فرمائش پر اپنی سوانح لکھتے ہوئے وہ سارا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''باغیوں نے تو مجھے بہت تلاش کیا۔ مگر میرے چھوٹے بھائیوں نے جو ابھی تک ہندو ہیں، مجھے میرے آبائی مکان کے زنان خانے میں چھپا دیا جو ایک گلی میں واقع تھا۔ میرے پڑوسیوں اور جان پہچان والوں نے بھی از راہِ کرم مجھ سے بے وفائی نہ کی۔ تیسرے روز یعنی ۱۳ر مئی ۱۸۵۷ء کی شام کو جب اندھیرا چھا گیا تو میں اپنے دو ملازموں کے ساتھ شہر سے بھاگ نکلا۔ یہ لوگ مجھے دہلی

---

1. چمن لال دہلی کے سب اسسٹنٹ سرجن تھے، وہ جدید طب کے ہندوستانی ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے اور رام چندر کے ساتھ ہی عیسائی ہو گئے تھے۔
2. Memoirs, pages 105 (خط بنام ریورینڈ جیکسن۔ مورخہ ۱۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء دہلی)

سے کوئی دس میل دور متوالا گاؤں میں لے گئے۔ میں اس گاؤں میں تقریباً ایک ماہ تک اس خطرے میں (بھی) ٹھہرا رہا کہ جس زمیندار نے مجھے ازراہِ عنایت اپنے یہاں رکھا ہے، اس کے مخالفین کہیں میرا پتہ نہ بتا آئیں۔ یہاں میں روزانہ زمینداروں کو انگریزوں کے ذرائع، قوت اور علم کے بارے میں بتاتا اور انھیں سمجھاتا تھا کہ یہ (سمجھنا) غلط ہے کہ انگریز ہمیشہ کے لیے جا چکے ہیں۔ ۱۰ر جون ۱۸۵۷ء کو باغیوں کا ایک دستہ گاؤں سے ہو کر گزرا اور کسی نے انھیں بتادیا کہ یہاں ایک عیسائی ٹھہرا ہوا ہے۔ مگر میرے بوڑھے ملازم کو چند منٹ پہلے اس کی اطلاع ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے جگا کر خطرے سے آگاہ کیا۔ پہلے تو میں یہ جانتے ہوئے بھی زمیندار کے گھر کے اندر چھپا رہا کہ اب مجھے ڈھونڈ کر مار ڈالا جائے گا مگر ایک بہت ہی ہوشیار برہمن زمیندار نے مجھے اور میرے ملازم کو مشورہ دیا کہ ہم باغیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی جنگل میں ہولیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا مگر ابھی ہم کوئی پون میل بھاگے ہوں گے کہ گاؤں میں شور و غل سنائی دیا۔ ہم لوگوں کے چاروں طرف گولیاں سنسنا رہی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ سوار ہمارا پیچھا کر رہے ہیں، کیوں کہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ میں اس وقت ایک خاردار جھاڑی میں گھس گیا، ان کانٹوں کا خیال کیے بغیر جو میری بوٹی بوٹی میں پیوست تھے۔ خدا کی عنایت سے باغیوں نے لوٹے کھسوٹے اور (ان) زمینداروں کی خاص پٹائی کرنے کے بعد جن کے ساتھ میں گاؤں میں رہا تھا، جنگل میں گھسنے کی بجائے دہلی کی سمت اپنی راہ لی۔ جب گاؤں کی طرف کچھ سکون ہوا تو میں اپنے پرانے جاٹ ملازم کے ہمراہ سارا جنگل کھنگالتا ہوا بہ مشکل تمام ۱۲ر جون ۱۸۵۷ء کو انگریز کیمپ میں جا پہنچا۔"[1]

انگریزی کیمپ میں انھیں دہلی سے روزانہ پہنچنے والی خبروں کا مترجم مقرر کیا گیا۔[2] یہاں وہ ۲۰ر ستمبر ۱۸۵۷ء تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد دہلی واپس آگئے۔[3] دہلی میں مسٹر ولیم میور (William Muir) نے جو (بعد میں سر ولیم بنے) ان کے ذمہ لوٹ کھسوٹ سے بچے ہوئے۔ قدیم فارسی مخطوطات کو حاصل کرنے اور ان کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا کام سپرد کیا۔[4] ۳۱ر دسمبر ۱۸۵۷ء کو وہ دہلی کالج سے باقاعدہ طور پر الگ ہو گئے اور رڑکی چلے گئے وہاں انھیں جنوری ۱۸۵۸ء میں ڈھائی سو روپے ماہوار تنخواہ پر ٹامسن سول انجینئرنگ کالج (Thomason Civil Engineering College) کی نیٹیو ہیڈ ماسٹر (Native Head

---

۱۔ Treatise, page xxii
۲۔ Treatise, page xxii
۳۔ Treatise, page xxii
۴۔ S. N. Sen: Eighteen Fifty seven, page 117

(Master) مقرر کیا گیا[1] رڑکی میں چند ماہ رہنے کے بعد وہ پھر دہلی واپس آئے اور ستمبر ۱۸۵۸ء میں دہلی ڈسٹرکٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے[2] سکول میں ایک انگریز ہیڈ ماسٹر مسٹر کلارک (Clarke) کے آجانے کے بعد انھیں استاد ریاضی کی جگہ دی گئی مگر مشاہرے اور مرتبے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔[3] ۱۸۶۶ء میں ۲۲ برس تک ایک فاضل، مقبول اور مشہور معلم کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے کے بعد ۴۵ برس میں خرابی صحت کی بنا پر ریٹائر ہو گئے اور ایک سو پچیس روپے ماہوار پنشن مقرر ہوئی۔[4]

بغاوت کے سلسلے میں رام چندر نے جو رویّہ اختیار کیا وہ ان کے خیالات کا لازمی نتیجہ تھا۔ بغاوت سے پہلے انھیں عام طور پر مغرب پرست سمجھا جاتا تھا، عیسائی ہوجانے کے بعد ان کے بارے میں یہ خیال اور پختہ ہو گیا۔ رام چندر انگریزوں کے نظم ونسق کو مغلیہ نظم ونسق سے بہتر سمجھتے تھے، ان کے نزدیک اب کوئی صورت ایسی نہیں تھی جس سے زوال آمادہ ہندوستانی شہنشاہیت کو بچایا جاسکے۔ انگریزوں کے بارے میں انھیں بہت سی خوش فہمیاں تھیں۔ انگریزوں کے اقتدار کو ہندوستان کی فلاح کا ضامن سمجھ کر اُنھوں نے بغاوت سے پہلے اس کی خوبیوں کا پرچار کیا اور بغاوت کے دوران میں اس کی پوری پوری مدد کی۔ بغاوت کے بعد ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا رویّہ دیکھ کر ان کے بہت سے خیالات باطل ثابت ہوئے جس کا شاید انھیں خود بھی احساس تھا۔ انگریزوں کی مسیحیت ان کے سیاسی مفاد کی کس حد تک تابع تھی اس کا اندازہ انھیں ۱۸۵۷ء سے پہلے نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی ان کی دلی خواہش تو یہی تھی کہ حکومت مذہبی اصولوں پر عمل پیرا اور ہندوستانیوں کی بھلائی اور ترقی ہمیشہ اس کے سامنے رہے مگر حکومت کو مسیحی اصولوں پر عمل پیرا نہ پاکر انھیں بڑی مایوسی ہوئی جس کی شہادت دہلی کے فوجی گورنر کے نام ان کے خط سے ملتی ہے، جس کا سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

بغاوت کے بعد رام چندر زیادہ تر مذہبی اور تعلیمی کاموں میں مصروف رہے۔ سیاسی اور معاشی مسائل پر ان کے مضامین اس کے بعد نظر نہیں آتے، ورنہ یہ بات واضح ہوجاتی کہ نئی حکومت کی طرف ان کا کیا رویّہ تھا اور بغاوت سے پہلے ان کے ذہن میں برطانوی حکومت کے بارے میں جو خیالات تھے، وہ کس حد تک قائم رہے۔

۱۔ Treatise, page xxii

۲۔ Treatise, page xxii

۳۔ Memoirs, page 147

۴۔ Memoirs, page 163

رام چندر کی صحت تو چالیس سال کی عمر سے ہی خراب ہونے لگی تھی مگر وہ کسی نہ کسی طرح پانچ سال تک اور کام کرتے رہے تاکہ پنشن حاصل کرنے کے لیے قانونی مدت ملازمت پوری ہوجائے۔ ۱۸۶۶ء میں وہ ریٹائر ہوئے مگر اس کے بعد بھی ان کی مصروفیات میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔ تصنیف و تالیف کے مشاغل اور مناظرہ و تبلیغ کے بڑھتے ہوئے ہنگاموں کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے ہر اس کام میں تعاون اور انہماک کا اظہار کیا جسے وہ ملک کی فلاح کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ چناں چہ بغاوت کے بعد قائم ہونے والی متعدد انجمنوں میں ایک اہم اور سرگرم انجمن ''دہلی سوسائیٹی'' کے کاموں میں رام چندر نے ابتدا سے ہی بہت دل چسپی کا اظہار کیا اور جب تک دہلی میں رہے اس کی کاروائیوں اور سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔[۱]

''دہلی سوسائیٹی'' ۲۸/جولائی ۱۸۶۵ء کو قائم کی گئی تھی۔ اس کا مقصد ادبیات، تاریخ، آثار قدیمہ، علم سکہ اور ادب اور فنونِ لطیفہ کے لیے لوگوں میں ذوق و شوق پیدا کرنا اور ان کی توسیع و ترقی کے اقدامات کرنا تھا۔ سوسائیٹی کے ممتاز اراکین میں رام چندر کے علاوہ مرزا اسداللہ خاں غالب، سر سید احمد خاں، نواب علاء الدین خاں، منشی پیارے لال آشوب جیسے فاضل اور مشہور و معروف حضرات شامل تھے۔ اس کے ممبروں میں ایک بڑی تعداد سرکاری افسروں کی بھی تھی، اور حکام کا مکمل تعاون حاصل تھا، حکومت کی طرف سے مختلف تجاویز اور قوانین پر سوسائٹی کی رائے بھی طلب کی جاتی۔ جلسوں میں نہایت آزادانہ طور پر تبادلۂ خیال ہوتا اور حکومت پر تنقید کے ساتھ ساتھ قومی اصلاح کی تجاویز پیش کی جاتیں۔ انکم ٹیکس کے قوانین، ہندو قانون تبنیت، یونی ورسٹی کے قیام کی ضرورت اور بیواؤں کی تعلیم جیسے مسائل پر بڑی سنجیدہ، مفید اور دل چسپ بحثیں ہوتیں۔ جن کی مفصل رودادیں ''رسالہ دہلی سوسائیٹی'' میں نقل کی جاتی تھیں۔ سوسائیٹی نے انگریزی کتابوں کے اردو تراجم پیش کرنے کا ایک بڑا پروگرام بھی مرتب کیا تھا جس کے لیے ایک اچھا خاصا فنڈ بھی جمع کرلیا تھا۔ ''رگ وید'' اور ''ہسٹری آف امریکا'' (The History of America) کے تراجم اس کی جانب سے شائع بھی کیے گئے۔[۲]

رام چندر سوسائیٹی کے جلسوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے اور اس کی کاروائیوں میں دل

---

[۱] سجن لال: ''دہلی سوسائٹی'' نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۵۳ء، ص ۱۹ تا ۳۷

[۲] سجن لال: دہلی سوسائٹی، نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۵۳ء ص ۱۹ تا ۲۷

چسپی لیتے تھے۔ وہ سوسائیٹی کی متعدد اہم کمیٹیوں کے ممبر بھی منتخب کیے گئے تھے۔[1] سوسائیٹی کے ایک جلسے منعقدہ ۵/ جون ۱۸۶۶ء میں اُنھوں نے تعلیمِ نسواں کے بارے میں ایک مضمون پڑھا اور حکومت کی امداد سے لڑکیوں کے نارمل اسکول کے قیام اور اس میں داخل ہونے والی طالبات کے لیے وظیفے کی تجویز پیش کی۔ اس مضمون میں اُنھوں نے سوسائیٹی کے طرزِ عمل پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اسے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرنا چاہیے۔ ملک کی اصلاح و فلاح کے لیے صرف مضامین پڑھ دینا ہی کافی نہیں ان کو عمل میں لانا بھی سوسائیٹی ہی کا فرض ہے۔ اس مضمون پر خاصی بحث ہوئی، اور آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ ماسٹر صاحب کی تجویز کو مشتہر کیا جائے تاکہ جملہ شہری بھی اس سے واقف ہو جائیں۔[2]

۱۲/ نومبر ۱۸۶۷ء کے جلسے میں ایک دل چسپ بحث میں رام چندر نے حصّہ لیا۔ موضوع تھا "ترجموں کے ذریعے یورپ کے علوم پر ہم قادر ہو سکتے ہیں مگر اس قدر نہیں جو انگریزی میں ان کا مطالعہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔" اسی بحث کا یہ اقتباس سوسائیٹی کی کاروائی کی ایک جھلک اور رام چندر اور دوسرے حضرات کے طرزِ فکر کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

پادری اسمت: ان (ترجموں) کے ذریعے سے کبھی کسی ملک میں علم نے جڑ نہیں پکڑی۔

سیکریٹری پیارے لال: یہ امر شاید خلاف واقعہ ہے۔ دیکھو مسلمانوں میں جس قدر علم ہے وہ سب ترجموں کے ذریعے سے عربی زبان میں آیا۔ عربوں نے یونانی زبان کی کتابیں ترجمہ کیں اور اس امر کی شاہد یہ بات ہے کہ علم طب جو آج تک مسلمانوں اور ایشیا کی اور قوموں میں جاری ہے وہ یونانیوں کی ہی ایجاد ہے۔

پادری صاحب: ہم نے کبھی نہیں سنا کہ عربوں میں بھی کبھی کچھ علم ہوا ہے، وہ تو ایک نہایت وحشی قوم ہے ان کو علم سے کیا تعلق۔ ڈپٹی کمشنر فٹز پیٹرک: عربوں سے سکریٹری کی مراد کل مسلمان ہیں اور نہ وہ لوگ جواب عرب میں بستے ہیں۔

ماسٹر رام چندر: یونانی کتابوں کے ترجمے سے کچھ مسلمانوں ہی کو فائدہ نہیں پہنچا بلکہ کل یورپ میں علم کا چرچا ترجمے ہی کے ذریعے سے ہوا۔ مسلمانوں نے یونانیوں سے اور مسلمانوں سے یورپ والوں نے علم حاصل کیا ہے۔ جن کتابوں کا ترجمہ یونانی کتابوں سے یورپ والوں نے کیا تھا

---

[1] رسالہ دہلی سوسائٹی، نمبر ۱، ص ۱۴۲ (رضا لائبریری رام پور)

[2] رسالہ دہلی سوسائٹی نمبر ۲، (رضا لائبریری رام پور)

انھیں کتابوں کا ترجمہ عربی زبان سے فرنگیوں نے کیا اور اسی طرح یورپ میں علم پھیلا۔ پس اس امر میں سکریٹری کی رائے میری رائے سے اتفاق کرتی ہے۔"[1]

ریٹائر ہونے کے بعد ۱۸۶۶ء میں انھیں راجہ مہندر سنگھ کے اتالیق کی حیثیت سے دربار پٹیالہ میں ملازمت مل گئی۔[2] یہاں اُنھوں نے بڑی قابل قدر تعلیمی خدمات انجام دیں جنھیں حکومت پٹیالہ اور حکومت ہند دونوں نے بہت سراہا۔ جولائی ۱۸۶۸ء میں جب مہاراجہ تخت نشیں ہوئے تو انھیں ایک ہزار روپے کی جاگیر اور خلعت عطا کی گئی۔[3] ۱۳؍جون ۱۸۷۰ء کو جب پٹیالہ میں سررشتۂ تعلیم کا قیام عمل میں آیا تو رام چندر اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔[4] ان کے دور ملازمت میں یہاں تعلیم کو بہت فروغ ہوا۔ مہندر کالج میں جو ۱۸۷۰ء تک ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا اب انگریزی، فارسی، عربی، سنسکرت، ریاضی، طبیعات، جغرافیہ اور ہیئت وغیرہ کی تعلیم دی جانے لگی۔ ایک مختصر عرصے میں ۳۸ نئے اسکول قائم ہو گئے۔[5] چناں چہ کلکتہ کے دربار میں جو ۲۷؍فروری ۱۸۷۱ء کو منعقد ہوا تھا گورنر جنرل نے مہاراجہ پٹیالہ کو "ستارہ ہند" (Star of India) کا خطاب دیتے ہوئے ریاست میں تعلیم کی ترقی پر خوشی کا اظہار کیا اور رام چندر کا ذکر کرتے ہوئے اُمید ظاہر کی کہ ان کے زیرِ نگرانی تعلیم کو مزید ترقی ہوگی۔[6]

پٹیالہ سے جانے کے بعد رام چندر کی درخواست پر مہاراجہ نے ان کی پنشن مقرر کر دی۔ رام چندر کی یہ بھی خواہش تھی کہ ان کی جاگیر کی آمدنی کلکتہ کے لارڈ بشپ کو بھیجی جایا کرے تاکہ وہ غریب عیسائی، بیواؤں اور یتیموں کی امداد پر خرچ کی جاسکے۔ مگر مہاراجہ نے یہ خواہش منظور نہ کی۔[7]

رام چندر کی پہلی بیوی سیتا کا انتقال ۲۷؍فروری ۱۸۷۰ء کو ہوا۔[8] مئی ۱۸۷۱ء میں اُنھوں نے بنگال کی ایک برہمن خاتون سے شادی کی ان کی دوسری بیوی عیسائی عورتوں کی فلاح کے کاموں سے بڑی دل چسپی رکھتی تھیں اور بیواؤں کے ایک ادارے کی روح رواں بھی تھیں۔ اس کام کو

---

1. رسالہ دہلی سوسائٹی ۱۸۶۷ء، ص ۵ تا ۱۰
2. خلیفہ محمد حسین (وزیر اعظم ریاست پٹیالہ): تاریخ پٹیالہ، ص ۶۶۳
3. ایضاً ص ۶۰۱
4. خلیفہ محمد حسین (وزیر اعظم ریاست پٹیالہ) تاریخ پٹیالہ، ص ۶۴۰ تا ۶۴۲
5. ایضاً ص ۶۴۰ تا ۶۴۲
6. ایضاً ص ۶۲۳
7. Memoirs, pages 31, 32
8. Memoirs, pages 128

پھیلانے میں رام چندر نے اپنی بیوی کا بہت ساتھ دیا۔ عورتوں کی تعلیم اور نادار بچوں و عورتوں کی فلاح کا خیال تو ان کے ذہن میں مدت سے تھا، ایک ہم خیال اور باعمل خاتون کی رفاقت نے ان کی یہ تمنا بھی پوری کر دی۔ یہ ادارہ رام چندر کے انتقال کے بعد بھی چلتا رہا اور جب تک ان کی بیوی زندہ رہیں اسی میں تن من دھن سے لگی رہیں۔[1]

رام چندر کی صحت کبھی اچھی نہ تھی۔ دن رات علمی مشاغل میں کھوئے رہنے والوں کی صحت عام طور سے جیسی ہوتی ہے۔ رام چندر کی صحت اس سے بھی کہیں زیادہ خراب تھی۔ ۱۸۶۲ء میں جب کہ وہ صرف چالیس سال کے تھے انھیں خرابی صحت کی بنا پر پنشن کی درخواست دینی پڑی۔ اس کے بعد صحت رفتہ رفتہ گرتی ہی گئی اور بالآخر ۱۱ راگست ۱۸۸۰ء کو ۵۹ سال کی عمر میں انتقال کیا۔[2]

---

[1] Memoirs, page 128

[2] ملاحظہ ہو حاشیہ، ص ۴۷

تیسرا باب

اخبارات، رسائل، تالیفات

انیسویں صدی کے آغاز میں مغرب سے آنے والے انقلاب آفریں عناصر میں پریس ایک اہم عنصر تھا۔ اس نے ہندوستان میں ذہنی وفکری تبدیلیوں کی رفتار کو تیز تر کر دیا اور فکر وشعور کے سفر میں برسوں کی منزلیں دنوں میں طے ہونے لگیں۔ اس زمانے میں ملک کے مختلف حصوں سے رابطہ، بیرونی ملکوں اور وہاں کے باشندوں سے واقفیت، ملک کے طول وعرض میں علم کا فروغ اور وسیع پیمانے پر تبادلہ خیالات بہت کچھ پریس کا مرہونِ منت تھا۔ انگریزی زبان اور جدید طرزِ تعلیم سے بہرہ مند لوگوں نے دوسرے جدید وسائل کی طرح پریس سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا، اس کے ذریعے اپنے خیالات وعقاید کو ملک کے طول وعرض میں پھیلانے کی کوشش کی۔ اور اسی کی بدولت بہت جلد علمی ادبی اور صحافتی سرگرمیوں میں اتنا وقیع اضافہ ہوا جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔

دہلی میں پریس ۱۸۱۳ء میں قائم ہو چکا تھا۔[1] مگر ایک منظم تحریک کے تحت اس سے فائدہ اٹھانے کی پہلی کوشش اس وقت ہوئی جب دہلی کالج میں مسٹر بوترو (Boutros) نے کالج کے نصاب کے لیے انگریزی کتابوں کے تراجم کا کام شروع کیا۔ ڈاکٹر اشپرنگر (Sprenger) کی بدولت مطبع العلوم قائم ہونے سے دہلی کالج کی علمی سرگرمیوں میں توسیع کے امکانات پیدا ہوئے۔ ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی (Vernacular Traslation Society) اور مجمع فوائد العام کا قیام عمل میں آیا۔ کالج کے اساتذہ اور طلبا نے فوائد الناظرین، قران السعدین

---

[1] محمد عتیق صدیقی: ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) ص۔ ۲۶۵

اور محبِ ہند کے نام سے پندرہ روزہ ہفتہ وار اور ماہوار پرچے نکالے جو دہلی کالج میں جنم اپنے والی علمی تحریک کا اہم جزو تھے اور جنھوں نے جدید فکری رجحانات کو کالج کی چہار دیواری سے نکال کر دور دور تک پھیلا دیا۔ اس پوری تحریک کے سب سے اہم رکن رام چندر تھے، انھوں نے ان کے فروغ کے لیے تنہا جو کام کیا وہ شاید کسی اور سے نہ ہوسکا۔ ان کے اخبارات تراجم اور تالیفات اگر ایک طرف ان کے انفرادی ذوق وشوق کو ظاہر کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کے بین السطور میں ایک دور کی ذہنی وفکری تاریخ پڑھی جاسکتی ہے۔

(۱)

فوائد الناظرین

رام چندر کا پندرہ روزہ اخبار فوائد الناظرین ۲۳ مارچ ۱۸۴۵ء[۱] کو ''باہتمام صاحبانِ مجمع فوائد العام کے، مکان مولوی محمد باقر میں، بیچ پریس پنڈت موتی لعل پرنٹر و پبلشر دہلی اردو اخبار کے'' نکلنا شروع ہوا۔[۲] یکم نومبر ۱۸۴۸ء کے شمارے میں خود رام چندر نے اخبار کے اجرا کا مقصد واضح کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''پرچہ فوائد الناظرین کا واسطے فائدہ ان اشخاص کے جاری کیا گیا ہے کہ جو واقفیت علوم وفنون سے نہیں رکھتے ہیں۔ اور نہ ان کے لیے جنھوں نے مدرسے سرکاری میں یا کسی اور جاے علوم حکیمہ اور فنونِ مفیدہ سے واقفیت حاصل کی ہے۔ پس اب لازم ہے کہ اس پرچے میں ایسے ایسے مضامین درج کیے جائیں جو ان ناواقف آدمیوں کی سمجھ میں آجائیں۔''

رام چندر، فوائد الناظرین کے ذریعے صرف ان لوگوں سے مخاطب تھے جو پڑھے لکھے ہونے کے باوجود جدید فاسفہ وعلوم سے ناواقف تھے اور نئی ضرورتوں اور نئے معیاروں کو دیکھتے ہوئے بس حرف شناس سمجھے جاسکتے تھے۔ انگریزی زبان اور مغربی علوم سے انھوں نے نفرت کرنا سیکھی تھی اور ہر نئی شے سے دور بھاگتے تھے۔ دہلی کالج میں ہونے والی علمی اور تہذیبی سرگرمیوں سے مستفید ہونے کے لیے وہ اس کی طرح پڑھنے سے قاصر تھے اس لیے یہ چشمۂ فیض خود ہی انھیں سیراب کرنے کے لیے یہ نکلا۔ فوائد الناظرین اسی علمی اور تہذیبی سرچشمے سے نکلا ہوا ایک دھارا تھا۔ جس

---

[۱] فوائد الناظرین کی یہ جلد ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے۔

[۲] فوائد الناظرین نمبر-۱، ۲۳/ مارچ ۱۸۴۵ء

طبقے کے لیے یہ اخبار نکالا گیا تھا اس کی ضروریات اور مذاق کے پیشِ نظر لازم تھا کہ مضامین مفید ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ فہم بھی ہوں، عبارت اور انداز بیان سہل اور سادہ ہو، اور مفہوم بھی۔ ریاضی، طبیعات، جغرافیہ، تاریخ اور علم تمدن کے اعلیٰ اور دقیق مسایکسے متعلق ہونے کی بجائے علوم کے ابتدائی اور دلچسپ مسائل سے متعلق ہوتا کہ وہ لوگ جوان موضوعات سے قطعاً ناواقف تھے انھیں دلچسپی کے ساتھ پڑھیں، نھیں ان کے فوائد کا احساس ہو اور رفتہ رفتہ ان موضوعات پر اعلیٰ مطالعے کا شوق پیدا ہو۔

رام چندر کو اس بات کا احساس تھا کہ قدیم طرز کی تعلیم حاصل کرنے والے حضرات غزل سرائی اور داستان گوئی کے دل دادہ اور علم و اخلاق سے زیادہ تفریحی کتابوں کے مطالعے کی طرف مائل ہیں۔ ناظرین کا عام مذاق اور ان کے مطالعے کا مقصد رام چندر کے مذاق اور ان کی تحریروں کے مقصد سے قطعاً مختلف تھا۔ مگر ان کی خواہش یہ تھی کہ کسی نقطے پر پڑھنے والوں کا مذاق لکھنے والے کے مذاق سے ہم کنار ہو جائے۔ فوائد الناظرین کے مہتمم کے قامنے ایک طرف تو اسکے ''ناظرین'' تھے اور دوسری طرف وہ ''فوائد'' جنھیں وہ ان تک پہنچانا چاہتے تھے۔ مگر رام چندر اپنے ناظرین سے اس حد تک مفاہمت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا اصل مقصد فوت ہو جائے۔ اخبار مالی منفعت کی غرض سے نہیں نکالا گیا تھا کہ بازار کا رخ دیکھ کر اس کی نوعیت متعین کرنی پڑتی اور عام مذاق سے سمجھوتے کا خیال ذہن میں آتا۔ رام چندر اپنے اصل موضوعات ہی میں اتنی کشش پیدا کرنا چاہتے تھے کہ لوگ چندر بخو دان کی طرف متوجہ ہوں۔ اس کی ایک تدبیر تو یہ تھی کہ مضامین کی زبان گفتگو کی زبان کی طرح سادہ اور بے تکلف ہو۔ اس کے ساتھ عام دلچسپی اور واقفیت کے لیے ملکی و غیر ملکی خبریں، مشہور اشخاص کی سوانح اور اعلیٰ پائے کے شعراء کا کلام بھی پیش کیا جائے۔ بعض ناظرین کی رائے تھی کہ پرچے کو صرف طبیعات اور ریاضی کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ ابتدا میں تو رام چندر کا بھی یہی ادارہ تھا، مگر کچھ دنوں کے بعد انھیں احساس ہوا کہ اخبار کو دلچسپ اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنانے کے لیے متنوع عنوانات پر مضامین شائع کرنا ضروری ہے۔ چناں چہ یکم نومبر ۱۸۴۶ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

> ''واضح ہو کہ جب پرچہ فوائد الناظرین کا جاری ہوا تھا اس وقت اس احقر کی بھی یہی رائے تھی کہ سوائے طبیعات و ریاضیات کے اور کوئی بات پرچے مذکور میں نہ چھپے۔ چناں چہ ایسا ہی مدت تک عمل میں آیا۔ لیکن اس عرصے میں ہر طرف سے یہی فریاد سنی کہ مضامین پرچہ فوائد الناظرین کے کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔''

۸/فروری ۱۸۴۷ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

"مجھے یہ بہت خوب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کچھ حال تواریخ ہندوستان کا اور پادشاہانِ سلف کا اپنے پرچے میں درج کیا کروں۔ میری دانست میں لکھنا ایسے حالات کا ہمارے شائقینِ پرچہ کو نہایت دلچسپ اور مفید ہوگا۔ اب کے پرچے میں کچھ حال اس واسطے شاہ عالم بادشاہ ہندوستان کا، مع شبیہہ حضرتِ ممدوح کے لکھتا ہوں تا کہ ناظرین اس کے پڑھنے سے حظ وافی اور فائدہ اٹھاویں اور اس عاصی کو بدعائے خیر یاد کریں۔"

۸/مارچ ۱۸۴۷ء کو یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ کبھی کبھی پرچے میں شعرا کا کلام بھی پیش کیا جایا کرے۔ چناں چہ اس شمارے میں امام بخش صہبائی کی ایک غزل شائع ہوئی جس کا مطلع یہ تھا۔

چہ از دستِ دلِ ناکام ما رفت
کہ دل از سینۂ آرامِ ما رفت

۲۲/مارچ ۱۸۴۷ء کو بہادر شاہ ظفر کی یہ غزل شائع کی گئی۔

ڈالے ہوئے گردن جو مرا نامہ بر آیا
کیا مطلب دل یار کا معلوم کر آیا

اس طرح بعد کے شماروں میں متعدد اور معروف و غیر معروف شعرا کا کلام پیش کیا جاتا رہا۔

۲/ستمبر ۱۸۴۵ء تک فوائد الناظرین دہلی اردو اخبار کے ضمیمے کے طور پر شائع ہوتا رہا۔ ۴/اکتوبر ۱۸۴۶ء سے اخبار کے آخری صفحے پر "مجمع فوائد العام" کی جگہ رام چندر کا نام بطور مہتمم کے چھپنے لگا۔ مگر یہ تبدیلیاں محض ضابطے کی تھیں، عملی طور پر پہلے بھی رام چندر ہی اس اخبار کے مہتمم اور ذمہ دار تھے۔ انھیں کالج کے اساتذہ اور طلبا کا مکمل تعاون حاصل تھا جن کے مضامین اس میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ اشاعت میں باقاعدگی اور پابندی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ تاخیر بہت کم اور بالکل مجبوری کے عالم میں ہوتی تھی۔ اخبار ابتدا میں چار صفحے کا ہوتا تھا اور قیمت ایک آنہ فی پرچہ تھی۔ ۲۵ جنوری ۱۸۴۷ء سے اس کے صفحات دوگنے کر دیے گئے اور قیمت بھی دو آنے فی پرچہ یا چار آنے ماہ وار ہوگئی۔ صفحات کے بڑھ جانے کے بعد اخبار میں اتنی گنجائش نکل آئی کہ خبریں، غزلیں اور تصویریں بھی شائع کی جاسکیں۔ خبریں عام طور پر ایک یا زیادہ سے زیادہ دو صفحات پر چھپتی تھیں جو تعداد میں کم، متن کے اعتبار سے بہت مختصر اور عموماً دوسرے اخبارات سے ماخوذ ہوتی

تھیں۔ اصل توجہ مضامین کی طرف تھی جو بیش تر رام چندر ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ تذکرۃ الکاملین اور عجائبات روزگار کے اکثر مضامین فوائد الناظرین یا محب ہند سے ہی نقل کیے گئے تھے۔

فوائد الناظرین کے خریداروں کی تعداد بہت کم تھی۔ انگریز حکام اور چند ہم درد کئی کئی کاپیاں خرید لیتے جس سے بس اشاعت کا خرچ نکل آتا تھا۔[1] مستقل خریداروں کی بھی ایک بڑی تعداد چندہ ادا کرنے میں کوتاہی کرتی تھی جس سے اخراجات کا بار ہمیشہ قائم رہتا۔ اس کی شکایت اخبارات کے صفحات پر جابجا پائی جاتی ہے۔ پھر بھی جب تک حالات نے قطعاً مجبور نہیں کر دیا اخبار جاری رہا۔ رام چندر نے خود لکھا ہے۔

> ''...... جب حالات بدل گئے تو ہم انھیں (فوائد الناظرین اور محب ہند) کو بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چناں چہ ۱۸۵۲ء میں پندرہ روزہ پرچہ بھی پانچ سال سے کچھ اوپر جاری رہنے کے بعد بند کر دیا گیا۔''[2]

شاید رام چندر کے اس بیان کو تسلیم کرتے ہوئے مولوی عبدالحق صاحب نے بھی دونوں پرچوں کے بند ہونے کی تاریخ ۱۸۵۲ء ہی مان لی[3] مگر گارساں دتاسی کے قول کے مطابق فوائد الناظرین ۱۸۵۵ء میں بند ہوا۔[4] قاسم علی سجن لال صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے فوائد الناظرین کی ۱۸۵۴ء کی جلد سے استفادہ بھی کیا۔[5] اس سے ظاہر ہے کہ سوانح لکھتے وقت یہاں رام چندر سے سہو ہو گیا ہوگا۔

فوائد الناظرین کے اجرا کا سال بھی رام چندر نے ۱۸۴۵ء کی بجائے ۱۸۴۶ء کو مانا تھا۔ اسی لیے ۱۸۴۷ء کے شماروں پر جلد دوم چھپا ہوا نظر آتا ہے۔[6] رام چندر کے اہتمام میں یہ پرچہ بے شک اکتوبر ۱۸۴۶ء ہی میں نکلنا شروع ہوا مگر اس کا آغاز مارچ ۱۸۴۵ء میں ہو چکا تھا۔ ان ابتدائی پرچوں پر جو کہ دہلی اردو اخبار کے ضمیمے کے طور پر نکلے تھے صرف ''نمبر'' چھپے ہوئے ہیں ''جلد'' کا ذکر نہیں ہے۔ اس لیے شاید فوائد الناظرین کے ۲۳ / مارچ ۱۸۴۵ء سے ۴ / اکتوبر ۱۸۴۶ء تک

---

1. Treatise, page viii
2. ایضاً ایضاً
3. مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۱
4. خطبات گارساں دتاسی ص ۱۸۳
5. دہلی کالج میگزین۔ قدیم دہلی کالج نمبر ۱۹۵۳ء، ص ۶۲
6. یہ شمارے بھی ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن میں محفوظ ہیں۔

کے شماروں کو دہلی اردو اخبار کی جلدوں ہی میں شامل کیا گیا ہو۔ فوائد الناظرین کے صفحات پر اہم اور دلچسپ مقامی، ملکی اور غیر ملکی خبریں جا بجا نظر آتی ہیں۔ مرزا غالب کی گرفتاری[1] مہاراجہ دلیپ سنگھ کی شکست اور پنجاب سے ان کا کوچ[2] مرزا شاہ رخ بہادر کا انتقال[3] یورپ میں شخصی حکومتوں کے خلاف برپا ہونے والے انقلابات[4] اور اس قسم کی متعدد اطلاعات فوائد الناظرین میں محفوظ ہیں۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کی آبادی سے متعلق دل چسپ اعداد و شمار اور انگلستان کی پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے بجٹ بھی کئی شماروں میں دیکھے جا سکتے ہیں[5]

خیر خواہ یا محبِ ہند

ستمبر ۱۸۴۷ء میں رام چندر نے ایک ماہوار رسالہ خیر خواہِ ہند کے نام سے شائع کیا۔ اکتوبر تک یہ رسالہ اسی نام سے نکلتا رہا مگر نومبر ۱۸۴۷ء سے اس کا نام بدل کر محبِ ہند رکھ دیا گیا۔ اس سلسلے میں فوائد الناظرین ۱۸/اکتوبر ۱۸۴۷ء کے شمارے میں بعنوان ''تبدیلی نام رسالہ خیر خواہِ ہند کی'' رام چندر نے یہ سطور لکھی تھیں:

> ''چوں کہ ہم کو اس امر کی بالکل اطلاع نہ تھی کہ کوئی اخبار خیر خواہِ ہند ہندوستان میں اجرا ہوتا ہے تو اس واسطے ہم نے اپنے رسالے کا نام خیر خواہِ ہند رکھا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ ایک اخبار مسمیٰ خیر خواہِ ہند مرزا پور میں جاری ہوتا ہے تو ہم کو مناسب نہیں ہے کہ ہم اپنے رسالے کا نام بھی خیر خواہِ ہند رکھیں۔ اس واسطے ہم نے نام اس رسالے کا تبدیل کیا اور بجائے خیر خواہِ ہند کے محبِ ہند رکھا۔ واسطے اطلاع کے اس کے خریداروں کی خدمت میں گذارش کی۔ فقط''

اس کے بارے میں قاسم سجن لال صاحب فرماتے ہیں۔

''رام چندر کا خیر خواہِ ہند صرف ستمبر میں نکلا اور اکتوبر ۱۸۴۷ء سے اس

---

۱ فوائد الناظرین نمبر دہم، جلد دو، ۳۱/مئی ۱۸۴۷ء بعنوان ''خبر دہلی''

۲ ایضاً نمبر پنجم، جلد پنجم، ۴/مارچ ۱۸۵۰ء

۳ ایضاً نمبر ششم، جلد دوم، ۵/اپریل ۱۸۴۷ء

۴ ایضاً نمبر دہم، جلد سوم، ۱۵/مئی ۱۸۴۸ء

۵ ایضاً نمبر چہارم، جلد پنجم، ۱۸/فروری ۱۸۵۰ء

پرچے کا نام محبِ ہند ہوگیا۔"[1]

محمد عتیق صدیقی صاحب نے بھی انڈیا آفس کی فہرست کے اس نوٹ کی تردید کی ہے کہ "اس رسالے کے پہلے دو نمبر خیرِ ہند[2] کے نام سے نکلے" ان کا خیال ہے کہ "پہلے دو نمبر نہیں بلکہ پہلا ہی نمبر خیر خواہِ ہند کے نام سے نکلا اور دوسرے ہی نمبر سے اس کا نام محبِ ہند ہوگیا۔"[3]

مگر دونوں حضرات کا یہ خیال صحیح نہیں۔ اس سلسلے میں خود رام چندر نے یہ بات صاف کردی تھی کہ:

"ماہِ اکتوبر کا خیر خواہِ ہند، جس کا اب نام محبِ ہند تجویز ہوا ہے، اجرا ہوا"

"ماہ اکتوبر کے خیر خواہِ ہند" کے بارے میں رسالہ ہندوستانی (جنوری ۱۹۳۳ء) میں اظہار الحسن صاحب کا مضمون دیکھنے کے بعد یہ بات اور واضح ہوجاتی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے خیر خواہِ ہند کے اکتوبر، ۱۸۴۷ء کے شمارے کا مفصل ذکر کیا ہے جو انھیں کہیں سے حاصل ہوا تھا۔ مضمون نگار نے سرورق کی نقل اور مندرجات کی فہرست پیش کرنے کے علاوہ اکتوبر کے شمارے پر مفصل تبصرہ بھی کیا ہے۔ خیر خواہِ ہند، اکتوبر ۱۸۴۷ء کے مندرجات یہ ہیں۔[4]

۱۔ نقشہ شہر دہلی از طرف دریائے چمن

۲۔ تاریخ ملک اودھ مع تصاویر شجاع الدولہ و آصف الدولہ

۳۔ تربیت اہل ہند کے باب میں

۴۔ بیان سادھوؤں کے طریقے کا

۵۔ ہیئت۔ بیان ستاروں کا (مضمون میں نقشے اور شکلیں بھی شامل ہیں)

۶۔ قصیدہ ذوق۔ سیر آرائے گردوں جب تلک سلطان خاور ہوا لخ۔

اس کے بعد اس میں شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ محبِ ہند ستمبر اور اکتوبر ۱۸۴۷ء میں خیر خواہِ ہند کے نام سے نکلا، اور نومبر میں یہ نام بدل دیا گیا۔ رسالہ ہندوستانی میں شائع شدہ مندرجہ بالا مضمون کا تراشہ راقم الحروف کو قاسم علی سجن لال صاحب ہی کی عنایت سے ملا، ممکن ہے کہ یہ ان

۱۔ دہلی کالج میگزین، قدیم دہلی کالج نمبر، سنہ ۱۸۵۳ء، ص ۶۶۔

۲۔ خیر خواہ ہند۔

۳۔ محمد عتیق صدیقی۔ ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) ص ۳۴۴

۴۔ فوائد الناظرین (نمبر بیسواں جلد دوم) ۱۸/ اکتوبر ۱۸۴۷ء میں خیر خواہ ہند ماہ اکتوبر کے مضامین کی فہرست میں ہے۔

کے مضمون کی اشاعت کے بعد انھیں حاصل ہوا ہو یا مضمون لکھتے وقت کہیں کاغذات میں دوبارہ گیا ہو۔ میں اس عنایت کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔

اظہار الحسن صاحب نے خیر خواہِ ہند کے جس پرچے کے سرورق کی نقل شائع کی ہے اس پر نمبر اوّل اور جلد دوم بھی چھپا ہوا ہے، اس سے انھوں نے قیاس یہ کیا کہ جلد اوّل ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی ہوگی[1] مگر ستمبر ۱۸۴۷ء کے فوائد الناظرین میں شائع شدہ اشتہار کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس میں یہ شبہ باقی نہیں رہتا کہ خیر خواہِ ہند کا اجرا پہلی ستمبر ۱۸۴۷ء ہی کو ہوا۔

> ''سابق میں جو ہم نے لکھا تھا کہ ایک رسالہ مسمّی خیر خواہ ہند ماہ میں ایک بار بزبانِ اردو اس عاصی کے اہتمام سے عنقریب اجرا ہوگا۔ اب وہ عنایت ایزدی سے بتاریخ اوّل ستمبر ۱۸۴۷ء کو جاری ہو گیا۔''

یکم اپریل ۱۸۴۷ء کے شمارے پر جلد ''ہشتم'' لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تاریخ تک محبِ ہند کے اجرا کو سات سال نہیں، سات ماہ گزرے تھے اور اس لحاظ سے یہ آٹھویں ماہ کا آٹھواں شمارہ تھا۔ دراصل رام چندر نے سال بھر کے شماروں کو ایک جلد تصور کرنے کی بجائے ہر ماہانہ شمارے کو ایک علاحدہ جلد مانا تھا۔ چناں چہ اکتوبر ۱۸۴۷ء کے خیر خواہ ہند میں بھی جس سے انھیں سنِ طباعت کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ''جلد'' تھی۔

پہلے شمارے کے اشتہار میں ''اہل دانش وبینش'' کی قدر دانی کے ذکر کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:

> ''انشاء اللہ تعالیٰ اس میں مضامین مدام ایسے چھپیں گے جو کہ خلقت ہند کو مفید ہوں گے۔ تواریخ ہر دیار کی مثل ہندوستان، فرنگستان، ایران، ترکستان اور افغانستان وغیرہ کے اور مضمونِ ہند و نصائح درج ہوں گے اور باتیں علم الاخلاق اور علم طبیعی اور ہیئت کی مفصل بیان کی جائیں گی، تاکہ وہ ہر ایک شخص کی فہمید میں آسکیں، اور حال پارلیمنٹ کا اور تجویزیں وصلاحیں حکام انگلستان کی اور عجیب وغریب حالات اور اشعار آب دار بڑے بڑے استادوں کے حتی المقدور مع تصویرات ان کی لکھے جائیں گے اور اس رسالے میں تصویرات بادشاہوں کی اور نقشہ جات مکانات وغیرہ کے جہاں کہیں تصویر ضروری ہوگی مندرج ہوں گے۔''[2]

---

[1] ہندوستانی الٰہ آباد جنوری سنہ ۱۹۳۳ء، تمہ۔ ص ۸۴

[2] فوائد الناظرین نمبر سترواں جلد دوم۔ ۶ ستمبر ۱۸۴۷ء

چناں چہ مقاصد کے اعتبار سے محبِ ہند اور فوائد الناظرین میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جس لحاظ سے یہ فوائد الناظرین اور دوسرے اخبارات سے ممتاز تھا اسے خود رام چندر واضح کرتے ہیں۔

"صاحبان علم دوست پر واضح ہو کہ یہ رسالہ مثل اور پرچہ اخبارات کے نہ ہوگا کہ بعد دیکھنے چیزوں کے وہ کچھ کام کا نہیں رہتا بلکہ یہ ایک مثال نایاب کتاب کے ہوگا۔"

محبِ ہند کم و بیش پچاس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور چندہ ایک روپیہ ماہوار تھا۔ سرورق پر رسالے کا نام، مہتمم کا نام، قیمت، تاریخ، شمارے اور جلد کے نمبر اور اردو اور انگریزی میں فہرست مضامین چھپی ہوئی تھی۔ مضامین کے ساتھ متعلقہ تصاویر اشکال اور نقشے بھی شامل کیے جاتے تھے۔ سوانح، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، طبیعات سے متعلق مضامین کے علاوہ ناظرین کی دلچسپی کے لیے شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ محبِ ہند بھی ان ہی حالات میں بند ہوگیا، جن میں فوائد الناظرین کو بند ہونا پڑا تھا۔

رام چند نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اپنے حلقے کی طرف سے شائع ہونے والے ایک اور ماہوار پرچے کا ذکر کیا ہے جو فوائد الناظرین سے پہلے نکلا۔

"ہم اسپیکٹیٹر کے ڈھنگ پر کام شروع کرنے کا بھی حوصلہ رکھتے تھے پہلے ہم نے ایک ماہوار اور پھر ایک پندرہ پرچہ فوائد الناظرین چار آنے کی قلیل قیمت پر جاری کیا۔"[1]

کچھ آگے چل کر لکھا ہے۔

"اس کے بعد پندرہ روزہ رسالے کے ساتھ ساتھ ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جو محبِ ہند کہلاتا تھا۔"[2]

ظاہر ہے کہ پہلا ماہنامہ محبِ ہند نہیں تھا چوں کہ رام چندر نے اس کا نام نہیں بتایا اس لیے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہاں ان کی یادداشت نے۔ کام نہ کیا ہو اور وہ ایک ہی ماہوار پرچے کے بارے میں دو بار لکھ گئے ہوں۔ پہلی عبارت کو پڑھنے سے یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ شاید فوائد الناظرین ہی پہلے ماہوار نکلتا ہو مگر یہ اس لیے صحیح نہیں کہ فوائد الناظرین ابتدا سے ہی مہینے میں دو بار نکلتا تھا، جس کی

---

1. Treatise, page xvi
2. Treatise, page xviii

شہادت خود اس کی پہلی جلد (۱۸۴۵ء) ہے۔ بہر حال یہ بات تحقیق طلب ہے کہ یہ کون سا رسالہ تھا۔ ابھی تک کسی ایسے ماہوار رسالے کا پتہ نہیں چل سکا جو مجمع فوائد العام یا رام چندر نے فوائد الناظرین سے پہلے نکلا ہو۔

۱۸۶۷ء میں ایک تبلیغی پرچہ ریورینڈ تاراچند کی ادارت میں ''مواعظ عقبیٰ'' کے نام سے جاری ہوا تھا۔[1] Memories سے پتہ چلتا ہے کہ اس اخبار میں رام چندر کے مذہبی مضامین شائع ہوا کرتے تھے اس کے انتظام و اہتمام میں بھی رام چندر کو ابتدا سے ہی دخل تھا۔ چناں چہ انھوں نے ۶/ستمبر ۱۸۶۷ء کو سر ولیم میور (Sir William Muir) سے ایک خط کے ذریعے ''مواعظ عقبیٰ'' کو متعارف کراتے ہوئے امداد و اعانت کی درخواست کی تھی۔ اس اخبار کا دار و مدار بھی خریداروں کی بجائے چندہ دینے والوں پر تھا۔ رام چندر خوش تھے کہ اس اخبار کی بدولت مولوی صاحبان اپنی غفلت سے چونکے اور انھوں نے ان کا جواب دینے کے لیے اشرف الاخبار کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا۔ ''مواعظ عقبیٰ'' میں شائع ہونے والے رام چندر کے ایک مضمون کی بنا پر اس اخبار نے انھیں دیوانہ اور بے وقوف بھی لکھا تھا۔ مگر رام چندر اسی بات پر مطمئن تھے کہ ان کے پرچے کی بدولت مولوی صاحبان نے بھی ان کے اعتراضات پر توجہ کی۔[2]

(۲)

عجائبات روزگار

طبیعات اور ریاضی سے متعلق رام چندر کی کتابیں زمانہ طالب علمی ہی سے شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ فوائد الناظرین کے شائع ہونے کے بعد وہ سماجی، سیاسی اور اخلاقی موضعات پر بھی مضامین لکھنے لگے مگر ان پر باقاعدہ کتاب ۱۸۴۷ء میں عجائباتِ روزگار کے نام سے شائع ہوئی۔

عجائباتِ روزگار کا پہلا اڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔ فوائد الناظرین کے صفحات پر اس کا اشتہار پہلی بار ۲۲/مارچ ۱۸۴۷ء کے شمارے میں نکلا۔ ۱۲ جولائی ۱۸۴۷ء کے فوائد الناظرین میں کتاب کے مکمل ہونے کا اعلان کیا گیا اور بتایا گیا کہ چند نسخے چھپارہ گئے ہیں جو عنقریب تیار ہو جائیں گے۔ ۶/ستمبر ۱۸۴۷ء کو یہ خبر آئی کہ کتاب چھپ کر متعدد خریداروں کے پاس پہنچ چکی ہے مگر چوں

---

[1] خطباتِ گارساں دتاسی، ص ۴۷۹

[2] Memoirs, pages 125-127 (Footnotes)

کہ بہت سے خریدار باقی رہ گئے تھے اس لیے دوسرا ایڈیشن بھی چھپنا شروع ہوگیا۔ ۲۱ رفروری ۱۸۴۸ء کے شمارے میں دوسرے اڈیشن کے چھپ جانے کی اطلاع دی گئی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپے ہوئے ۱۸۷۳ء کے ایڈیشن کے خاتمۃ الطبع کے مطابق ''کتاب عجائبات روزگار مولفہ ماسٹر رام چندر صاحب قدر دانی شائقان سے چوتھی مرتبہ چھاپی گئی'' مگر اس ایڈیشن کے سرورق پر چھپی ہوئی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ''عجائبات روزگار ۱۸۴۷ء میں اوّل دفعہ طبع ہوئی'' پھر ''بعد نظر ثانی کے با تصورات شہر لکھنؤ سے ۱۸۷۲ء میں چھپی تھی اب پھر ماہ اکتوبر ۱۸۷۳ء مطبع نول کشور میں طبع ہوئی'' اس عبارت سے ۱۸۴۸ء والے ایڈیشن کا پتا نہیں چلتا مگر فوائد الناظرین ۲۱ رفروری ۱۸۴۸ء کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کتاب کے اس دوسرے ایڈیشن اور اسکے سنِ طباعت کا بھی صحیح علم ہو جاتا ہے۔

چند ماہ کے اندر کسی کتاب کا دوبار شائع ہونا آج بھی غیر معمولی بات سمجھی جاتی ہے مگر اس زمانے میں جب کہ ناظرین کا حلقہ آج کے مقابلے میں بہت محدود تھا یہ بات حیرت انگیز تھی۔ دراصل عجائبات روزگار کے مضامین کی نوعیت ہی اس کی مقبولیت کی ضامن تھی۔ اس کتاب میں نصیحت آموز اور تاریخی و غریب جانوروں اور درختوں سے متعلق معلومات کو یک جا کر دیا گیا تھا۔ جن سے اردو داں طبقہ عام طور پر ناواقف تھا۔

عجائباتِ روزگار کا پہلا باب ''بیچ بیان عجائب وغرائب چیزوں کے'' تھا۔ اس میں آتشی پہاڑوں، ملک مصر کے میناروں اور روضہ ممتاز محل سے لے کر ''اشکال مختلف حالاتِ انسانی'' اور ''بیان جانور ویل'' اور ''جانور کونگرو'' اور پھر خوردبین تک کا حال شامل تھا۔

دوسرا باب ''مضامین پند آگیں'' پر مشتمل تھا۔ اس میں قناعت، عبادت، سخاوت، سستی، غرور، حسد، صبر، اعتدال کے فوائد اور ''ناحق توقع باندھنے کے نقصان'' کے ساتھ ساتھ ''بے انتہا ہونا عالم کا اور بیان قدرت اللہ تعالیٰ کا'' بھی درج تھا۔

تیسرے باب کا عنوان تھا ''مختلف حالات تواریخ ہند جو قابل جاننے کے ہیں'' مگر اس ضمن میں اکبر، شاہ عالم، ٹیپو سلطان کے ساتھ سکندر اور نپولین پر بھی مضامین شامل تھے۔ اس کے بعد ایک تتمہ بھی تھا جس میں تار برقی سے متعلق ایک مضمون اور ''نقشہ جہاز جنگی انگلستان کا'' پیش کیا گیا تھا۔ ۱۷۰ صفحات کی یہ کتاب ۴۷ مضامین پر مشتمل اور جا بجا تصویروں، شکلوں اور خاکوں سے مزین تھی اس کی قیمت دو روپے رکھی گئی تھی۔

عجائباتِ روزگار میں رام چندر کا تجزیاتی طرز فکر اور ان کا نقطہ نظر واضح نظر آتا ہے۔ انگلستان اور

وہاں کے باشندوں کے قائل ہونے کے باوجود وہ ترقی کو انگلستان پر ختم نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک وہاں کی ترقی چند اسباب کا نتیجہ تھی۔ اگر وہ اسباب دوسری قوموں میں بھی پیدا ہو جائیں تو وہ بھی مختلف شعبہ ہائے زندگی میں انگلستان والوں کے بالمقابل آسکتی ہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''یہ بھی ناظرین پر منکشف ہونا چاہیے کہ علم اور عقل کے زور سے کیا کیا انسان کرسکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے کچھ انگریزوں کو ہی طاقت بخشی ہے کہ یہ سبب فضیلت کے کیا کیا کام کرتے ہیں اور کچھ انگریزوں ہی پر یہ مدار نہیں ہے بلکہ جو شخص علوم اور فنون پر بخوبی توجہ کرے گا وہی بہرۂ وافی اٹھاوے گا۔''[1]

رام چندر کی تمام تحریروں کی طرح عجائباتِ روزگار کا طرۂ امیاز بھی اس کی زبان، پیرایۂ بیان اور موضوع ہے۔ زبان و بیان کا قابل فہم اور موضوع کا مفید ہونا مصنف کے ذہن میں اس قدر رچ بس گیا تھا کہ کسی مقام پر بھی ان اصولوں سے انحراف نظر نہیں آتا۔ اخلاقی موضوعات سے متعلق لکھنے والے عموماً شعوری یا غیر شعوری طور پر ناصحانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ رام چندر کی تحریریں اس خامی سے مبرا تھیں۔ انھوں نے اخلاقی مسائل پر ہمیشہ مفکرانہ انداز میں قلم اٹھایا اور گناہ و ثواب کے نقطۂ نظر سے سوچنے کی بجائے ان پر علم و عقل کے تقاضوں کے مطابق غور کیا۔ اس لیے ان کے ''پند آگین مضامین'' بھی خوف عاقبت کے غماز ہونے سے زیادہ کامیابی زیست کی تمنا کے آئینہ دار ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو بڑے معقول دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جن میں عقیدے کی بجائے عقل کا عنصر پایا جاتا ہے۔ یہ تحریریں اتنی نصیحت آموز نہیں جتنی کہ بصیرت افروز ہیں۔ ان کی اس خصوصیت کی ایک اعلیٰ مثال ذیل کے سطور میں ملتی ہے:

> ''عقل، جو انسان میں پائی جاتی ہے وہ مانند ایک پتھر سنگ مرمر کے جو کان میں مٹی سے آلودہ دبا ہوا ہے اور تربیت، مانند اس کاری گر کے ہے کہ جو پتھر کو نکال کر صاف اور درست کیا کرتا ہے۔ جب تک سنگ مرمر کو کاری گر مذکور کان میں سے نکال کر صاف نہیں کرتا ہے تب تک خوبصورتی اور رونق سنگ مرمر کی کہاں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طور سے جب تک آدمی کو تربیت نہیں ہوتی اس وقت تک عقل اور صفات جبلی جو اللہ تعالیٰ نے اسے

---

[1] عجائبات روزگار، ص ۹

بخشے ہیں ظاہر نہیں ہوتے ہیں ممکن ہیکہ ہزار ہا گنوار اور دیہاتی ایسے گزرے ہوں کہ ان کو خدائے تعالیٰ نے اس قدر ذہن اور عقل بخشی ہو جیسی کہ حکیم ارسطو کو حاصل تھی۔ اب کوئی پوچھے کہ کیوں حکیم ارسطو کو حاصل تھی۔ اب کوئی پوچھے کہ کیوں حکیم ارسطو نامی حکیم ہوا اور گنوار مذکور حالتِ جہالت ہی میں مرگئے اور نام ونشان بھی نہیں رہا۔ اس کا جواب فقط یہ ہے کہ ارسطو کو تربیت ہوئی تھی اور ان کو نہیں ہوئی۔ ارسطو نے کتب اور تصنیفاتِ حکمائے گذشتہ کو ملاحظہ کیا اور گنوار مذکور کشت کاری کرتے کرتے مرگئے۔ اگر مانند ارسطو کے ان کو بھی قابو واسطے تحصیل کتب کے ہوتا تو شاید وہ گنوار ارسطو سے بھی سبقت لے جائے۔ ایک شاعر نے سچ کہا ہے کہ گنواروں اور غریبوں کے ذہن اور عقل سے کون آگاہ ہوتا ہے۔ وہ مانند ان جواہرات کے ہیں جو اندر سمندر کے پڑے ہوئے ہیں اور انسان کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں یا وہ مانند ان خوشبو دار کو کون سونگتا ہے۔ تربیت ایک ایسی شے ہے کہ ورثے میں نہیں حاصل ہوتی ہے یعنی یہ بات غیر ممکن ہے کہ اگر باپ تربیت یافتہ ہو تو بالضرور اس کا بیٹا بھی تربیت یافتہ ہو۔ یہاں سے یہ بات ہر انسان پر فرض ہے کہ اچھی تربیت پانے میں کوشش بلیغ کرے اور اس میں تغافل اور کاہلی کو جانے نہ دے۔''[1]

تذکرۃ الکاملین

۷؍اگست ۱۸۴۸ء کے فوائد الناظرین اور ۲۲؍اگست ۱۸۴۸ء کے قران السعدین میں ''اشتہار ایک مفید اور عجیب کتاب کا'' شائع ہوا کتاب کا نام شاید اس وقت تک طے نہیں ہوا تھا اس لیے اشتہار میں کتاب کی نوعیت مفصل طور پر بیان کی گئی تھی۔ فوائد الناظرین کے اس شمارے میں قران السعدین، دہلی اردو اخبار، فوائد الشائقین، اخبار الحقائق، سید الاخبار اور شملہ اخبار کے مہتمموں سے بھی التماس کیا گیا تھا کہ وہ اس کتاب کا اشتہار شائع کردیں۔

یہی کتاب تذکرۃ الکاملین کے نام سے ''ستمبر ۱۸۴۹ء میں مقام دہلی مطلع العلوم (مطبع العلوم) میں بحالت ملازمی سرکارِ انگلشیہ بعہدہ مدرسی علوم انگریزی مخصوص واسطے پیش کرنے سرچارلس مشکاف صاحب بہادر بارونٹ کے اور نیز بخیال اس کے کہ جو باشندے ہندوستان کے زبان فرنگستان سے

[1] عجائبات روزگار، ص ۸۶-۸۵

ناواقف ہیں'' انھیں '' کچھ حالات، مسائل وغیرہ فاضلوں و کاملانِ یونان و روم قدیم اور فرنگستان اور ممالک مشرقی'' سے واقفیت بہم پہنچانے کی غرض سے مرتب ہوئی اور سر مٹکاف (Sir Metcalfe) کے نام معنوں کی گئی[1] اگست ۱۸۷۷ء میں جب کہ رام چندر ریاست پٹیالہ میں سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے، تذکرۃ الکاملین کا تیسرا ایڈیشن مطبع نول کشور لکھنو سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن مہا مہندر سنگھ مہندر والی پٹیالہ کی خواہش پر ''بعد منظوریِ اجلاس خاص'' مدارس میں رائج کرنے کے لیے چھاپا گیا تھا۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن جو ۱۸۴۹ء میں چھپا تھا، رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ دوسرا ایڈیشن راقم الحروف کو حاصل نہیں ہوا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کب اور کہاں سے شائع ہوا تھا۔ تیسرا ایڈیشن (۱۸۷۷ء) متعدد کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس میں رام چندر کا ایک انگریزی خط اور اس کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے جو انھوں نے یکم اکتوبر ۱۸۴۹ء کو سر مٹکاف (Sir Metcalf) کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں کتاب کی اشاعت کا مقصد بیان کیا گیا ہے اور ہندوستان میں ترقی علوم سے سر مٹکاف (Sir Metcalfe) کی دلچسپی کے پیش نظر تذکرۃ الکاملین کو ان کے نام معنون کیا گیا ہے۔

تذکرۃ الکاملین میں ۹۷ مضامین شامل ہیں۔ ۸۸ سوانح پر ہیں بقیہ مضامین میں یونان، روم، فرنگستان اور ہندوستان کے مختصر حالات اور علوم و فنون میں ان کے عروج و زوال کی مختصر داستان پیش کی گئی ہے۔ کتاب میں صفحات کی کل تعداد دو سو اور قیمت ڈھائی روپے رکھی گئی ہے۔

مصنف نے ریاضی دانوں، ہیئت دانوں اور ماہرین طبیعات کے حالات پر شاعروں اور بادشاہوں سے زیادہ توجہ دی۔ بادشاہوں کے حالات میں زور علم پروری، انصاف پسندی، رحمت دلی اور دلیری پر ہے۔ اور صرف ان ہی بادشاہوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ان خصوصیات کی بنا پر مشہور ہیں۔ فلسفیوں کے ذکر میں ان کے افکار اور اعمال دونوں کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو تذکرۃ الکاملین میں اہل کمال کی سوانح سے زیادہ ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان کی زندگی کے صرف ایسے ہی واقعات کو نقل کیا گیا ہے جن سے ان کے کارناموں کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ مگر ناظرین کی دلچسپی کو بھی قطعاً نظر انداز نہیں کیا گیا۔ بعض مضامین میں سب واقعات کا ذکر مختصراً کر دیا گیا ہے۔ بعض میں کسی ایک ہی اہم پہلو یا واقعے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسری باتوں کا ذکر یا تو برائے نام ہے یا بالکل نہیں۔ مثلاً اقلیدس کے حال میں یہ بتایا گیا ہے کہ اہل روم اور اہل اسلام تک اس کے کارنامے کس طرح پہنچے اور کس کس نے اس کے حل کے ہوئے مسائل کی تفسیر لکھی۔

---

[1] تذکرۃ الکاملین، ص ۱

مضامین کے ساتھ ساتھ اشخاص کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ عبارت کو دلچسپ بنانے کے لیے کہیں کہیں اشعار، لطائف اور دلچسپ واقعات سے کام لیا تو گیا ہے، مگر بہت کم۔ سائنس دانوں سے متعلق مضامین سوانح نگاری کا اچھا نمونہ ہیں۔ شخصیات سے عقیدت ہونے کے باوجود رام چندر اس کی رو میں بہ جانے سے بچ گئے ہیں۔ کسی بھی شخصیت کو انھوں نے پراسرار بنا کر پیش نہیں کیا۔ ناظرین کو مرعوب یا محظوظ کرنے کے لیے انشاپردازی کے جوہر دکھانے پر زیادہ محنت نہیں کی گئی ہے۔ کہیں کہیں مبالغے کی آمیزش ضرور مل جاتی ہے مثلاً انگلستان کے ایک مشہور فلسفی لوک (Locke) کے بارے میں ان کا یہ خیال کہ ''اس کی عقل اور ذہن کو ارسطو اور افلاطون بھی نہیں پہنچ سکے'' شاید بہت زیادہ صحیح نہیں مگر رام چندر یونانی فلسفیوں پر یورپی مفکروں کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے اسے مبالغے سے زیادہ خود ان کا نقطۂ نظر سمجھنا چاہیے۔

رام چندر سائنس سے بے پناہ دلچسپی رکھتے تھے اس لیے سائنس دانوں پر انھوں نے جو مضامین لکھے وہ دوسرے مضامین سے بہتر ہیں۔ کتاب کو پڑھتے وقت کہیں کہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ماہرین سائنس کے علاوہ بعض شخصیات کا ذکر محض تذکرے کو مکمل کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ مصنف نے مضامین کے لیے مواد حاصل کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور ہر لکھی ہوئی بات یا ہر پرانی روایت کو بغیر سوچے سمجھے تسلیم نہیں کرلیا۔ جہاں تحقیق نہ ہوسکی وہاں مواد کو قیاس اور عقل کے معیاروں پر پرکھنے کے بعد خامہ فرسائی کی ہے۔ ''حال لقمان الحکیم'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> ''......حقیقت یہ ہے کہ اکثر کتب انگریزی کو جو مطالعہ کیا اس میں یہی پایا کہ تاریخ پیدائش، وفات اور جائے مقام اس حکیم فاضل کی بالکل تحقیق معلوم نہیں۔ اور بعض کتب فارسی میں جو دیکھا تو اس حکیم کے حالات میں مبالغہ بہت پایا جس پر راقم کو اچھی طرح اعتبار نہیں آیا اور پھر بھی لطف یہ ہے کہ کوئی تاریخ کسی باب میں درباب فاضل کے نہیں لکھی۔''[1]

اس میں شک نہیں کہ رام چندر کے نقطۂ نظر کا جتنا واضح اظہار عجائب روزگار میں ہے اتنا تذکرۃ الکاملین میں نہیں ملتا۔ مگر تذکرۃ الکاملین میں مصنف کی توجہ سوانح پر زیادہ تھی اور ایک اچھے سوانح نگار کی طرح انھیں نے بھی خود اپنے معیاروں کے مطابق شخصیات اور ان کے کارناموں کا تجزیہ تو کیا مگر ان کے قد وقامت کو اپنے پیمانوں کے مطابق بڑھایا یا گھٹایا نہیں۔ سوانح میں مصنف کے

---

[1] تذکرۃ الکاملین، ص ۹۳

لیے ذاتی نظریات کے واضح اظہار کی گنجائش زیادہ نہیں ہوئی، مگر اشخاص کے انتخاب، ان کی زندگی کے واقعات اور کارناموں کے انتخاب اور ان کی قدر و قیمت کی جانچ پرکھ سے بالواسطہ طور پر مصنف کے ذہنی رجحان کا پتا ضرور لگایا جاسکتا ہے۔ چناں چہ تذکرۃ الکاملین کے ذریعے رام چندر کے افکار و نظریات کا پتا لگانا بھی مشکل نہیں۔ ''اسحاق نیوٹن'' پر ان کا مضمون سوانح نگاری کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

تذکرۃ الکاملین اس زمانے کی کتابوں میں ایک اہم اضافہ تھی۔ جس وقت ہندوستان میں تذکرے صرف شاعروں کے اور سوانح مذہبی بزرگوں یا بادشاہوں کی لکھی جاتی تھی، ماہرین سائنس کے کارناموں کو بادشاہوں کی فتوحات قابلِ قدر بات ہے۔ عجائباتِ روزگار کی طرح تذکرۃ الکاملین بھی اپنے ذخیرہ معلومات کی بنا پر مقبول ہوئی اور ملک کے ہر گوشے میں پہنچی۔

بھوت نہنگ

گارساں دتاسی کے ۲؍دسمبر سنہ ۱۸۵۵ء کے خطبے سے رام چندر کی ایک اور کتاب ''بھوت نہنگ'' کا بھی پتہ چلتا ہے۔

> ''مجھے آپ کے سامنے .... رام چندر کے رسالے بھوت نہنگ کا تذکرہ بھی کرنا چاہیے۔ ...... اس کتاب کا مقصد ہندوستانیوں کو بھوت پریت پر عقیدہ رکھنے سے باز رکھنا ہے۔ یعنی دراں حالی کہ یورپ میں لوگ اس قسم کی ارواح سے حقیقی تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں، ہندو لوگ یورپین اور عیسائی خیالات سے متاثر ہو کر اپنے ہم وطنوں کو ان پر عقیدہ رکھنے سے روکنے کی حتی الواسع کوشش کرتے ہیں۔''[1]

لیکن یہ کتاب راقم الحروف کو حاصل نہیں ہوسکی۔

اصول گورنمنٹ کے

یہ کتاب سر. جی. نورٹن (G. Norton) [2] کے انگریزی لکچروں کا ترجمہ ہے جو رام چندر اور

---

[1] خطباتِ گارساں دتاسی، ص ۱۸۷

[2] سابق جج سپریم کورٹ مدراس

پتمبر[1] نے مولوی سید محمد (مدرس دوم شعبہ فارسی) کی اصلاح سے مرتب کیا اور پنڈت موتی لعل نے دہلی اردو اخبار پریس شائع کرایا۔ کتاب کی اتالیف کے وقت دونوں مترجمین کالج کے سینیر اسکالر تھے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ کتاب میں ۱۵۱ صفحات اور پانچ ابواب ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

پہلا باب — عام اصول گورنمنٹ

دوسرا باب — اصول گورنمنٹ انگلستان کے

تیسرا و چوتھا باب — اصول گورنمنٹ کمپنی کے

(تیسرا باب: ایسٹ اڈیا کمپنی کی تاریخ۔ چوتھا باب: بورڈ آف کنٹرول اور کورٹ آف ڈائرکٹرز)

پانچواں باب — اصول گورنمنٹ پریسیڈنسیوں کے یعنی، کلکتہ مدراس اور بنبئی (بمبئی)

اس کتاب کا قابل ذکر حصہ وہ ''لغت نامہ'' (Glossary) ہے جس میں انگریزی زبان کی سیاسی و آئینی اصطلاحات کے اردو مترادفات پیش کیے گئے ہیں یہاں اصطلاح کا مترادف لفظ وضع کرنے سے زیادہ ادائیگی۔ مفہوم اور سادگی زبان کا خیال رکھا گیا ہے۔ چوں کہ کتاب طلباء کے نصاب میں شامل کرنے کی غرض سے مرتب کی گئی تھی اس لیے ترجمے کا یہ اصول بہت مناسب اور قابلِ تعریف ہے۔ یہاں صرف چند تشریحات و اصطلاحات مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔

گورنمنٹ : (Goverment) ایک لفظ انگریزی ہے حکومت کے معنوں میں۔ یہ لفظ کئی معنوں میں آتا ہے، باعتبار اختلاف مقاموں کے مثلاً اگر ہم کہیں کہ انگریزی گورنمنٹ اچھی ہے تو اس سے یہ مراد ہے کہ عمل داری ان کی اچھی، اور کہیں کہ گورنمنٹ کا ارادہ نگہہ داشت کا ہے تو یہاں عمل داری سے مراد نہیں بلکہ صاحبانِ عالی شان یعنی سرکار انگریزی۔ بعضی جا اس لفظ سے بندوبست عمل داری کا مراد ہوتا ہے۔ لیکن جو معنی اکثر استعمال میں آتے ہیں وہ دونوں اوّل ہیں۔ یعنی عمل داری اور سرکار۔

کمپنی: (Company) شراکت چند آدمیوں کی کسی خاص مقصد کے لیے۔

---

[1] ان کے بارے میں مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں

''پتمبر بھی کالج کے قابل طلبا میں سے تھے۔ رام چندر کے ہم جماعت اور سینئر اسکالرشپ پاتے تھے۔ کالج سے سنہ ۱۸۴۵ء میں انجینئری کی تعلیم کے لیے بھیجے گئے۔ یہ پہلے دیسی سول انجینئر جو دہلی میں مقرر ہوئے۔'' (مرحوم دہلی کالج، ص ۱۶۴)

کون سٹی ٹیوشن: (Constitution) قواعد مقرری گورنمنٹ کے۔

کولونی:(Colony) ایک لفظ انگریزی ہے۔ مراد اس سے اس بستی سے لی جاتی ہے جو کوئی قوم کسی غیر ولایت میں آباد کرے۔ کولونی اکثر ابتداء سے تابع قوم مذکور کی ہوتی ہے، اور داد اور انصاف بموجب قوم مذکور کے آئین کے ہوتا ہے۔ مثلاً امریکا۔

بل:(Bill) مسودہ قانون

چارٹر: (Charter) سند یا فرمان

ڈائرکٹر:(Director) سربراہ کار

پروروگ:(Prorogue) برخاست

ایڈجرن:(Adjourn) معطل کرنا

سشن:(Session) اجلاس

اسپیکر:(Speaker) میر مجلس

آرچ بشپ:(Arch-Bishop) لاٹ پادری اعظم

ہوس آف لارڈز: (House of Lords) کچہری امیروں کی

ہوس آف کامنز:(House of Commons) کچہری وکلائے رعایا کی

سنہ ۱۸۴۴ء میں جب رام چندر نے یہ رسالہ مرتب کیا تو دہلی کالج میں ان کے زمانۂ طالب علمی کا آخری سال تھا۔ وہ کالج کے سینئر اسکالر (Senior Scholar) تھے اور مسٹر بوترو (Boutros) کی نگرانی میں انگریزی کتابوں کے تراجم کا کام کر رہے تھے۔ ان ہی تراجم کے ذریعے عربی و فارسی جماعتوں کے طلبا کو مغربی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔

"یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ صاحب علم مراتب والا مناقب جناب بوتروس صاحب بہادر پرنسپل مدارس دہلی کو منظورِ نظر ہے کہ جمیع کتب علمیہ انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ ہو کر طلبہ عربی اور فارسی خواں کو پڑھائی جاویں اور طلبہ مدرسہ فارسی کا بھی میل طبیعت طرف تحصیل علم ریاضی کے بہ سبب ان کی سعی بلیغ کے پیچ سیکھنے رسالہ جبر و مقابلہ کے جو اسی خاکسار نے پہلے تالیف کیا ہے دریافت ہوا۔ اسی سبب سے اس ہیچ مداں نے قصد اس رسالے کی تالیف کا کیا۔"[1]

---

[1] دیباچہ رسالہ علم مثلث و تراش ہائے مخروطی و علم ہندسہ بالجبر۔

یہ کتاب ہٹن (Hutton) بوشارلٹ (Boucharlet) اور سائمن (Simon) کی علم مثلث (Trigonometry) تراش ہائے مخروطی (Conic Sections) اور علم ہندسہ بالجبر (Analytical Geometry) سے متعلق کتابوں کے تراجم سے مرتب کی گئی تھی اور ریاضی کے طلبا کے لیے اس لیے ضروری تھی کہ:

> ''بہت سی کتابیں علم ہیئت اور علم ادات کی زبان انگریزی میں ایسی ہیں کہ بغیر جانے علمِ مثلث اور فروغ ریاضی کے سمجھنا ان کا متعذر رہتا ہے۔ پس اوّل بیان کرنا ان مطالبِ ضروری کا جو کتب مذکورۃ الصدر میں سے اخذ کی گئی ہیں، لازم پڑا...... جو شخص تحریر اقلیدس اور رسالہ جبر و مقابلہ اور اس کتاب کو بہ نظر تامل سیر کرے گا، اس کو استعداد کافی واسطے تحصیل علم کا انتہا یعنی حسابِ جزئیات و کلیات کے حاصل ہو جاوے گی......''[1]

یہ نسخہ اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ اس میں صفحات کی کل تعداد ۳۱۰ ہے۔ سرورق اور آخر کے چند صفحات غائب ہیں پہلے صفحے پر مصنف کا نام ''رام چند'' (Ram Chund) چھپا ہوا ہے جو صحیح نہیں۔

اصولِ جبر و مقابلہ

رام چندر کی یہ کتاب ۱۸۴۵ء میں دہلی اردو اخبار پریس سے شائع ہوئی۔ اس میں سات ابواب اور ۴۷۸ صفحات ہیں۔ آخر میں چار صفحے کا ایک غلط نامہ بھی شامل ہے۔ دوسری سائنس کی کتابوں کی طرح اس میں بھی شکلیں اور خاکے جا بجا نظر آتے ہیں۔

کتاب کے سرورق پر ''رام چندر مدرس علوم انگریزی مدرسہ دہلی'' چھپا ہوا ہے مگر آخری صفحے پر یہ الفاظ درج ہیں۔

> ''پیر کے دن۔ نومبر کی تیسری تاریخ ۱۸۴۵ء کو کتاب جبر و مقابلہ تصنیف کی ہوئی رام چند صاحب طالب علم اوّل جماعت مدرسہ دہلی کی ختم ہوئی۔''

۳ر نومبر ۱۸۴۵ء سے پہلے رام چندر استاد مقرر ہو چکے تھے۔ یہ کتاب انھوں نے زمانہ طالب علمی میں مکمل کر لی ہوگی شاید اسی لیے کتاب کے آخر میں یہ الفاظ نظر آتے ہیں۔ یہ نسخہ اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد میں محفوظ ہے۔

---

[1] دیباچہ رسالہ علم مثلث و تراش ہائے مخروطی و علم ہندسہ بالجبر۔

اصولِ علم حساب جزئیات وکلیات

اس کتاب کا علم فوائد الناظرین ۲۹ ردسمبر ۱۸۴۵ء (نمبر ۲۱) میں شائع شدہ مندرجہ ذیل اشتہار سے ہوتا ہے۔ یہ کتاب مجھے نہیں مل سکی مگر ان سطور سے ان کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔

> ''واضح ہو کہ قریب دو سو برس کے گزرتے ہیں کہ حکمائے فرنگ نے ایک نئی فرع علمِ ریاضی میں ایجاد کی ہے۔ اور نام اس فرع کا حسابِ جزئیات وکلیات۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک عجب لطیف علم ہے کہ اس کے ذریعے سے ایسی ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں کہ متقدین کے وہ وہم میں بھی نہیں ہوں گی۔ حرکات اجرام فلکی کا حساب بذریعہ اس کے بہت صحت اور درستی سے ہوسکتا ہے اور بواعث ان حرکات کے بوسیلہ اسی علم کے دریافت کیے گئے ہیں۔ واضح ہو کہ اس علم کی تحصیل کرنے کے لیے علم ہندسہ مثلاً تحریر اقلیدس اور حساب اور جبر و مقابلہ اور علم مثلث وغیرہ خوب جاننے چاہئیں۔ کیوں کہ بغیر جاننے ان کے وہ سمجھ میں نہیں آسکتا ہے۔ اگر کوئی سوال کرے کہ اس علم میں کس شے سے بحث ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ اس میں مقداروں ہندسہ کی یعنی کم متصل کی بحث ہوتی ہے لیکن ساتھ اس شرط کے کہ کسی خاص مقدار کا لحاظ نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے حدود کا یعنی حدوں کا جن کی طرف یہ مقداریں زیادہ یا کم ہونے سے میل کرتی ہیں...... اس علم میں ایک کتاب رام چندر جو کہ ایک طالب علم مدرسہ انگریزی کے ہیں زبانِ انگریزی میں سے زبان اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اور صفحے اس کتاب کے قریب چھ سو کے ہیں۔ سوائے کتاب بوشارلٹ صاحب کے جس میں سے ترجمہ کیا گیا ہے مترجم نے بہت محنت اور مشقت سے مثالیں مختلف کتابوں اس فن سے نکالی ہیں۔ اور اس میں مندرج کی ہیں اور شروع کتاب میں کچھ حال اس علم کا لکھ دیا ہے۔''

سریع الفہم

علم حساب پر یہ کتاب رام چندر نے مبتدیوں کے لیے لکھی تھی۔ میں نے اس کے تین نسخے دیکھے

ہیں۔ سب سے پرانا نسخہ جو میرے علم میں ہے، ستمبر ۱۸۴۹ء میں مطبع العلوم دہلی سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا نسخہ جو ۲۴ صفر ۱۲۶۷ھ (۵/جولائی ۱۸۵۰ء) کو شائع ہوا۔ مطبع محمدی کانپور میں چھپا تھا۔ اس ایڈیشن میں حواشی بھی نظر آتے ہیں جن میں اصطلاحوں کی تعریف وتشریح اور مثالوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ آخری حاشیے کے بعد ''مولوی ہادی علی مدظلہ'' چھپا ہوا ہے جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حاشیے مولوی صاحب سے ہی لکھوائے گئے ہوں گے۔ یہ دونوں نسخے رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہیں اس کا ایک اور ایڈیشن ۱۰/رجب ۱۲۷۲ھ (۱۲/اگست ۱۸۵۵ء) کو مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے دو نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہیں۔

''سریع الفہم'' کے آغاز میں خود رام چندر نے کتاب کی نوعیت ان الفاظ میں واضح کر دی ہے۔

> ''یہ مختصر رسالہ علمِ حساب میں مسمیٰ سریع الفہم نیاز مندِ خلائق رام چندر مدرس علوم انگریزی مدرسہ سرکاری دہلی نے واسطے مبتدیوں اور نوآموزوں کے تالیف کیا۔ واضح ہو کہ اس رسالے میں تمام حساب روزمرہ کے مع پیمائش زمین اور اجسام وغیرہ کہ بہت ضروری ارباب عالم کو ہوتے ہیں، مندرج ہیں۔ کوئی ایسا حساب ضروریاتِ روز مرہ کا نہیں ہے کہ اس رسالے میں نہ ہو۔ اور سوا اس کے ایک باب ایسے سوالات میں ہے کہ گویا وہ لطیفہ ہیں۔ اگر ان کو کسی محفل میں مذکور کریں ارباب محفل سن کر بہت خوش ہوں۔ غرض کہ خوبیاں اس رسالے کی بعد ملاحظہ کے معلوم ہوتی ہیں۔ احتیاج خلاصۃ الحساب اور لیلاوتی وغیرہ کی اس کے آگے مطلق نہیں ہے۔''[۱]

''سریع الفہم'' ایک مقدمے اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کو فصلوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

پہلا باب: ''صحیح عدد کے بیان میں۔''

دوسرا باب: ''کسر کے بیان میں۔''

تیسرا باب: ''اربعہ متناسبہ وغیرہ کے ذکر میں۔''

چوتھا باب: ''مساحت کے بیان میں۔''

پانچواں باب: ''خرید وفروخت ہر قسم کی اشیا کے بیان میں۔''

---

۱ سریع الفہم، ورق ۲

چھٹا باب: ''تحریر کو اغذ، فاضل، باقی، بٹائی وغیرہ کے دستور میں۔''

ساتواں باب: ''ان حسابوں کے ذکر میں کہ بطور لطیفہ ہیں۔''

آٹھواں باب: ''سوالاتِ مشکل کے بیان میں۔''

اسباق میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کچھ گُر کی باتیں اور دلچسپ سوالات بھی پیش کیے گئے ہیں مثلاً:

''ایک روپے کا جتنے گز کپڑا بکتا ہے ایک آنے کا اتنی ہی گرہ آوے گا............''[1]

یا

''وہ کیا ہے اگر اس میں ایک کم کریں گیارہ باقی رہیں۔

جواب: ایک برس: کہ اگر ایک مہینہ اس میں سے کم ہو تو گیارہ مہینے باقی رہتے ہیں۔''[2]

علم طبیعی

فوائد الناظرین ۲جنوری ۱۸۵۱ء (نمبر اوّل جلد ششم) میں ایک اشتہار سے اس کتاب کا علم ہوتا ہے۔ راقم الحروف کو یہ کتاب بھی حاصل نہیں ہوسکی مگر اس اشتہار سے چند باتوں کا پتا لگ جاتا ہے:

''اور پر شائقین علم و ہنر کے واضح ہو کہ درپن والا ایک کتاب علم طبیعی جس میں مضامین مفصل ذیل، کہ اکثر ان میں کے جواب تک طبع ہوئے ہیں نہیں پائے جاتے، درج ہیں، اس نیاز مند کی تالیف سے طبع ہوئی ہے، وہ کتاب آٹھ باب پر منقسم ہے۔''

اوّل-- میں ادات اور وہ اس طرح پر کہ جہاں طولانی عبارت کچھ ضرور نہ تھی وہاں اختصار کیا۔ اور برعکس اس کے جہاں ضرور تھی وہاں اس کا لحاظ رکھا ہے۔

---

[1] سریع الفہم، باب پانچواں
[2] ایضاً ایضاً ساتواں

دوم-- میں علم ہیئت، اس کی ترتیب یوں ہے کہ اوّل میں ثبوت گردش زمین معہ اعتراضات اوران کی تفصیل درج کی گئی ہے، تاہر خوانندۂ کتاب کو شک گردش کرنے زمین میں نہ رہے اور بعد اس کے حالات سیارہ وستارہ کا وحساب کسوف خسوف مجملاً بیانکیا گیا ہے۔

سویم-- علم آب، اس میں اکثر مفید کلوں کا مع اشکال بیان ہے۔

چہارم-- علم ہوا

پنجم-- مناظر ومراج (Mirage)

ششم-- الکٹری سٹی یعنی (بجلی)

ہفتم-- میکنیٹزم یعنی (مقناطیس)

ہشتم-- میں حال حرارت کا مندرج ہے اور مضامین مشکل کو ایسے طریق سہل پر بیان کیا ہے کہ ہر خاص وعامکے فہم میں بہ آسانی آجاویں، اور فوائد کثیر بخشیں۔

قیمت اس کتاب مفیدہ کی بالفعل دو روپے آٹھ آنے مقرر کی ہے۔ جن صاحبوں کو خریداری اس کتاب مخزن فوائد کی منظور ہوایک درخواست بندے کے نام بھیج دے۔ یہ بعد تیار ہونے کے ان کی خدمت میں روانہ کی جائے گی۔"

رسالہ اصول کلوں کے باب میں

یہ رسالہ ٹی-ٹیٹس (T. Tates) کی کتاب Elements of Mechanism کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۸۶۳ء میں ٹامسن کالج پریس رڑکی (Thomason College Press, Roorki.) سے شائع ہوا۔ ٹامسن سول انجینئرنگ کالج، رڑکی میں رام چندر جنوری سنہ ۱۸۵۷ء سے ستمبر سنہ ۱۸۵۸ء تک بحیثیت ہندوستانی ہیڈ ماسٹر (Native Head Master) کے وابستہ رہ چکے تھے اس کتاب کی اشاعت کے وقت وہ دہلی ڈسٹرکٹ اسکول میں استاد ریاضی تھے۔[1]

یہ کتاب اعلیٰ درجے کے ٹائپ میں چھپی ہوئی ہے۔ ظاہری شکل وصورت موجودہ اردو طباعتکے عام معیار سے بلند ہے۔ کتاب میں صفحات ۱۴۶ اور اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ درج ہے۔ جابجا شکلوں

---

[1] Treatise, page xxii

، خاکوں، تصویروں اور مثالوں کے ذریعے مسائل اور ان کے حل پیش کیے گئے ہیں، سرورق پر مصنف کا نام ''یسوع داس رام چندر'' (Y. Ranchundra) لکھا ہوا ہے جو تبدیل مذہب کے بعد انھوں نے اختیار کیا تھا، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے۔

کتاب کی عبارت بہت رواں عام فہم ہے۔ سائنس کے مسائل کو سمجھانے کے لیے بہت ہی سلجھا ہوا انداز بیان اور کم الفاظ میں جچی تلی مگر واضح بات کہنے کا سلیقہ اس کتاب میں نمایاں ہے۔ اس سائنسی اسلوب کو رام چندر ہی نے اردو میں متعارف کرایا اور ایک بلند معیار تک پہنچایا۔ طرز تحریر سے کہیں بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ رسالہ کسی انگریزی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ دو مثالوں سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

(۱) ''حرکت یا تو 'مطلق' ہوتی ہے یا 'نسبتی'۔ جب کہ ایک جہاز کنارۂ سمندر سے روانہ ہوتا ہے تو اس کی حرکت بہ لحاظ کسی شے کے کہ خشکی پر قائم ہو 'حرکت مطلق' خیال کی جاتی ہے۔ لیکن جب کہ اس کے مقام کو کسی اور جہاز کی نسبت کہ وہ بھی متحرک ہو، خیال کرتے ہیں تو اس کی حرکت کو حرکت نسبتی، کہتے ہیں۔''

(۲) ''رفتار ایک جسم کی، اندازۂ حرکت اس جسم کا ہے، مثلاً اگر ایک آدمی ہر گھنٹے میں یکساں چار میل چلے تو اس کی رفتار یعنی اندازۂ حرکت چار میل فی گھنٹہ ہے، اور اگر ایک جسم ہر ثانیہ یا سیکنڈ میں چھ فیٹ طے کرے تو اس کی رفتار یعنی اندازۂ حرکت چھ فیٹ فی سیکنڈ ہے یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ واسطے تعبیر کرنے رفتار کے ضرور ہے کہ ایک خاص تعداد احادِ مسافت کی ایک خاص واحد زمانے میں طے کی جائے۔ مقرر کرنا اُن احاد کا ایک امر اختیاری ہے۔ لیکن دستور یہ ہے کہ فٹ کو واحد مسافت کا اور سیکنڈ کو واحد زمانے کا فرض کرتے ہیں۔ پس مثال گزشتہ میں فقط یہ کہتے ہیں کہ رفتار جسم کی فقط چھ فیٹ ہے......''

"A Treatise on the Problems of Maxima and Minima"

(رسالہ مسائل کلیات وجزئیات[۱])

رام چندر کی اس اہم کتاب کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۸۵۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس کے چھپتے ہی مختلف علمی حلقوں میں رام چندر کے چرچے ہونے لگے۔ اس پر تنقیدیں بھی ہوئیں، خصوصیاً کلکتہ

---

[۱] مزید ملاحظہ ہو دوسرا باب، ص ۳۶ تا ۳۹

ریویو (Calcutta Review) نے اس کے بارے میں جو کچھ لکھا اس سے رام چندر کو سخت صدمہ ہوا[1] سنہ ۱۸۵۱ء میں جب رام چندر خود کلکتہ گئے تو انھوں نے کلکتہ ریویو کی تنقید سے پیدا ہونے والے ناموافق اثرات کو دور کرنے کے لیے تمام اعتراضات کا ایک جواب لکھا جو انگلش مین (Englishman) میں شائع ہوا۔ مسٹر بیتھیون (Bethune) کے توسط سے یہ کتاب یورپ کے ماہرین ریاضی کے پاس پہنچی۔ لندن یونی ورسٹی کے پروفیسر مسٹر آگسٹس ڈی مارگن (Augustus De Morgan) اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے کورٹ آف ڈائریکٹرز کی توجہ اس طرف مبزول کرائی۔ کورٹ کے سکریٹری کے نام اپنے خط میں انھوں نے رام چندر کی کتاب کو ''ہندو فکر کی تجدید'' سے تعبیر کیا۔ انھیں اس میں ''تحقیق کی ایک ایسی صلاحیت کا ظہور'' نظر آیا جسکا پتا ''قدیم ہندوستانی الجبرا کے ان باقیات'' سے نہیں چل سکتا تھا جو ترجمہ ہو کر یورپ تک پہنچے تھے۔ پروفیسر مارگن نے ہندوستانی ریاضیات کی تاریخ اور اس کے خاص عناصر پر تبصرہ کرنے کے بعد رام چندر کی کتاب کو اس وسیع پس منظر میں پیش کیا اور اس بات کی تعریف کی کہ مصنف نے انگریز اساتذہ کے زیر ترتیب رہنے کے باوجود ہندوستان کی قدیم علمی روایات اور قومی ذہانت کا بھرم رکھ لیا اور اس ''عملی نقطہ نظر'' کی طرف بھکے نہیں جو شائدان کے انگریز اساتذہ انھیں سکھا دیتے۔ انھوں نے خالص نظری علوم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ ہندستانی مذاق علم کے پیش نظر رام چندر کے کارنامے کی عملی اہمیت بھی ہے۔ اسی لیے انھوں نے اسے ''ہندوستان میں ملکی قوت فکر کے وجود'' کا ایک ثبوت قرار دیا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ یونانی اور ہندوستانی ریاضیات کی مختلف و ممتاز خصوصیات اس رسالے میں ہم کنار ہو گئیں؟

> ''اگر یہ کتاب چودھویں صدی کے مخطوطے کے طور پر برآمد ہوئی ہوتی تو میں ان کو (رام چندر کو) بھاسکر کی بجائے ڈایوفین ٹس (Diophantus) کا پیرو کہتا۔''[2]

۱۸۵۹ء میں یہ کتاب پروفیسر مارگن کے اہتمام میں لندن سے شائع ہوئی۔ اور اسی کی اہمیت کے

---

[1] کلکتہ ریویو نے بھی اس رسالے کو قطعاً رد نہیں کر دیا تھا۔ اس میں عملی افادیت کے فقدان پر تنقید کرنے کے باوجود اس نے اس کے چند حصوں کی اہمیت کو تسلیم کیا اور رام چندر کی قابلیت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا: ''..........وہ دماغ جس نے ریاضی کے اس تصور کو جنم دیا، ان کارناموں کے مقابلے میں جو اس کتاب میں انجام دیے گئے ہیں، کہیں زیادہ بہتر کارنامے انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔''

(Calcutta Review: (1850) Vol. xiv, No. xxviii, page xxxviii)

[2] مکتوب مارگن بنام سکریٹری کورٹ آف ڈائریکٹرز مورخہ ۱۸ مارچ سنہ ۱۸۵۸ء (لندن)

Ref: N. A. I. Letters to the Court, 1858

پیشِ نظر کورٹ آف ڈائرکٹرز اور حکومت دہلی کی طرف سے انھیں خلعت وانعام سے نوازا گیا۔ پروفیسر مارگن نے اپنے طویل مقدمے میں رام چندر کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ان وجوہ کو بھی پیش کیا جن کی بنا پر مصنف اور اس کی تصنیف کو اس اعزاز کے قابل سمجھا گیا۔ اس مقدمے میں انھوں نے لکھا تھا۔

"میں نے رام چندر کی کتاب کو اطمینان و استعجاب کے ملے جلے احساس کے ساتھ پڑھا جس میں چند منٹ کے غور و فکر کے بعد کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ مجھے اس میں ہندو فکر و فلسفہ کی پو پھوٹتی ہوئی دکھائی دی۔"[1]

"A Specimen of a New Method of the Differential Calculus, called the Method of Constant Ration."

(تفرقی احصاء کا ایک نیا طریقہ)

۶۲ صفحات کا یہ مختصر رسالہ جو کلکتہ کے ملٹری آرفن پریس (Military OrphanPress) سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا تھا اور نیشنل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہے، اس کے دیباچے میں رام چندر نے اسے "رسالہ مسائل، کلیات و جزئیات" (Treatise) سے اس کی عملی حیثیت کی بنا پر مختلف قرار دیا ہے۔

"یہ رسالہ بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ اس میں جو طریقہ پیش کیا گیا ہے وہ اگر جانچ پرکھ کے بعد صحیح ثابت ہو تو یہ (رسالہ) بہت مفید ہو گا۔ پرانے طریقوں میں جو مشکلات ہیں اور جنھیں دور کرنے کے لیے ہی یہ نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے انھیں (کتاب کے) تعارف میں بیان کر دیا ہے۔"

پروفیسر مارگن کے علاوہ کیمبرج کے مسٹر رے نالڈز (Reynolds) اور ایڈنبرا کے پروفیسر کیلنڈر (Prof. Kelland) نے اس کتاب پر تبصرے لکھ کر بھیجے جو رام چندر نے اس رسالے میں بھی شامل کیے۔ ان سب حضرات نے مصنف کے اختراع پسند ذہن کی تعریف کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم کیا کہ رام چندر نے جو طریقہ اختیار کیا وہ یقیناً نیا ہے گو کہ اس کے ذریعے انھوں نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ نیا نہیں۔ اس رائے سے رام چندر کو بھی اتفاق تھا۔[2]

---

[1] Treatise, page 10

[2] A specimen of a New Method of the Differential Calculus, page 6

اعجاز القران

یہ کتاب پہلی مرتبہ اس وقت طبع ہوئی جب رام چندر ریاست پٹیالہ میں ڈائرکٹر تعلیمات کے عہدے پر فائز تھے۔[1] مجھے اُس کا دوسرا ایڈیشن ہی مل سکا جو پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور (Punjab Religious Book Society) نے ترمیم کے بعد شائع کیا تھا۔ یہ نسخہ اسٹیٹ لائبریری۔ حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ اعجازِ القران ۱۵۸ صفحوں، پانچ فصلوں، دیباچے اور تتمے پر مشتمل ہے۔ اس کے مباحث کی تفصیل یہ ہے۔

فصل اوّل: ''معجزہ وحی کی تفتیش میں''

فصل دوم: ''خاص تذکرہ ان لوگوں کا جن سے محمد صاحب نے تعلیم پائی اور اجزاء قرآن مرتب ہوئے''

فصل سوم: ''جبرئیل قرآنی کے بیان میں''

فصل چہارم: ''اس دین کے بیان میں جو جبرئیل قرآنی نے محمد صاحب کو سکھلایا، یعنی دین ابراہیم''

فصل پنجم: ''اس بیان میں کہ کس معنی سے قرآن ایک معجزہ ہے''

تتمہ: ''اس بیان میں کہ موافق قرآن اور حدیث کے یہ عقیدہ محمدیوں کا کہ فصاحت قرآن ایک معجزہ ہے، باطل ہے۔''

مسیح الدجال

گارساں دتاسی نے اس رسالے کے بارے میں لکھا ہے:

''ہندوستانی عیسائیوں کی مطبوعات میں سے ایک خاص طور پر قابل توجہ

---

[1] اسی کے جواب میں ''اعزاز قرآن'' کے نام سے ایک رسالہ نصرت المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کا اشتہار رسالہ ''صلاح فلاح'' کے آخر میں نظر آتا ہے۔

''اعزاز قرآن: جواب ''اعجاز قرآن'' مصنفہ ماسٹر رام چندر عیسائی۔ ڈائریکٹر ریاست پٹیالیہ''

(''رسالہ صلاح فلاح'' کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں محفوظ ہے)۔

ہے۔اس کا عنوان ''دجالی مسیح''[1] ہے اور مولف کا نام رام چندر ہے جو ریاست پٹیالہ میں وزیر تعلیم ہیں مصنف کا روئے سخن کتاب میں پیغمبر اسلام کی جانب ہے۔میرزا نے اس رسالے پر ایک محققانہ تبصرہ شائع کیا ہے۔مولوی صاحب موصوف نے عیسائی مبلغوں کے ادھ کچرے علم کی خوب دھجیاں اڑائی ہیں اور حیرت ظاہر کی ہے کہ رام چندر جیسے ذی علم مصنف نے بھی وہی راستہ اختیار کیا۔ بعدازاں میرزا صاحب نے اس عیسائی عالم کے استدلال کا ایک ایک کر کے جواب دیا ہے۔رام چندر صاحب کا دعوا ہے کہ قرآن وحدیث کے مطابق عیسائی اصل ایمان والے ہیں نہ کہ مسلمان۔پھر وہ فرماتے ہیں کہ انجیل اور قرآن دونوں کے مطابق آں حضرت صلعم (نعوذ باللہ) دجال ہیں۔پھر میرزا صاحب نے ثابت کیا ہے کہ رام چندر کا یہ دعوا کہ قرآن شریف اور انجیل میں مطابقت پائی جاتی ہے، بے بنیاد ہے۔میرزا صاحب نے رام چندر کے دعووں کا جواب بڑی معقولیت سے دیا ہے اور مثالیں دے دے کر ثابت کا ہے کہ انجیل کے دونوں حصوں میں متاخرین نے کتنا تصرف کر دیا ہے۔''[2]

محمد ابوالمنصور صاحب نے بھی ''استیصال'' کے عنوان سے ایک رسالہ ''مسیح الدجال'' کے جواب میں لکھا تھا۔[3] اور عیسائیوں کو چیلنج کیا گیا تھا کہ ''استیصال'' کا جواب لکھنے والے مصنف کو دوسو روپیہ انعام دیا جائے گا یہ اشتہار لدھیانہ سے شائع ہونے والے عیسائیوں کے اخبار ''نورافشاں'' (۱۱ر مارچ ۱۸۷۵ء) میں بھی چھپا، مگر اس کا جواب نہیں دیا گیا چناں چہ ''مہر درخشاں'' نے شکر ادا کیا کہ عیسائی ابوالمنصور صاحب کے رسالے کے بعد لاجواب ہو گئے۔

رسالہ ''مسیح الدجال'' بھی مجھے دستیاب نہیں ہوا۔

رسالہ تحریفِ قرآن

دہلی کے ایک اخبار ''مہر درخشاں'' (۱۱ر ستمبر ۱۸۷۷ء) سے اس رسالہ کی اشاعت کا پتا چلتا ہے۔

---

[1] ''مہر درخشاں'' دہلی، مارچ، اپریل، مئی ۱۸۷۵ء کی اشاعتوں میں رسالے کا نام ''مسیح الدجال'' لکھا گیا ہے۔شاید گارساں دتاسی تک صحیح نام نہیں پہنچا۔

[2] مقالات گارساں دتاسی، ص ۵۱۔۵۲

[3] مہر درخشاں، ۲۴ر مارچ ۱۸۷۵ء

اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی حامد حسین صاحب شیعی لکھنوی کی کتاب ''استقصاء الافحام'' رسالہ تحریفِ قرآن کا سبب بنی۔ مولوی صاحب کی تکاب نزاع سنی وشیعہ سے تعلق رکھتی تھی۔ رام چندر نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس کی بنیاد پر قرآن میں تحریفات ثابت کیں۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ''اس رسالہ تحریف قرآن کے غالباً دوسو جواب مسلمانوں کی طرف (سے) تیار ہوں گے۔ چناں چہ چند جواب تو ابھی اسی شہر میں قریب اختتام ہیں۔''[1] مہتمم ''مہر درخشاں'' (۱۱ر فروری ۱۸۷۸ء) سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالحق صاحب دہلوی نے بھی ''تعریف القرآن'' کے نام سے تحریفِ قرآن کے جواب میں ایک رسالہ شائع کیا تھا۔

اعتراض قرآن

اس کے بارے میں مقالاتِ گارساں دتاسی سے صرف اتنا پتا چلتا ہے ''اعتراض قرآن میں رام چندر نے اسلامی عقائد پر تنقید کی ہے۔''[2]

بدعات عیسائی مذہب

اس کا نام رام چندر کی مذہبی تصانیف کی ایک فہرست میں ملتا ہے جو (Memoirs) میں پیش کی گئی ہے۔[3] اس سے زیادہ اس کے بارے میں معلوم نہ ہوسکا۔

---

[1] ''مہر درخشاں''، دہلی، ۱۱ر ستمبر ۱۸۷۷ء
[2] مقالات گارساں دتاسی، ص ۷۷
[3] Memoirs, page 126

چوتھا باب

خیالات وافکار

رام چندر کی تحریروں کی اہمیت ان کے خیالات وافکار کی بنا پر ہے۔ ان خیالات کی تشکیل کن حالات کے تحت ہوئی، اس کا ذکر پہلے اور دوسرے ابواب میں تفصیل کے ساتھ کیا جاچکا ہے۔ رام چندر کا حساس ذہن زمانے کے تقاضوں سے متاثر ہوا تھا۔ زندگی کے ابتدائی ایام کے تجربات نے ان کی فکر کو حقیقت پسندی عطا کی۔ انگریزی تعلیم نے شعور کو وسعت دی۔ وہ ایک سائنسداں کا فطری تحیّر لے کر پیدا ہوئے تھے، جس نے انھیں دم بخود کردینے کی بجائے پہلے سے زیادہ سرگرمِ فکر کردیا۔ اپنی ذہانت، مطالعے اور مشاہدے کی بدولت، تشکیک اور تصدیق و تردید کی صلاحیت حاصل کی اور اسی بنا پر اُنھوں نے اپنے دور کے مسائل سے متعلق وہ نظریات قائم کیے جو ان کی تحریروں کے محرّک اور ماحصل تھے۔

اس وقت سائنسی تحلیل و تجزیے کا عمل دہلی کی لیباریٹری تک محدود رہنے کی بجائے ایک ذہین طالب علم کے نظام فکر کا آئین بن گیا تھا اور اس کے سائنسی طرز فکر کے تیزاب میں پڑکر بیشتر تسلیم شدہ عقائد جھوٹے اور بے حقیقت نظر آنے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ ان تمام عقائد کے خلاف آواز بلند ہوئی جن کی تعظیم و تقدیس ہی تہذیب، مذہب اور اخلاق کا تقاضا سمجھا جاتا تھا۔ رام چندر دہلی کالج سے متعلق تھے جہاں کی تعلیم عام خیال کے مطابق 'تجدد زدہ' اور 'مخرب اخلاق' تھی۔ چناں چہ وہ لڑکپن سے ہی دو نقطہ ہائے، نظر کے تصادم میں ایک فریق سے نہ صرف وابستہ ہوچکے تھے بلکہ اس کی علمی وتہذیبی سرگرمیوں میں سب سے پیش پیش تھے اور ان

کا شمار کالج کے مثالی طلبا میں کیا جاتا تھا۔ سماجی تصادم کے اس عمل نے رام چندر کو بھی جدوجہد کا حوصلہ عطا کیا اور ان کی سرگرمیوں میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ زمانہ طالب علمی میں ہی اُنھوں نے سائنس و سیاسیات، تاریخ و تمدن پر متعدد کتابوں کے اردو تراجم میں اہم حصّہ لیا تھا۔ کالج میں تقرر ہو جانے کے بعد وہ دہلی کالج کی تحریک کے سربراہوں میں شمار کیے جانے لگے۔ 'فوائد الناظرین' کی اشاعت سے ان کی مضمون نگاری کا آغاز ہوا۔ وہ سماجی اور طبیعی علوم سے متعلق پابندی کے ساتھ مضامین لکھنے لگے اور بہت کم عرصے میں ان موضوعات پر تحریروں کا ایک کثیر اور بیش بہا ذخیرہ وجود میں آ گیا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے رام چندر ان لوگوں میں سے تھے جو ہندوستان پر برطانیہ کے اقتدار کو ہی اپنے ملک کی نجات کا ضامن سمجھتے تھے۔ جن حالات میں رام چندر نے جنم لیا ان کے پیش نظر ملکی نظام حکومت سے ناامیدی کچھ بے جا بھی نہ تھی۔ ان کے دل کی یہ دبی دبی خواہش کہ ہندوستانی حکمراں خود ہی اپنی اصلاح کریں، شاید خود ان ہی کو بے حقیقت معلوم ہوتی تھی۔ برطانیہ کے سیاسی و معاشی نظام اور اس کی نظریاتی بنیاد کو وہ کہیں زیادہ قوی اور مستحکم سمجھتے تھے۔ یہ محض کسی بھٹکے ہوئے ذہن کی کج فہمی نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے متعدد وجوہ تھیں جو بڑی حد تک معقول تھیں۔ ہندوستانی نظام حکومت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اُنھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

> "تواریخ ہم کو اطلاع دیتی ہے کہ درمیان سلطنت مسلمانوں کے ہر ایک جگہ علاحدہ علاحدہ صوبے دار مقرر تھے اور ان کو اس جگہ رعایا پر بالکل اختیار ہوتا تھا۔ ان کی مرضی میں جیسا کچھ آتا تھا کرتے تھے...... وہ بادشاہ کو کچھ مقررہ خراج ادا کیا کرتے تھے علاوہ ازیں اگر کوئی طاقت ور بادشاہ تخت پر بیٹھتا تو اس کے وہ تابع دار ہوتے تھے لیکن جب کبھی کوئی کمزور اور بے عقل شہزادہ تخت حاصل کرتا تھا تو وہ سرکش ہو جاتے تھے اور ہمیشہ کے فساد میں رعایا بے چین رہتی تھی اور وہ چاہتے جس طرح سے اپنی رعایا کی مدارات کرتے تھے۔ اسی باعث سے وہ قوانین اور تجویزیں جو اچھے شہنشاہ کرتے تھے، بے کار رہتی تھیں۔ یہ بات سب پر روشن ہوگی کہ جب کبھی کوئی طاقت ور اور عقل مند بادشاہ ہوتا تو رعایا واسطے تھوڑے وقت کے آسودہ حال ہو جاتی تھی اور جب کبھی کوئی بے عقل شہنشاہ طاقت حاصل کرتا تھا تو رعایا بدستور

تکلیف اور رنج سہتی تھی۔ مثلاً سنہ ۱۷۴۵ء میں جب کہ حاکم ہندوستان کا محمد شاہ تھا، تاریخ بیان کرتی ہے کہ یہ شہنشاہ ہمیشہ محل میں رہتا تھا اور کاروبار سلطنت سے کم سروکار رکھتا تھا، مرہٹوں نے ترقی حاصل کی اور اضلاع دہلی کو جلاکر برباد کردیا.....اسی شہنشاہ کے عہد میں نادرشاہ بادشاہ ایران دہلی میں داخل ہوا......''[1]

اس کے مقابلے میں جب اُنھوں نے اس نظامِ حکومت پر غور کیا جو مغلیہ سلطنت کی جگہ لے رہا تھا اور جس کا انھیں خود تجربہ تھا تو اسے اُنھوں نے گذشتہ نظام کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر پایا۔

''اب انگریزوں کے ہاں یہ ہے کہ اگر ایک شخص منصف کے ہاں مقدمہ ہارے تو وہ جج کے ہاں فریاد کرسکتا ہے اور وہاں سے اور محکموں میں۔ اس وجہ سے افسر انگریزوں کی سلطنت میں حتی المقدور اپنی رعایا پر ظلم نہیں کرسکتا ہے۔......''[2]

دراصل یہ دو مختلف النوع نظام ہائے زندگی کا فرق تھا۔ ایک کہنہ ہو چکا تھا اور رفتہ رفتہ ختم ہورہا تھا۔ دوسرا ابھی جنم لے رہا تھا۔ جاگیردارانہ نظام پر مبنی ہندوستانی حکومت صنعتی دور کے پروردہ سامراجی نظام کے آگے رعشہ براندام تھی اور رام چندر اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے کہ ایک بہتر اور ترقی یافتہ نظام کا کم تر اور کہنہ نظام کی جگہ لے لینا تاریخ کا اٹل قانون ہے:

''جب بادشاہ سلطنت بابل کے عیاش اور بے خبر ہونے لگے تھے تو ایران والوں نے انھیں زیر کیا اور جب ایرانی بے خبر امور ریاست سے ہوئے تو اہلِ یونان نے انھیں تابع کیا اور جب یونانی قوم میں بھی عیش وعشرت نے جڑ پکڑلی تو اس وقت اہلِ رومیہ نے انھیں زیر کیا......''[3]

۱۸۵۷ء میں دہلی پر باغیوں کے قبضہ کے بعد وہ جب ایک گاؤں کے چند زمین داروں کی پناہ

---

[1] ''مطابقت درمیان سلطنت انگریزوں اور شاہان ہندوستان کے''فوائد الناظرین' ۱۷راپریل سنہ ۱۸۴۸ء

[2] ایضاً ایضاً

[3] ''رائے ایک انگریز کی، درباب تربیت اہل ہند کے'' فوائد الناظرین، ۴ر اکتوبر ۱۸۴۷ء (یہ دہلی گزٹ میں شائع ہونے والے ایک انگریزی خط کے ترجمے کا اقتباس ہے جو رام چندر نے فوائد الناظرین میں نقل کیا تھا)

میں پہنچے تو وہاں بھی وہ لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ باغیوں کی فتح محض عارضی ہے کیوں کہ نہ صرف وہ ان ذرائع اور وسائل سے محروم ہیں جو حکومت برطانیہ کے اختیار میں ہیں بلکہ انگریزوں کا نظام حیات بھی، جس پر ان کی قوت مبنی ہے، ہندوستانی نظام سے بہتر ہے۔

رام چندر کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ اُنھوں نے ہندوستانی اور برطانوی نظام میں جو تقابل کیا تھا وہ بھی صحیح تھا مگر برطانوی نظام کی اپنی نوعیت پر وہ زیادہ غور نہ کرسکے، اس لیے ہندوستان کے بارے میں تو ان کی رائے یقیناً صحیح ثابت ہوئی مگر برطانوی نظام سے متعلق ان کے خیالات بہت ہی محدود طور پر اپنی حقیقت تسلیم کراسکے۔ برطانوی حکومت سے تعاون، رام چندر کے نزدیک قوم پرستی اور حب الوطنی کا تقاضا تھا، وہ ملکی مفاد اور بیرونی اقتدار میں کوئی تضاد نہیں دیکھتے تھے۔ اُنھیں یقین تھا کہ ہندوستان برطانیہ کا سہارا لیے بغیر قدامت کی تاریکی سے نکل نہیں سکتا۔ ان کے نزدیک انگریز حکمرانوں کو تعلیم سے بہرہ مند، مسیحی اخلاق کا حامل اور ترقی یافتہ شعور کا مالک ہونے کی بنا پر فطرتاً رحم دل اور نیک باطن ہونا چاہیے تھا۔ وہ انگریزوں کے اقتدار کا اصل منشا ہندوستان کی ترقی اور اصلاح سمجھتے تھے۔ برطانیہ کے اپنے مفادات پر اُنھوں نے غور اس لیے نہیں کیا کہ کسی ترقی یافتہ قوم کو وہ خود غرض یا ظالم تصور نہیں کرسکتے تھے۔ انگلستان کے سیاسی نظام نے انھیں خاص طور پر متاثر کیا تھا اور وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اہلِ انگلستان کے اقتدار کے ساتھ آزادی فکر و عمل، حکومت کے کاموں میں عوام کا دخل، ترقی یافتہ سماجی و معاشی ادارے اور وہ تمام اعلیٰ صفات ان کے ملک میں بھی آجائیں گی جن کی بنا پر یورپ والے ہندوستانیوں اور دوسرے ایشیائیوں سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ وہ یہ بھی امید رکھتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کی تربیت کرنے کے بعد رفتہ رفتہ تمام اہم کام ان کے ذمے کردیں گے اور وہ وقت آئے گا جب ہندوستانی ہی اپنے ملک کے اصل حاکم ہوجائیں گے:

> ''ہندوستان میں بڑے بڑے علاقے ملکی اور فوجی فرنگیوں کو ملتے ہیں اور ہندوستانیوں کو وہ علاقے نہیں ملتے ہیں۔ لیکن سنا جاتا ہے کہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کی یہ مرضی ہے کہ ہندوستانی بھی علاقہ جات جلیلہ پر سرفراز ہوا کریں۔ دیکھا چاہیے کہ یہ خوش خبری کب ظہور میں آوے۔ کیا خوب بات ہو کہ علاقہ جات جج اور کلکٹر اور مجسٹریٹ پر ہمارے وطن کے آدمی بھی مقرر ہونے لگیں......''[1]

---

[1] ''حال گورنمنٹ انگریزی ہندوستان کا''، فوائد الناظرین، ۱۵ر مئی ۱۸۴۵ء

رام چندر کے نزدیک حکومت پر مکمل اختیار حاصل کرنے کا صحیح طریقہ یہی تھا کہ ہندوستانی باشندے انگریزی زبان اور جدید نظام حکومت کے آئین وقوانین سے واقفیت حاصل کرکے حکومت میں زیادہ سے زیادہ جگہیں حاصل کریں اور حکام کے ساتھ مکمل تعاون کریں تاکہ انگریز اپنے ''بزرگانہ فرائض'' کو صحیح طور پر انجام دے سکیں۔

دراصل دہلی کالج کے ماحول اور وہاں کی تعلیم وتربیت نے رام چندر کے دل میں انگریزوں کی قدر بڑھادی تھی۔ وہ انگریز حکمرانوں کو بھی اپنے انگریز اساتذہ ہی کی مانند مخلص سمجھنے لگے تھے اور اسی لیے ان پر انھیں پورا بھروسہ تھا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز ہندوستان پر مکمل طور پر قابض ہوگئے تو شاید رام چندر کو بڑی مایوسی ہوئی اور انگریز حکومت ان اخلاقی اور مذہبی معیاروں پر پوری نہ اتر سکی جنھیں وہ صرف انگریزوں ہی سے مخصوص سمجھتے تھے۔ شاید اسی لیے وہ بغاوت کی ناکامی کے بعد اپنے سیاسی وسماجی نظریات کی تبلیغ میں پہلے کی طرح منہمک نہ رہ سکے اور رفتہ رفتہ وہ عیسائیت کی تبلیغ میں ہی محو ہوگئے۔ تعلیمی کاموں میں بھی وہ مرنے سے چند سال قبل تک مصروف رہے مگر اس کے باوجود سماجی سرگرمیوں میں وہ جوش وخروش نہیں رہ گیا جو 'فوائد الناظرین' اور 'محبِ ہند' کے صفحات سے ظاہر ہوا کرتا تھا۔ اخبارات کا ناسازگار حالات میں بند ہوجانا اور عیسائیت کی تبلیغ کی طرف بڑھتی ہوئی دل چسپی بھی اس کی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ مگر یہ ایسی وجہ نہ تھی کہ رام چندر جیسے سرگرم عمل شخص کے فکر وعمل کے لیے زنجیر ثابت ہوتی۔ سماجی وسیاسی سرگرمیوں کے قطعاً ترک ہوجانے کا سبب شاید انگریزی حکومت سے ان کی مایوسی ہی تھی، ان کے اس خط سے جو اُنھوں نے انگریزوں کے رویّے کی شکایت کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحی روحانیت کا جو تصور اُنھوں نے اپنے ذہن میں قائم کیا تھا وہ برطانیہ کی نوآبادیاتی حکمتِ عملی سے کہیں زیادہ بلند تھا۔[1] دہلی کی آبادی کو بے خانماں ہونا اور شہر کی عمارتوں کو مسمار ہوتا دیکھ کر ان کے خوابوں کے محل بھی منہدم ہوگئے اور شاید اسی لیے اُنھوں نے سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد خاموشی کو ہی مناسب جانا۔

رام چندر نے زندگی کا بڑا حصّہ بحیثیت معلم کے گزارا۔ دوسرے مفکرین کی طرح وہ بھی ملک کی مجموعی ترقی کو اس کے باشندوں کی ذہنی ترقی پر منحصر سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہندوستان کی تباہی کی اصل وجہ ہندوستانیوں کی ذہنی پسماندگی تھی جس کا علاج صرف اشاعت علم کے ذریعے کیا جاسکتا تھا اور علم بھی وہ نہیں جو صدیوں سے اس ملک میں ایک خاص ڈھنگ سے رائج تھا بلکہ وہ علم جس نے مغرب کو دولت وحشمت کے ساتھ مشرق پر فوقیت بخشی تھی۔ ان کے خیال

---

[1] ملاحظہ ہو: ص ۴۷-۴۸

میں رائج الوقت طریقۂ تعلیم روحانی اعتبار سے بھی اسی قدر نقصان دہ تھا جس قدر مادّی اعتبار سے۔ایک بیمار ذہن، محدود نظر، نارسا تخیل تھکی ہاری اور فرسودہ عقائد کے بوجھ سے چور شخصیت، یہ تھی وہ کل کائنات جو پرانے طرز تعلیم نے تعمیر کی تھی۔رام چندر کے خیال میں ذہنی پستی ہی اس طرز تعلیم کے قیام کا سبب تھا اور یہی اس کا نتیجہ۔ چناں چہ 'فوائدالناظرین' کے ذریعے اس کے خلاف بھی اُنھوں نے آواز اُٹھائی۔اس کے ایک شمارے میں مدارس کے نصاب اور تدریس کے قدیم طرز پر ان الفاظ میں تنقید کرتے ہیں:

> اب دیکھنا چاہیے کہ جب یہ لڑکا میاں جی کے بیٹھتا ہے اس وقت سے اسے کس طرح کی تربیت ہوتی ہے۔اوّل تو الف، بے، تے فارسی کی سکھاتے ہیں اور بعد ازاں 'کریما' اور 'خالق باری' وغیرہ اور بعد اس کے 'گلستاں' اسے شروع کرواتے ہیں۔استاد فقط عبارت اور اس کے لفظی معنی لڑکے کو بتا دیتا ہے اور جب سبق پڑھ چکتا ہے اس وقت لڑکا ایک فاصلے پر استاد سے جا بیٹھتا ہے اور وہاں اپنا سبق مانند طوطے کے یاد کرتا ہے۔'گلستاں' میں جو باتیں شیخ سعدی نے بڑی سوچ اور بچار سے بھری ہیں وہ اس کے لیے کچھ فائدہ نہیں دیتی ہیں کیوں کہ اسے اس کے لفظی معنوں سے غرض ہوتی ہے۔ جب 'گلستاں' اور 'بوستاں' تمام ہوتی ہیں تو اسے ایک کتاب جس کا نام بہار دانش ہے، پڑھاتے ہیں۔اگر اس کتاب کی تعریف قرار واقعی کیا چاہیں تو بے حیائی بدرجہ اتم اختیار کرنی چاہیے۔شاباش ہے ان میاں جی اور ان ملانون کو کہ جن کی تین تین گز کی تو داڑھیاں ہیں اور اس کتاب کو چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو جو ان کے بیٹوں اور پوتوں کے برابر ہیں پڑھاتے ہیں۔ استغفراللہ۔ اخلاق لڑکوں ہندوستان کے کیوں نہ سنوریں جب ایسی ایسی کتابیں بچوں کو سکھلائی جائیں۔''[1]

اسی لیے رام چندر چاہتے تھے کہ قدیم مدارس کی جگہ مغربی طرز کے اسکول اور کالج قائم کیے جائیں جہاں جدید و قدیم علوم والسنہ کو بالکل نئے ڈھنگ سے سکھایا جائے۔نصاب کی کتابیں نئے سرے سے مرتب کی جائیں جو نئی ضرورتوں کے مطابق عبارت اور مفہوم کے لحاظ سے طلبا کی عمر اور شعور کے مواقف ہوں اور ان کے افکار و کردار کی تربیت میں حصہ لے سکیں۔اس

---

[1] ''تربیت لڑکوں کی ہندوستان میں'' 'فوائد الناظرین' ۱۵ر دسمبر سنہ ۱۸۴۵ء

سلسلے میں رام چندر کا یہ بھی خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں انگریزی زبان سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ انگریزی زبان کے جملہ فوائد وہ بہت ہی واضح اور مدلل الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''زبان انگریزی ایک وساطت ہے کہ اس کے ذریعے سے جتنے علوم اور فنون اس دنیا میں بالفعل پائے جاتے ہیں، موجود ہیں اور جس کو یہ منظور ہو کہ میں علوم اور فنون کو کماحقہ تحصیل کروں، اسے لازم ہے کہ زبان انگریزی تحصیل کرے...... انگریز لوگ بڑے سیاح اور سوداگر ہیں...... جہاں وہ جاتے ہیں تحقیقات علمی کرتے ہیں۔ وہ مختلف قوموں کی زبان تحصیل کرتے ہیں اور ان کے حال سے آگاہ ہوتے ہیں اور ان قوموں میں جو جو علوم مفیدہ ہوتے ہیں، ان کا ترجمہ اپنی زبان میں کر لیتے ہیں اور اپنی ولایت میں چھاپہ کراتے ہیں۔ وہ جہاں جاتے ہیں ان ملکوں کا نقشہ کھینچ لاتے ہیں اور وہاں کے پہاڑوں تک کی بلندی دریافت کر لیتے ہیں اور وہاں کے قواعد ریاست وغیرہ کا حال دریافت کرتے ہیں.......... جو جو علوم اور فنون زبانوں عربی فارسی اور شاستری میں پائے جاتے ہیں۔ ان سب کو عاقلان انگریزی نے اپنی زبان میں ترجمہ کر لیا ہے۔ انگریزی خواں کو سب حال اور طریقے، ہنود اور مسلمان اور سب قوموں کے معلوم ہو سکتے ہیں۔ گو اسے اصلاً آگاہی زبانوں شاستری اور عربی سے نہ ہو۔ اسے کتابوں ارسطو اور بقراط اور جالینوس وغیرہ سے خوب آگاہی ہو سکتی ہے۔ گو وہ زبان یونانی سے بالکل ناواقف ہو...... پس یہاں سے عیاں ہے کہ زبان انگریزی میں زیادہ تر علوم اور فنون موجود ہیں زبان عربی اور فارسی اور شاستری کے...... علاوہ ازیں انگریز اور قوم فرنگ ہر روز نئی نئی باتیں ہر علم میں نکالتے ہیں، ان کا علم روز بروز ترقی پاتا ہے۔ دخانی گاڑی جس سے دو روز سے کم میں اسباب، آدمی اور خطوط کلکتے سے دہلی پہنچ سکتے ہیں، ٹیلی گراف وغیرہ یہ کرامات معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ قوت صرف علم کی ہے جس سے ایسی ایسی باتیں عمل میں آ سکتی ہیں۔''[1]

---

[1] ''فوائد تحصیل علوم انگریزی کے''، فوائد الناظرین، ۱۰ر جنوری سنہ ۱۸۴۸ء

رام چندر کے یہاں انگریز زبان کے اہمیت اس کی علمی حیثیت کی بنا پر تھی۔ ان کے نزدیک یہ سرکاری ملازمت اور معاشی منفعت سے زیادہ فروغِ علم اور تہذیب ذہن کا وسیلہ تھی۔ وہ انگریزی زبان اور علوم کے فوری فوائد سے زیادہ اس کے دور رس نتائج سے دل چسپی رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کے ذریعے مغرب میں پروان چڑھنے والی اعلیٰ اور ترقی یافتہ تہذیبی اقدار ہندوستانی تہذیب میں در آئیں اور اسے تازگی اور بالیدگی عطا کریں۔ وہ نقلی ذہن اور غلامانہ تہذیب کو جنم دینے والی انگریزی زبان اور مغربی تعلیم سے جو سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد وجود میں آئی واقف نہ تھے۔ دہلی کالج کی تعلیم نے انھیں نہ تو انگریزی کی نقالی سکھائی اور نہ ان سے نفرت بلکہ ایک درمیانی راہ دکھائی تھی جس کے مطابق ان کے سامنے اعلیٰ ترین مقصد انگریزوں کے علوم وفنون سے استفادہ کرکے انھیں اپنے ملک میں رائج کرنا، ان کی تہذیب کے بہترین عناصر کو اپنی تہذیب میں سموکر ہندوستان کی جامد و بے حرکت زندگی میں آثار نمو کو جنم دینا تھا۔ اسی لیے وہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کے فروغ کے لیے بھی کوشاں تھے۔ وہ مادری زبان کو زیادہ فطری اور قدرتی ذریعہ تعلیم سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ انگریزی زبان کا سارا علمی سرمایہ اردو میں منتقل کردیا جائے۔ اس کے لیے اُنھوں نے عملی طور پر جو خدمت انجام دی وہ اردو زبان کی تاریخ میں کبھی بھلائی نہیں جاسکتی۔ وہ ہندوستانی زبانوں کو ختم کرکے انگریزی زبان کو نافذ کرنے کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ انگریزی زبان کے بہترین سرمائے کو رفتہ رفتہ اردو میں پیش کرکے اسے انگریزی اور دوسری مغربی زبان کا اس وقت تک سہارا لینا ضروری تھا جب تک خود اردو زبان اس قابل نہ ہو جائے کہ وہ جدید فلسفہ وعلم کی درس وتدریس کا ذریعہ بن سکے اور اس کا طریقہ صرف یہی تھا کہ اردو داں حضرات کا ایک بڑا طبقہ انگریزی سے گہری واقفیت حاصل کرنے کے بعد تراجم کے ذریعے مغربی علوم کو اردو میں پیش کرے اور یہی ان کے نزدیک انگریزی جاننے کا سب سے بڑا فائدہ تھا۔

> ”جو شخص تحصیل علم انگریزی کرے، وہ کس قدر فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ وہ ترجمہ علوم انگریزی کو زبان اردو میں کرسکتا ہے اور اس ترکیب سے وہ علوم جن کو انگریزوں نے بہت جستجو سے جمع اور اپنی عقل سے اختراع کیے ہیں ذراسی توجہ سے واسطے مطالعہ اور فائدہ پہنچانے اپنے وطن کے آدمیوں کے اپنی زبان میں کرسکتا ہے۔ سب سے بڑا فائدہ تحصیل انگریزی کا یہی ہے کیوں کہ یہ مشکل ہے کہ سارے آدمی ہندوستان کے زبان انگریزی تحصیل کرلیں، پس وہ سب کیوں کر علوم مفیدہ سے

آگاہ ہوسکتے ہیں لیکن البتہ بوساطت اپنی زبان کے اور طاقت ترجمہ
کرنے کی ان ہی میں ہوسکتی ہے جو زبان انگریزی اور زبان اردو سے
بہ خوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ جو شخص ہندوستان کے اپنے ملک کے
خیر خواہ ہیں اور اس قدر حوصلہ رکھتے ہیں کہ وہ کچھ فائدہ خلقت
ہندوستان کو پہنچاویں ان کو چاہیے کہ اس بات کی کوشش کریں کہ جو جو
علوم اور فنون زبان انگریزی میں ہیں ان کو بالکل زبان اردو میں ترجمہ
کریں۔''[1]

رام چندر جانتے تھے کہ ترقی یافتہ قوموں کے سیاسی اقتدار کے جلو میں ترقی یافتہ علمی اور تہذیبی اقدار بھی پسماندہ اقدار پر حاوی ہوتی چلی جاتی ہیں اور غالب آنے والی تہذیب کے بہت سے عناصر مفتوح قوم کی زندگی پر اثر بھی ڈالتے ہیں:

''تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب عمل داری ہندوستان میں مسلمانوں
کی نہ تھی تب کوئی ہندوستانی علم فارسی سے آگاہ نہ تھا اور جب
مسلمانوں کی عمل داری ہندوستان میں قائم ہوئی اس وقت سے ہر ہندو
زبان فارسی کی تحصیل کرنے میں مشغول ہوا اور ہر ایک نے فارسی پڑھ
کر قدرے عقل بہ نسبت سابق کے حاصل کی۔......''[2]

تاریخ کے اسی سبق نے انھیں انگریزوں کے ساتھ آنے والی زبان اور تہذیب کے بہتر عناصر کی قدر کرنا اور انھیں اپنے ملک کے حالات کے مطابق اپنانا سکھایا۔

رام چندر کو تاریخ کے مطالعے سے گہری دل چسپی تھی۔ اُنھوں نے خود بھی متعدد اقوام کی تاریخ قلم بند کی جو 'فوائد الناظرین' اور 'محبِ ہند' کے صفحات پر محفوظ ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و نتائج کا اُنھوں نے غائر مطالعہ کیا تھا۔ اپنے ملک کے سماجی و سیاسی مسائل پر ان کی واضح اور متعیّن رائے بہت کچھ اسی کی مرہونِ منت تھی۔ تاریخ سے متعلق رام چندر کی تحریریں اپنے خاص نقطۂ نظر کی بنا پر اہمیت رکھتی ہیں جس کی تشکیل میں ان کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کے حالات کے گہرے مشاہدے کا بڑا دخل تھا۔ ان کے خیال کے مطابق ہر دور اور ہر قوم کی چند ممتاز سیاسی و تہذیبی اقدار ہوتی ہیں جو اس وقت تک پھلتی پھولتی

---

[1] ''فوائد تحصیل علم انگریزی کے'' فوائد الناظرین ۱۰ رجنوری سنہ ۱۸۴۸ء

[2] ایضاً ایضاً ایضاً

رہتی ہیں جب تک کہ قوم انتشار اور خلفشار سے دو چار نہ ہو جائے۔ تاریخ کے ہر دور میں مختلف النوع اقدار آپس میں متصادم رہی ہیں اور تصادم کی یہ صلاحیت اندرونی عناصر کی قوت پر منحصر ہوتی ہے جب بھی کسی قوم میں یہ قوت کم ہوئی اس نے اس ازلی جنگ میں شکست کھائی اور کسی دوسری قوم کی تابع ہوگئی۔ رام چندر تاریخ کے اس ارتقا کو ضروری سمجھتے تھے اور انھیں پورا یقین تھا کہ قوموں کی اس جدوجہد میں ہار جانے والوں کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ اس وقت تک کسی ترقی یافتہ قوم کے زیر نگیں رہیں جب تک ان میں پھر سے مقابلے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے۔ شکست خوردہ اقوام فاتح اقوام کا سہارا لیے بغیر ان کے اقتدار سے نجات حاصل نہیں کر سکتیں۔ رام چندر کا یہ خیال عمومی نقطہ نظر سے صحیح تھا۔ اقتدار کے لیے اقوام کی جدوجہد، ترقی یافتہ قوموں کا فتح یاب ہونا، پسپا قوموں کا ان کی مدد سے ترقی کرنا اور پھر ان ہی کے مقابلے پر آجانا آج بھی ناقابل انکار حقائق ہیں مگر رام چندر نے حاکم و محکوم اقوام کے متضاد مفادات کی نوعیت پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی۔ اپنے ملک کے حالات کے پیش نظر ان عناصر کی وضاحت کی طرف توجہ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں یہ باتیں خود ترقی یافتہ اقوام کے مفکرین کی ''سرحد ادراک سے پرے'' تھیں۔

یورپی ممالک کی جارحانہ قوم پرستی، افریقی اور ایشیائی ممالک میں سامراج کی شکل میں نمودار ہو چکی تھی۔ اسی سامراج کے بطن سے یورپ کا صنعتی انقلاب اور ایک نیا معاشی نظام وجود میں آرہا تھا جس کی اعانت کے لیے ایک نئے سیاسی نظام کی ضرورت تھی۔ لبرل ازم (Liberalism) دراصل اسی نئے سیاسی نظام کا مطالبہ اور پرانے نظام کے خلاف احتجاج تھا اور تیزی کے ساتھ سارے یورپ پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ یہی نظریہ جب ہندوستان پہنچا تو یہاں بھی مغربی تعلیم کے تحت پروان چڑھنے والے اذہان اس سے حد درجہ متاثر ہوئے۔ اس نظریے میں ہندوستان کے متعدد مسائل کے حل پنہاں تھے مگر چوں کہ ہندوستان اور یورپی ممالک کے حالات نہ صرف مختلف بلکہ متضاد بھی تھے اس لیے یہاں وہ فکری ارتقا ممکن نہیں تھا جو یورپ میں ہوا۔ اس لیے لبرم ازم کا، جو کہ یورپی نظریہ تھا، ہندوستان آکر نئی شکل اختیار کرنا لازمی تھا۔ یہاں آکر اس نے قوم پرستی کے ایک ایسے نقطۂ نظر کو جنم دیا جو سامراجی اور ملکی مفاد میں مفاہمت پر مبنی تھا۔ یہ مفاہمت صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی تھی جب کسی ایک فریق کے مفاد کی طرف سے چشم پوشی برتی جائے۔ چناں چہ یہاں بھی ملکی مفاد کو متعین کرنے کی کوشش میں سامراجی مفاد کے تقاضوں کو نظر انداز کیا گیا جو ہندوستان کے انگریز حکمرانوں کے لیے اہم تھے۔ رام چندر نے اپنی تمام تحریروں میں بیرونی حکومت کی ان خوبیوں کو پیش کرنے

کی کوشش کی، جو ملک کے لیے مفید ثابت ہوسکتی تھیں اور ان ہی کی بنا پر ہندوستانیوں کو انگریزی حکومت کا خیر خواہ بنانے کی کوشش کی۔ اس خیر خواہی کی بنیاد ملکی مفاد تھا اسی لیے یہ نقطۂ نظر بڑی حد تک قابل قدر تھا اور اسی کی بدولت بعض مفید نظریات کی تبلیغ شروع ہوئی۔ شخصی حکومت کے بارے میں رام چندر کا یہ بیان اسی نقطہ نظر کا مرہونِ منت تھا۔

> ''جب حکام ایسے ایسے کام کریں جن سے بجائے راحت کے رنج خلقت کو ہوتا ہے تو اس صورت میں خلقت پر یہ فرض نہیں رہتا کہ ان حکام کی فرماں برداری کریں۔ کیوں کہ یہ بات غلط ہے کہ خدا کی طرف سے حکام مقرر ہیں...... یہ بات سب کو جاننی چاہیے کہ حکام خلقت کے امن اور آرام کے لیے مقرر ہیں اور جب تک وہ اس مطلب کے لیے کوشش کریں جب ہی تک رعایا کو ان کا ادب اور فرماں برداری کرنی چاہیے......''[1]

ان الفاظ سے لوک (Locke) کے نظریہ معاہدہ عمرانی (Social Contract Theory) کے اثر کے ساتھ ساتھ مغلیہ شہنشاہیت کے دورِ زوال میں ظاہر ہونے والے حالات سے برگشتگی اور تبدیلی کی خواہش کا واضح اظہار ہوتا ہے۔ ''ضرورت حکام کے باب میں'' اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مغرب کے سیاسی فلسفے سے کس حد تک متاثر تھے۔

> ''اگر سب انسان منصف اور نیک و دیانت دار ہوتے اور کوئی ان میں سے ایسا نہ ہوتا کہ جو زبردستی کر کے دوسرے کے سرمایے کو لیا چاہتا تو اس صورت میں کچھ ضرورت حکام کی نہ ہوتی اور اس حالت میں کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے کی محنت کے ثمرے میں شریک ہو جائے لیکن انسان ایسا نہیں ہے کہ وہ فقط اپنی محنت اور مشقت کے ثمرے پر قناعت کر کے دوسرے کے سرمایے پر نگاہ نہ کرے۔ بہت سے ایسے آدمی ہیں کہ اگر حاکم ان پر تنبیہہ کرنے والا نہ ہو تو وہ کبھی محنت نہ کریں اور غیروں کے مال کو لوٹ لیا کریں اور چھین کیا کریں۔ بس اس صورت میں ہمیں یہ معلوم ہوا کہ حکام کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یعنی چند ایسے بھی مقرر کیے جائیں کہ ان کو انتظام کرنے

---

[1] ''ضرورت حکام کے باب میں'' فوائد الناظرین، یکم مئی ۱۸۴۸ء

کا اختیار ہو۔گنہ گاروں کو سزا دیں اور بے گناہوں کی حفاظت کریں......"[1]

مگر یہ حکام اسی وقت تک تسلیم کیے جاسکتے ہیں جب تک وہ رعایا کے دکھ درد سے غافل نہ رہیں۔جب وہ اپنے اس فرض سے بے توجہی برتنے لگیں تو رعایا کا یہ حق ہوجاتا ہے کہ وہ حکومت کو بدل دیں۔جائز حکومت وہی ہے جو رعایا کے مفاد کی امانت دار ہو۔

یورپ کا ایک اور نظریہ جس نے رام چندر کو متاثر کیا وہ اظہارِ رائے کا حق تھا۔رام چندر آزادیٔ خیال کو انسان کی بنیادی ضرورت سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک یہ صرف سیاسی نظام کی اصلاح کا ہی ذریعہ نہیں تھا بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی یکساں اہمیت تھی۔رام چندر کے خیال میں مغرب کی سیاسی وتہذیبی ترقی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہاں افراد کو اپنی حکومت اور اپنے سماج کی کمزوریوں پر تنقید کرنے اور ان کی اصلاح کی تدابیر اختیار کرنے کا پورا حق تھا۔

"سوائے بہت سے اچھے اور مفید قواعد کے جو فرنگستان میں جاری ہیں ایک یہ بہت خوب قاعدہ ہے کہ وہاں ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو رائے اس کی ہو، اس کو وہ بے خوف ظاہر کرسکتا ہے اور اخبارات مختلفہ میں چھپوا سکتا ہے اور اگر اس کی دانست میں کوئی حکم یا قانون بادشاہی نامناسب معلوم ہو تو اس کو اختیار ہے کہ وہ اپنی رائے کو مع اس کے وجوہات کے بذریعہ کسی خاص رسالے کے یا بذریعہ اخبار مشتہر کروادے۔اس صورت میں خواہ اس کی رائے بالکل خلاف بادشاہ اور وزیروں کے ہو پھر بھی کوئی اس پر زیادتی نہیں کرسکتا ہے۔"[2]

اس کے برعکس......

"......یہ قاعدہ ہندوستان اور ایران اور ملکوں شرقیہ میں بالکل مروج نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص ایران میں بادشاہ کے خلاف رائے بیان کرے تو وہ مع عیال واطفال اپنے کے گردن مارا جاتا ہے......"[3]

سیاسی اعتبار سے مشرقی ممالک کی پسماندگی کی وجہ اگر حکام کا نافذ کیا ہوا "دستور زباں بندی"

---

[1] "ضرورت حکام کے باب میں"، یکم مئی ۱۸۴۸ء
[2] "اظہار رائیوں کا" فوائد الناظرین، ۱۵/نومبر ۱۸۴۷ء
[3] "اظہار رائیوں کا" فوائد الناظرین، ۱۵/نومبر ۱۸۴۷ء

تھا تو ذہنی پسماندگی کا سبب ان کی اپنی عائد کی ہوئی وہ روایات تھیں جنھوں نے اسلاف کے فرمودات کو حرفِ آخر قرار دے کر مزید غور وفکر اور تصدیق و تردید کی راہیں مسدود کر دیں۔ رام چندر خیالات وعقائد کو بھی قانون تغیر کا تابع سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ہندوستان میں علم و آگہی کا فقدان، فرسودگیِ فکر کا نتیجہ تھا جس سے پیچھا چھڑائے بغیر ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ممکن نہیں۔

''واضح ہو کہ دنیا ایک قسم کی مجلس ہے اور اس میں مختلف عقل اور استعداد کے آدمی موجود ہیں۔ پس اب واسطے تحقیقات سچ بات کے یہ مناسب ہے کہ جو ایک یا دو آدمی ان میں سے کہیں اس کو ماننے اور اس کے قول پر کوئی شخص اعتراض نہ کرنے پاوے یا یہ اچھی بات ہے کہ سب آدمی اپنی اپنی رائے بیان کریں اور ایک دوسرے کی رائے پر اعتراض کریں اور اس ترکیب سے خوب اچھی طرح سے ایک بات کی حقیقت اور اس کا مغز دریافت کریں۔''[1]

مگر رام چندر کو اس بات کا افسوس تھا کہ ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک کے علما اور عوام قدیم کو جدید پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہی وجہ تھی کہ وہ ابھی تک ذہنی طور پر فلاطون و ارسطو کے عہد سے آگے نہیں بڑھ سکے جب کہ یورپ کے جدید فلسفہ وعلم کے مطابق بیشتر یونانی نظریات غلط ثابت ہو چکے ہیں:

''اکثر اہلِ ہند اور اہلِ ایران وغیرہ حکمت ارسطو کے موافق چلتے ہیں، وہ اس کے قول کو مانند پتھر کی لکیر کے سمجھتے ہیں۔ جو شخص اس کے قول کے خلاف کرے وہ بے وقوف شمار کیا جاتا ہے۔ پس یہ ہیچ اور تعصب کے سوائے کیا شمار کیا جائے اور جہاں یہ ہے وہاں عقل اور علوم اور فنون میں کس طور سے ترقی ہو سکتی ہے۔ حکمتِ ارسطو میں وہ وہ غلطیاں ہیں کہ ان کے باعث سے آدمی آج تک گمراہ ہیں اور حکمتِ حقیقی سے آج تک ناواقف ہیں اور علاوہ ازیں وہ اثر بد اس حکمت کی تحصیل سے غالباً حکمت یونانی پر ہوا ہے کہ اس راستے سے جو حکمتِ حقیقی کی طرف پہنچاتا ہے، نفرت کرتے ہیں...... جہاں قاعدہ اظہار رائے کا

---

[1] ''اظہار رائیوں کا''، فوائد الناظرین، ۱۵ر نومبر ۱۸۴۷ء

جاری نہیں ہے یعنی جہاں کوئی آدمی اپنی رائے کو بغیر خوف کے ظاہر نہیں کرسکتا ہے وہاں علوم اور فنون کو بھی ترقی نہیں حاصل ہوتی ہے......"[1]

رام چندر کے خیال میں 'جدید' کو 'قدیم' کے مقابلے میں قدرتی طور پر بہتر ہونا چاہیے کیوں کہ 'جدید' کے خزانے میں قدیم سرمایہ بھی محفوظ ہوتا ہے اور وہ اضافے بھی شامل ہوتے ہیں جو عہد بہ عہد ہوتے رہے ہیں۔ جدید و قدیم ایک ہی سلسلے میں بندھے ہوئے ہیں جو آج قدیم ہے وہی کسی وقت جدید تھا۔

"یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر وہ (لوگ) سب باتوں کو صرف اس واسطے برا جانتے ہیں کہ وہ نئی ہیں تو انھیں پرانی باتوں کو بھی برا جاننا چاہیے کس واسطے کہ کسی زمانے میں وہ بھی نئی تھیں۔"[2]

محض 'قدیم' ہونا کوئی خوبی نہیں 'جدید' ہونا ایک خوبی ہوسکتی ہے۔

"ہر زمانے میں عاقل اور بے وقوف پائے جاتے ہیں۔ زمانہ سلف میں سے عاقل اور بے وقوف تھے اور اب بھی ہر طرح کے آدمی موجود ہیں......جن آدمیوں کو زیادہ تجربہ ہوتا ہے ان کو زیادہ عقل ہوتی ہے لیکن تجربہ گذشتہ کا حال کے آدمیوں کو بذریعہ کتب تاریخ کے حاصل ہے۔ خلاف اس کے زمانہ سلف کے آدمیوں کو زمانہ آئندہ کا تجربہ نہیں ہوسکتا تھا......"[3]

جدید عہد کی ایک اور خصوصیت، اجتماعیت کی طرف بڑھتا ہوا رجحان تھا۔ عہد عتیق کا انسان، جس کی زندگی کا تمام تر انحصار خود اپنے دست و بازو پر تھا، اب بہت بدل چکا تھا۔ وہ اب بعض اعتبار سے پہلے سے زیادہ طاقتور تھا اور بعض اعتبار سے پہلے کے مقابلے میں کمزور۔ اب اس کے دست و بازو پر صرف اسی کا دارومدار نہیں تھا بلکہ دوسروں کا بھی ان پر اتنا ہی حق تھا۔ اسی طرح اس کی اپنی قوت بھی دوسروں کی اعانت کی محتاج تھی۔ مختلف افراد کے مسائل آپس میں اس طرح سے اُلجھ گئے تھے کہ انھیں سلجھانے کے لیے تمام افراد کا مجموعی طور پر کوشاں ہونا

---

[1] "اظہار رائیوں کا" فوائد الناظرین ۱۵رنومبر ۱۸۴۷ء
[2] ایضاً ایضاً
[3] ایضاً ایضاً

ضروری تھا۔ پھر ایک اُلجھاؤ کے دور ہونے سے سو اُلجھاؤ اور پڑنے لگے تھے۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا تھا افراد کے پچھلے اختیارات میں کمی واقع ہوتی جاتی تھی۔ بااختیار ہونے کا ترقی یافتہ اور واحد طریقہ یہی تھا کہ افراد ''سماج'' میں منظم ہوجائیں۔ اب سماج سے بے تعلقی میں فرد کی مجبوری اور سماج سے وابستگی ہی میں فرد کی مختاری تھی۔ رام چندر کے خیال میں دنیا جو ایک ''مجلس'' تھی اسی صورت میں غموں کے بوجھ سے نجات حاصل کرسکتی تھی جب افراد کے غم ہلکے ہوں مگر یہ انفرادی غم و آلام اجتماعی طریق کار اختیار کیے بغیر دور نہیں ہوسکتے۔ افراد کی صلاحیتیں اور وسائل محدود ہوتے ہیں اور ایک خاص حد سے آگے ان کی رسائی نہیں ہوسکتی لیکن ان ہی قوتوں کو مجتمع کردیا جائے تو اس سے وجود میں آنے والی اجتماعی قوت بے پناہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انفرادی خواہشات و عزائم کو پورا کرنے کے لیے اجتماعی تنظیم کے تحت آکر سرگرم عمل ہونا افراد کے مفاد کے عین مطابق ہے۔ رام چندر اس اجتماعی تنظیم کو ''مجمع'' یا ''مجلس'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اُنھوں نے انگلستان اور ہندوستان کی مختلف سوسائٹیوں کی کامیابیوں کی مثالیں پیش کرکے متعدد مسائل کے حل کے لیے عملی تجاویز پیش کیں۔

> ''میری دانست میں یہ قاعدہ مقرر ہو تو بہت مناسب ہے کہ دہلی میں مثلاً ہزار گھر کائستھوں کے ہیں۔ وہ سب موافق اپنی اپنی آمدنی کے کچھ روپیہ مثلاً تیسواں حصّہ اپنی آمدنی کا ایک جائے جمع کرایا کریں اور ایک شخص مقرر کو اپنا خزانچی مقرر کریں اور جب کوئی شخص مرجائے اور اس کا کنبہ کچا ہو تو بڑے بڑے شخص برادری کے جمع ہوکر اس کے کنبے کے لیے کچھ واسطے گزارے کے مقرر کردیں اور یہی قاعدہ ہر قوم اور شہر میں جاری ہوجائے تو دیکھو کس قدر انسان کو آسائش ہوجائے اور باوجود اس فائدہ عظیم کے دیکھو ہر شخص کو کس قدر کم خرچ کرنا پڑتا ہے......''[1]

لاچار عورتوں، بیواؤں اور یتیموں کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی اُنھوں نے اسی قسم کی تجاویز پیش کیں اور اس سلسلے میں مختلف اجتماعی کوششوں کو بہت سراہا۔

صنعتی دور میں پیدا ہونے والے معاشی نظریے اور ادارے جو مغرب میں نشوونما پارہے تھے ہندوستان کے لیے خاص طور سے اہم تھے مگر یہاں کے جاگیردارانہ معاشی ڈھانچے میں یہ سرمایہ دارانہ نظریات اور طریق عمل اس وقت تک کھپ نہیں سکتے تھے جب تک کہ یہاں کے

---

[1] ''مجلسوں کے بیان میں'' فوائد الناظرین، ۶؍ مارچ ۱۸۴۸ء

حالات میں تبدیلی نمودار نہ ہو مگر دوسری اقوام کی طرح ہندوستانیوں کے لیے بھی صنعتی دور کے تقاضوں کو سمجھنا اور انھیں پورا کرنا ضروری تھا۔ صنعتوں کا فروغ، صنعتی سرمائے کو ظہور میں لانے اور بڑھانے والے اداروں پر منحصر تھا۔ رام چندر کو ان سب حقائق کا پورا احساس تھا۔ چناں چہ اُنھوں نے ''بنک'' جیسے بنیادی معاشی ادارے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستان میں اس کے قیام پر زور دیا۔ اس وقت تک یہاں مہاجنی طریقہ رائج تھا اور لوگ جدید بنکوں کے اصولوں اور فائدوں سے تقریباً ناآشنا تھے۔ اس سلسلے میں رام چندر کا مضمون جس کا عنوان تھا ''کوٹھی صرافی کی اس صورت جب وہ واسطے قرض دینے روپے کے مقرر ہو'' جو 'فوائدالناظرین' میں شائع ہوا تھا، جدید ضروریات پر ان کی گہری نظر کا ثبوت پیش کرتا ہے۔[1]

محنت کا وہ نظریہ بھی جو مشینی دور سے قبل عام طور سے تسلیم کیا جاتا تھا اور جو جاگیردارانہ اقتصادیات کی بنیاد تھا، رام چندر رَد کر چکے تھے۔ وہ محنت کا تخلیقی ہونا لازم سمجھتے تھے۔ وقت اور قوت کی بچت مشینی دور کی ''محنت'' کا خاصہ تھا جسے ان کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔

صرف حسن کو تخلیق کرنے والی ''محنت'' جو افزائش دولت کے نقطہ نظر سے سُست رفتار ہو، راحتِ قلب ونظر تو ہو سکتی ہے، معدنِ سیم وزر نہیں بن سکتی۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے قلب و نظر کی ساری دولت اس کے ذخیرہ سیم وزر کے ساتھ لٹ چکی تھی اس لیے یہی دولت اب ملک کی بنیادی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں رام چندر کے یہ الفاظ ان کے نقطۂ نظر کی پوری وضاحت کرتے ہیں:

> ''پہلے زمانے میں اکثر لوگوں کی طبیعت ان مشکلات کو حل کرنے کی طرف مائل بہت رہتی تھی جن کے حل کرنے میں فائدہ بہ نسبت محنت کے بہت کم متصور ہے۔ مختصر سا بیان اس کا یہ ہے کہ ایک محقق کہتا ہے کہ پہلے زمانے میں ایک گاڑی ہاتھی دانت کی ایسی چھوٹی بنائی گئی تھی کہ مکھی کے پر کے نیچے چھپ جاتی تھی...... ایک چھوارے کی گٹھلی پر ایک سو چوبیس سر کی شبیہہ اس خوبی سے منقش تھی کہ بعض ان میں کی جیسے کہ بادشاہ کی شبیہہ وغیرہ آنکھ سے بخوبی دکھائی دیتی تھیں...... ان باتوں میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان نے اگلے زمانے میں اپنی محنت اور وقت ان باتوں میں جن سے کہ کچھ فائدہ متصور نہیں صرف کیا ہے۔

---

[1] فوائدالناظرین، ۱۰/جون ۱۸۵۰ء

زمانہ حال میں اس قدر محنت اور مشقت اور وقت ان جُزوی باتوں میں چنداں صرف نہیں ہوتا ہے۔ زمانہ حال کے اشخاص کوئی نہ کوئی مطلب بزرگ ہر کام کے انصرام میں مدِ نظر رکھتے ہیں...... انسان کو صرف محنت اور استقلال ہی نہ چاہیے بلکہ اس کو لازم ہے کہ ایسے مطالب کی طرف کہ جن سے فائدہ عام متصور ہو توجہ کرے۔ بعضے صاحب ساری عمر کو ایک خط کی مشق میں صرف کر کے اس میں کمالِ حاصل کرتے ہیں۔ ان صاحبوں سے پوچھا چاہیے کہ اگر آپ بقدرِ احتیاج لکھنا سیکھ لیتے اور اس وقت کو تحصیل علوم میں صرف کرتے تو کیا خوب ہوتا......" [1]

ہندوستان کے اہلِ جاہ وحشم کی زندگی سے رام چندر سخت بدظن تھے۔ محنت و مشقت سے رئیسوں کی نفرت اور تضیع اوقات میں احساس راحت کی وجہ یہ تھی کہ وہ دوسروں کی محنت کے ماحصل کو اپنا حق سمجھتے تھے، جو رام چندر کے نقطہ نظر سے سخت ناانصافی تھی۔ رام چندر کے نزدیک "محنت" اخلاقی اور معاشی دونوں پہلوؤں سے مفید اور قابل قدر تھی۔ ان کے خیال میں "محنت بہ نفسِ خود اگر اس کے واسطے انعام نہ ہو، سُستی سے بہتر ہے۔" [2] محنت کی سماجی حیثیت کے بارے میں رام چندر کا خیال تھا:

"اگر اس طرح کا ربط دیا جاوے کہ آدمی کو یہ اختیار حاصل ہو کہ آیا وہ محنت کرے یا نتائج سستی سے تکلیف اُٹھاوے تو اس کے حق میں کوئی بے انصافی نہیں ہے مگر برخلاف اس کے اس صورت میں بڑی بے انصافی ہے کہ جب ہم کسی آدمی سے اس کا مال جس کے واسطے اس نے محنت کی ہو، لے کر کسی اور شخص کو جو سست اور کاہل رہتا ہو دے دیویں۔" [3]

وہ ملک کے معاشی نظام میں جو زبردست تبدیلی چاہتے تھے اس کی حقیقت ہندوستانیوں کے لیے آج بھی ایک خواب سے زیادہ نہیں۔ وہ نئے نظام کے لیے دو بنیادی اصول لازمی سمجھتے تھے۔

"اوّل تمام مال لوگوں میں تقسیم ہونا چاہیے دوم حق مال محفوظ رہے یعنی

---

[1] "حال توجہ سلف کا" فوائد الناظرین، ۳ر مئی ۱۸۴۷ء

[2] "ترکیب جس سے کہ آدمی محنتی ہو جاویں" فوائد الناظرین، ۵ر نومبر ۱۸۵۰ء

[3] ایضاً

کوئی کسی کے مال کو زبردستی نہ چھینے۔ اگر مال تقسیم ہووے تو ہر ایک
چیز کسی نہ کسی سے علاقہ رکھے گی اور ہر ایک شخص اس پر جسے وہ محنت
سے کمائے گا، قابض رہے گا اور اگر اس نے محنت نہ کی ہوگی تو وہ کسی
چیز کا مالک نہ ہوگا اور اگر حق مال محفوظ رہے تو کوئی آدمی نہ تو چرا اور نہ
لوٹ سکے گا اور اسے کوئی وسیلہ بجز محنت کشی کے نہ رہے گا۔"[1]

ان کا تقسیم مال کا تصور ہندوستان کے چند امیروں اور رئیسوں کے ہاں دولت کی فراوانی اور عام باشندوں کی فلاکت کے احساس کی بنا پر وجود میں آیا تھا اور حقِ ملکیت اور قانونِ تحفظ کا خیال مغربی حالات و نظریات کے مطالعے کی دین تھا۔ وہ جاگیردارانہ نظام کو تاراج کرنے کے لیے ان کے خزانوں میں بھری ہوئی بے مصرف دولت کو نکال کر ایسے ہاتھوں میں لانا ضروری سمجھتے تھے جو اسے اپنی محنت کے ذریعے مزید دولت پیدا کرنے میں صرف کرسکیں اور ایسے ہی لوگوں کو ان کے نزدیک حقِ ملکیت ملنا چاہیے تھا۔ "محنت" سے حاصل کی ہوئی اس ملکیت کے تحفظ کا فرض حکومت پر عاید ہوتا تھا۔

رام چندر کا یہ نظریہ اس اعتبار سے قابلِ قدر ہے کہ اُنھوں نے اپنے دور کے مسائل کی روح کو سمجھا، حقیقت پسندانہ اور عملی نقطہ نظر سے ان پر غور کرنے کے بعد ایسا حل پیش کیا جو اس دور میں قابلِ عمل تھا۔

سماجیات، سیاسیات اور معاشیات پر خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے رام چندر نے جب بھی غور کیا تو ان باتوں میں اشتراکی تصورات کی بھی جھلک آگئی مگر بنیادی طور پر وہ "انفرادیت" کے نظریے سے ہی متاثر تھے۔ سرمائے کو وہ محنت کا ایک جزو سمجھتے تھے شاید اسی لیے اُنھوں نے "محنت" اور "دولت اندوزی" کے تضاد کو تو دیکھ لیا جو ہندوستان میں نمایاں تھا مگر "محنت" اور "سرمایے" کے اس تضاد کو نظر انداز کر دیا جو مغربی نظام اور نظریات میں خود ان کے عہد میں نمودار ہو چکا تھا۔

رام چندر انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس کے ذریعے اُنھوں نے مغربی تمدن، تاریخ، معاشیات اور سیاسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے ذہن میں اہم مغربی نظریات کے خاکے موجود تھے۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں مختلف نظریات کی آمیزش نظر آتی ہے۔ وہ اپنے دور کے اعلیٰ ترین سیاسی، معاشی اور اخلاقی اقدار کے حامی تھے۔ ایک ماہرِ معاشیات یا ماہرِ

---

[1] "ترکیب جس سے کہ آدمی محنتی ہو جاویں" فوائد الناظرین، ۵ر نومبر ۱۸۵۰ء

سیاسیات کی طرح وہ اپنی ہر بات کی مکمل توضیح نہیں کرسکے مگر عمومی اعتبار سے ان کے خیالات بڑے جان دار، قابلِ عمل اور اس دور کے تقاضوں کے عین مطابق تھے۔

سماجی اصلاح سے متعلق رام چندر کے خیالات خاص طور سے قابل ذکر ہیں ان کے اخبار اور رسالے کا ایک بڑا حصّہ سماجی اور اخلاقی مضامین کے لیے وقف تھا اور عملی طور پر بھی وہ اس راہ میں زندگی بھر سرگرم رہے۔ اس سلسلے میں ان کے علم وفضل کے ساتھ ساتھ ذاتی زندگی کے تجربات کو بھی بڑا دخل تھا۔ ان نقصانات سے جن سے کہ وہ خود یا ان کے اعزا دوچار ہو چکے تھے، وہ دوسروں کو بھی آگاہ کرنا چاہتے تھے اور اسی لیے اُنھوں نے ایسے موضوعات پر مفصل، مدلل، مثالوں سے بھرپور، تلخ وترش اور طنز آمیز مضامین لکھے جن کی اہمیت آج بھی کسی اعتبار سے کم نہیں ہوتی۔

سماجی زندگی میں روایت کی جڑیں بڑی مضبوط ہوتی ہیں، انھیں اُکھاڑ پھینکنے کے لیے صرف اصلاحی کوششیں ہی کافی نہیں اس کے لیے سیاسی ومعاشی نظام میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چوں کہ رام چندر کے عہد میں یہ بنیادی تبدیلیاں بہت آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی تھیں اس لیے سماجی روایات وتوہمات کی بیخ کنی کرنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ سماجی تبدیلیوں کی ضرورت کو محسوس کرنے والے لوگ کم تھے اور تغیرات کا مقابلہ کرنے والے قناعت پسند حضرات بے شمار، اسی لیے اصلاح کے لیے بلند ہونے والی آوازیں کانوں پر اثر کم کرتیں، فضا میں چند لہریں ضرور چھوڑ جاتی تھیں۔ چناں چہ رام چندر بھی اپنے سرد مہر مخاطبین کی ہر نئی چیز سے نفرت کے شاکی تھے۔

> ”ایک نئی بات کا رواج ہونا نہایت مشکل ہے اور ایک آدمی کی کوشش کفایت نہیں کرتی۔ جب تک کہ کئی آدمی متفق نہ ہوں اور عالم اس کی مدد نہ کریں۔ بعض نئی بات سے نہایت نفرت کرتے ہیں بلکہ نیا ہونے ایک رسم کو ایک وجہ برخلاف اس رسم کے رواج کے تصور کرتے ہیں...... جاہل اور احمق آدمی کہا کرتے ہیں کہ یہ نئی بات نہیں کرنی چاہیے کس واسطے کہ ہمارے بزرگ ایسی رسم نہیں کیا کرتے تھے۔ یہ شخص لفظ بزرگ پر غلطی کھاتے اور یہ خیال نہیں کرتے کہ جو اشخاص گزر گئے وہ بلحاظ تقدم بزرگ کہلاتے ہیں اور نہ کہ یہ کہ وہ حال کے آدمیوں سے عقل اور علم میں بھی بالضرور زیادہ تھے۔ ہزارہا آدمی

بالفعل موجود ہیں کہ ان کے بیٹے ان سے زیادہ عقل رکھتے ہیں۔ پس
کیا ضرور ہے کہ جو رسم قدیم سے چلی آتی ہو وہ خواہ مخواہ مفید ہو۔''[1]

رواج کے مطابق عورتوں کی تعلیم مذہبی اور اخلاقی نقطہ نظر سے غلط سمجھی جاتی تھی اور عورتیں عام طور پر زندگی بھر ان پڑھ رہا کرتی تھیں۔ رام چندر اس رواج کے سخت مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ''اگر تحصیلِ علوم سے درستی اخلاق اور زیادتی عقل کی واسطے مردوں کے متصور ہے تو وہ بے شک واسطے عورتوں کے بھی متصور ہوگی۔''[2] مگر یہ حقیقت عام طور پر نظرانداز کی جاتی تھی اور بڑے بڑے علما اور فضلا تعلیم نسواں کو ناجائز سمجھتے تھے۔ رام چندر ان حالات سے سخت نالاں تھے:

''بہت سے منشی اور مولوی اور عالم اور فاضل اس شہر دہلی میں ہیں لیکن اس ظاہر فائدے کی بات پر وہ ذرا غور نہیں کرتے۔ کیا جانے ان کے مزاج میں کیا سستی اور کیا کیا تعصب واسطے طریقہ قدیم کے ہے کہ وہ اس پر ذرا خیال نہیں کرتے۔ بعض اوقات وہ خود عورتوں کی بے وقوفی اور حمق سے تنگ آجاتے ہیں اور اکثر ان کا گلہ کیا کرتے ہیں لیکن اس بات پر وہ کبھی غور نہیں کرتے کہ باعث اسی حمق اور جہالت مستورات کا بے علمی ہے......''[3]

فضول اور رسمی تقریبات پر بے دریغ وقت اور روپیہ ضائع کرنا بھی جہالت اور قدامت کی نشانی تھی۔ جس ملک کے باشندوں کی کثیر تعداد کھانے کپڑے کو ترستی ہو وہاں خرافات سے اس قدر گہری دل چسپی مضحکہ خیز بھی تھی اور تکلیف دہ بھی۔ اس صورت حال سے برگشتگی کا اظہار کرتے ہوئے رام چندر لکھتے ہیں:

''یہاں کے لوگ خواہ ہندو خواہ مسلمان لیکن ہندو خصوصاً شادی میں اس بے رحمی سے روپیہ خرچ کرتے ہیں کہ گویا وہ کچھ شے نہیں۔ روپیہ کو کوڑی اور اشرفی کو پیسہ شمار کرتے ہیں۔ فی الحقیقت یہاں کے لوگ بڑے فیاض (ہیں) دولت کو اس قدر ناقدر شمار کرتے ہیں۔ لیکن ذرا

---

[1] فوائد الناظرین، ۲۵؍جنوری ۱۸۴۷ء

[2] فوائد الناظرین، ۲۵؍جنوری ۱۸۴۷ء

[3] فوائد الناظرین ۲۵؍جنوری ۱۸۴۷ء

ٹھہریے اور کسی بنیے کے پاس جائیے اور اس سے کچھ قدر قلیل مدد مانگیے ......اور دیکھیے کہ وہ کیا جواب دیتا ہے اور کس قدر فیاضی سے آپ کے پیش نہ آتا ہے......لیکن جس وقت شادی ہوتی ہے اس وقت سارے شہر میں دھوم مچ جاتی ہے اور نقار خانہ تیار ہوتا ہے اور روشنی ہوتی ہے۔ادھر کئی طائفوں کے ناچ و رنگ ہو رہے ہیں اور دعوتیں ہزار ہا آدمیوں کی روز ہوتی ہیں اور اگر پوچھیے کہ کس شخص عظیم الشان کے یہاں یہ شادی ہے تو جواب پاتے ہیں کہ فلانے ٹھٹھیرے یا فلانے پڑچونئے کے ہاں...... جب یہ حالت ٹھٹھیروں اور پڑچونیوں کی ہوتی ہے تو امیروں اور رئیسوں کا تو کیا کہنا چاہیے۔"[1]

سماجی دباؤ کے اثر سے اس قسم کی رسوم فرائض بن گئی تھیں اور لوگوں سے عام طور پر یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ ایسی تقریبات میں اپنے سارے ارمان نکال لیں گے۔ جن لوگوں میں اس کی استطاعت نہیں ہوتی وہ قرض لے کر یا گھر بار رہن رکھ کر سماج میں اپنی حیثیت بلند کرنے یا کم از کم برقرار رکھنے کے لیے ان فضولیات پر روپیہ صرف کرتے تھے۔ رام چندر کے عہد کی طرح اس قسم کی باتوں کو آج بھی وضع داری کا تقاضا سمجھا جاتا ہے "اور جو کوئی اپنی ذرا عقل اور ہوشیاری کو کار فرماتے ہیں تو انھیں ان کے بھائی برادر دوست وغیرہ سب طنز کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو کیا کم بخت اور شوم ہے۔ پس اس طور سے ایک دوسرے کے خوف سے سب شخصوں کو عقل مند خواہ بے وقوف، شادیوں میں زیادہ روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے اور اس ترکیب سے سب صاحب ایک دوسرے کی بربادی اور فقیری کے مددگار اور معاون ہوتے ہیں۔"[2]
چھوٹی عمر کی شادی کا تجربہ خود رام چندر کو ہو چکا تھا۔ان کی نشو و نما پر اس کا گہرا اثر پڑا، جہیز اور دوسری رسومات کی بدولت انھیں جو نقصان اُٹھانا پڑا تھا اس کا انھیں زندگی بھر احساس رہا۔اسی لیے اپنی تحریروں میں وہ اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کر سکے۔ جہیز جو عموماً دولت سمیٹنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا رام چندر کے نزدیک گھاٹے کا سودا تھا۔ جس کا ازدواجی زندگی پر بڑا ناخوش گوار اثر پڑتا تھا:

"جب ایک لڑکے کی چھوٹی عمر میں شادی کی جاتی ہے اور بعد چند روز کے یہ سب لاڈ جاتا رہتا ہے اور وہ یا تو بڑے لاڈ اور ناز سے اور چند

---

[1] "بہت خرچ کرنا شادیوں میں" فوائد الناظرین، یکم دسمبر ۱۸۴۵ء
[2] "بہت خرچ کرنا شادیوں میں" فوائد الناظرین، یکم دسمبر ۱۸۴۵ء

روز شادی کے میں خوب آسائش اور شان و شوکت سے رہا یا پیدل ساتھ پھٹی ہوئی پوشاک کے گلیوں میں جوتی چٹخاتا پھرتا ہے۔ وہ دلہن جو بڑے ناز اور لاڈ سے اپنے باپ کے گھر اور اپنی خسرال میں چند روز کے واسطے رہی تھی اب مفلسی کا مزا یکایک چکھتی ہے اور وہ زیور اور پوشاکیں جو اس کو بروز شادی کے اس کے بڑے اور بزرگوں نے عطا کی تھیں۔ سرے بازار (سرِ بازار) میں واسطے فروخت کے بھیجی جاتی ہے تاکہ روٹی ہاتھ لگے اور قالب میں جان باقی رہے۔ کیا خوب بات ہوتی کہ روپیہ جو شادی میں خرچ ہوتا ہے دولا (دولہا) اور دلہن کو دیا جائے کہ بعد شادی کے اس پر گزران کریں۔"[1]

ملک کی اِن خطرناک رسوم کا آنے والی نسلوں پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ ایسے ماحول میں جو بچے آنکھ کھولتے ہیں وہ بڑے ہوکر بھی کسی کام کے نہیں رہتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہالت اور قدامت پرستی میں اضافہ رام چندر کے خیال میں اسی ماحول کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ چناں چہ اُنھوں نے تعلیم و تربیت کے رائج الوقت طور وطریق پر سخت تنقید کی اور ایسے مضامین کے ذریعے بچوں کی نفسیات، ان کے فطری میلان اور ضروریات اور والدین کے فرائض سے ان کو آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ ان مضامین میں اُنھوں نے بچوں کی تربیت کے جو اصول ڈیڑھ سو ڈیڑھ سو سال قبل پیش کیے ان کی اہمیت کا احساس اس ملک میں اب شروع ہوا ہے۔ مثلاً یہ خیالات کہ بچوں کو ڈرانا دھمکانا، ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار یا سختی کرنا، لالچ دے کر ان کی ضد پر قابو پانا، اپنی بات منوانے کے لیے ان سے جھوٹے وعدے کرنا بچوں کو بگاڑ دیتا ہے۔ بچوں کا ذہن بہت جلد اپنے ماحول سے خصوصاً والدین اعزا و اقربا سے اثر قبول کرتا ہے، اس لیے والدین کو چاہیے کہ بچوں کے سامنے اپنے اقوال و افعال میں احتیاط برتیں اور اپنے برتاؤ اور رکھ رکھاؤ سے ان کی ذہنی و جسمانی نشوونما میں معاون ثابت ہوں، آج بھی تربیت کے بنیادی اصول تصور کیے جاتے ہیں۔

توہمات پر اعتماد اس دور کی ایک اور خصوصیت تھی جو علم کے فقدان اور بزرگوں سے سنی ہوئی باتوں پر بے سوچے سمجھے یقین کر لینے سے وجود میں آئی تھیں۔ جدید سائنس سے واقفیت کی بدولت رام چندر ان بے بنیاد عقائد کی حقیقت جان گئے تھے۔ چناں چہ اُنھوں نے سائنسی تجربات اور مشاہدات پر مبنی عقلی دلائل کے ذریعے ان توہمات کے سحر کو توڑ کر انھیں ان کے

---

[1] بہت خرچ کرنا شادیوں میں"، فوائد الناظرین، یکم دسمبر ۱۸۴۵ء

سچے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ چھلاوے کے بارے میں ان کے یہ الفاظ بہترین مثال ہیں۔

> ''درحقیقت اس کی یہ اصل ہے کہ گاؤں اور جھیلوں اور دلدل دار زمینوں میں سے اور ایسے مکانوں میں سے جہاں پانی بند ہوتا ہے اور پتے درختوں کے سڑتے ہیں، ایک قسم کی ہوا جس کو ''گاز'' کہتے ہیں، نکلتی ہے اور یہ گاز جس وقت اس ہوائے خالص سے جس کو ہم تنفس کرتے ہیں، ملتی ہے تو وہ مثل شعلے کے روشن ہوجاتی ہے اور ہوا کے ساتھ یہ شعلہ تھوڑی دور تک جاتا ہے۔ اس قسم کے شعلے بعض اوقات قبرستان اور مرگھٹوں میں سے جہاں ہڈیں ہوتی ہیں، نمودار ہوتے ہیں اور اس شے کو ہمارے بعض ہم وطن بھوت وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں......''[1]

طبیعات وغیرہ کے مطالعے کی بدولت مادی حقائق کا ادراک حاصل کرنے کے باوجود رام چندر مابعدالطبیعات سے یکسر غافل نہیں ہوئے تھے۔ چناں چہ ان کی بہت سی تحریروں میں یہ اندازِ فکر بھی خاصا نمایاں ہے۔ مختلف مسائل کے سائنسی وجوہ پر کامل یقین رکھتے ہوئے بھی وہ ان پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے غور کرنے میں گریز نہیں کرتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق انسان کو آزمانے اور اسے اپنی برائیوں سے باخبر کرنے کے لیے خدا اس پر گاہ گاہ مصیبتیں نازل کرتا رہتا ہے۔ چناں چہ بیماری کو اُنھوں نے ایک مضمون میں قدرتی اصلاح کا ایک ذریعہ قرار دیا۔ ان کے نزدیک موت بھی ''واسطے رفع تکلیف ذی حیات کے خدا نے پیدا کی ہے۔'' اس کے ذریعے انسان دوسری دنیا میں پہنچتا ہے جہاں اس کو اس دنیا کے اعمال کا خدا کی طرف سے اجر ملتا ہے۔ اسی لیے انسان کو چاہیئے کہ وہ عاقبت کا خوف کھائے اور نیکی کی راہ اختیار کرے۔

رام چندر کی روحانیت دوسروں سے قطعاً مختلف تھی۔ وہ اسے اپنے علم اور عقل سے بعید نہیں بلکہ ہم کنار سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں مذہب کا تصور مفکرانہ تھا، جو ان کے سیاسی و معاشی افکار سے مطابقت رکھتا تھا۔ فلاحِ دنیوی اور نجاتِ اُخروی میں وہ کوئی تضاد نہیں پاتے تھے بلکہ علم و عقل اور ماڈی ترقی کو وہ روحانی اور اخلاقی لحاظ سے بھی اہم ٹھہراتے تھے۔ مذہب، سیاست، معاشیات اور سائنس ان کے ہاں ایک ہی نظامِ فکر کے اہم اور مربوط اجزا تھے۔

فکری اعتبار سے رام چندر اسی اصلاحی نقطہ نظر کے حامل تھے جس کا راجہ رام موہن رائے نے

---

[1] ''چھلاوہ''۔ فوائد الناظرین، ۲۰ر اکتوبر سنہ ۱۸۵۰ء

پہلے پہل بنگال میں پرچار کیا اور جسے سرسید احمد خاں نے اُنیسویں صدی کے آخر میں پھیلایا۔ یہ اصلاحی تحریک ہندوستان میں مغربی خیالات کے آغاز کے ساتھ وجود میں آئی اور اس وقت تک حاوی رہی جب تک برطانوی حکومت کے ارادے پورے طور پر واضح نہ ہوگئے۔ اپنے دور میں اس اصلاحی تحریک نے اہم سیاسی و سماجی خدمات انجام دیں۔ ہندوستانی قوم پرستی کا آغاز دراصل اسی کی بدولت ہوا۔

رام چندر اس وسیع تحریک سے ذہنی طور پر وابستہ ہونے کے باوجود راجہ رام موہن رائے اور سرسید احمد خاں سے ایک لحاظ سے مختلف تھے۔ راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی تحریک کا مقصد خاص طور پر ہندوؤں کی سماجی اصلاح تھا جب کہ سرسید خصوصاً مسلمانوں سے مخاطب تھے۔ اس کا ایک سبب دونوں مفکرین کا مذہبی رجحان بھی تھا وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی توہم پرستی سے نالاں تھے اور اپنے مذاہب کی تعبیر نئے حقائق و مشاہدات کی روشنی میں کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے دونوں کا اپنے ہم مذہبوں سے علاحدہ علاحدہ مخاطب ہونا قدرتی امر تھا مگر رام چندر جس تحریک سے متعلق تھے وہ بنیادی طور پر ایک تعلیمی ادارے سے متعلق تھی اور ملک کے مشترک سماجی و سیاسی مسائل سے سروکار رکھتی تھی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحانی پستی کو ملک کی عام ذہنی پستی کا نتیجہ سمجھتی تھی۔ یہی سیکولر نقطہ نظر رام چندر کو بھی دوسرے اصلاح پسند مفکرین سے ممتاز کرتا ہے۔ سائنس کی تعلیم اور مادّی ضروریات نے انھیں مذہب کا ایک نیا نقطہ نظر عطا کیا تھا۔ وہ مذہب پر عقلی اور منطقی اعتبار سے غور کرتے تھے۔ خدا کے وجود کے سوا ہر عقیدے، رسم اور روایت کو وہم سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک تمام ہندوستانی مذاہب، خواہ ہندومت ہو یا اسلام، ذہنی پسماندگی کے سبب ناقابل تسلیم ہو چکے تھے اور ان کی اصلاح کا طریقہ صرف یہ تھا کہ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو جدید فلسفہ وعلم کی طرف مائل کرنے کی یکساں اور مشترک کوشش کی جائے۔ جس دور میں قوم پرستی کا تصور تشکیل پا رہا تھا، ملک کے مسائل کا یہ شعور غیر معمولی ذہانت کی دلیل ہے۔

قبول عیسائیت کے بعد رام چندر کی مذہبی مشغولیات اس قدر بڑھ گئیں کہ پھر انھیں ملک کے دوسرے مسائل پر یکسوئی کے ساتھ غور کرنے کا موقع نہ مل سکا اور وہ جوش و خروش جو 'فوائد الناظرین' اور 'محبِ ہند' کے مضامین میں ملتا تھا ماند پڑ گیا۔ 'فوائد الناظرین' کا اجرا سنہ ۱۸۴۵ء میں ہوا تھا اور سنہ ۱۸۵۵ء میں وہ 'محبِ ہند' کے ساتھ ہی ساتھ بند ہوگیا۔ اس طرح ان کی زندگی کا یہ اہم دور ۲۴ سال کی عمر سے صرف ۳۴ سال کی عمر تک رہا اور جوانی کا جوش پختگی کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی دوسری راہ پر لگ گیا۔

پانچواں باب

تاریخ ادب میں رام چندر کا مرتبہ

دہلی کالج اور رام چندر سے قبل، اردو نثر میں اسالیب کا تنوع بہت کم تھا۔ اس میں یا تو مذہبی مواعظ و مباحث کا طرز رائج تھا یا تمثیلوں اور داستانوں کا۔ مذہبی مواعظ و مباحث کی زبن عربی و فارسی سے مغلوب تھی مگر تبلیغ دین کے لیے عام بول چال کی زبانوں کو بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اردو نثر کے قدیم ترین نمونے اس نثر میں ملتے ہیں، مگر ان کا مقصد تخلیق ادب نہیں تبلیغ دین تھا اس لیے یہ قدیم تصانیف، ادب سے زیادہ زبان کی ابتدائی ساخت اور اس کے ارتقا کی نشان دہی کرسکتی ہیں۔ تمثیلیوں اور داستانوں کی نثر پر بھی فارسی کا غلبہ تھا مگر دکن میں "سب رس" جیسی عام بول چال کی زبان میں لکھی جانے والی کتابیں بھی ملتی ہیں۔ اور قدیم ادبی نثر کے اعلیٰ نمونے دراصلاسی قسم کی تصانیف میں نظر آتے ہیں۔ مگر یہاں نثر موضوع کے اعتبار سے بہت پیچھے تھی۔ اگر مذہبی طرز پند و نصائح کے زیر اثر لطف و کیف سے خالی تھا تو داستانوں کی مسرت آفرینی انگیزی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ جس نظام کے تحت ان دونوں کی نشو و نما ہوئی تھی اس کے بدل جانے کے بعد یہ اسالیب و موضوعات بھی نئے روحانی و ذہنی کرب و اضطراب کا مداوا نہ بن سکے۔ اب دنیاوی مسائل کا حل نہ دنیا سے بے نیاز یمیں تھا، نہ وہ خانقاہوں میں مل سکتا تھا اور نہ خواب و خیال کی پناہ گاہیں ذہن و قلب کو دائمی سکون بہم پہنچا سکتی تھیں۔ اب ایسے ادب کی ضرورت تھی جو نئے مصائب کا غم غلط کر کے نئے حادثات کا خوف دل سے نکال سکے اور ان کے مقابلے کا حوصلہ و جوش عطا کر سکے، چناں چہ زمانے کی تغیرات کا احساس رکھنے والے اذہان کا قدیم طرز کی ادبی نگارشات سے غیر مطمئن ہونا لازمی تھا۔

مگر اردو نثر ابھی اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی کہ وہ نئے رجحانات کا فوراً ساتھ دے سکتے۔ اردو اس وقت عام بول چال کی زبان تھی۔ علمی، درسی، رسمی اور سرکاری زبان فارسیت ھی۔ اردو میں تفریحاً محض ہنسنے ہنسانے کے لیے کبھی کچھ کہہ سن لیا جاتا تھا، اور صرف بے تکلف محفلوں میں محض تفنن طبع کے لیے اس کی گنجائش تھی۔ اسی لیے ایک مدت تک شمالی ہند میں اردو کی طرف سنجیدہ طور پر توجہ نہیں دی گئی اور اسے مذہب مجلسوں میں باریاب ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ انگریز جب ہندوستان میں آئے اور رفتہ رفتہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے لگے تو انھیں اپنی سرکاری مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنا پر ہندوستانی زبانوں کی اہمیت کا احساس ہوا۔ مغل حکومت اور دیسی ریاستوں کی کمزوری نے یہاں کی دفتری روایات پر بھی اثر ڈالا، جسے فارسی کو سخت نقصان پہنچا۔ انگریزوں کے اقتدار کے عملی فروغ کے ساتھ ساتھ دہلی اور شمالی ہند میں اردو کا استعمال بھی بڑھنے لگا اور رفتہ رفتہ اسے سرکاری زبانکی حیثیت حاصل ہوگئی۔ پریس کے قیام نے بھی اردو کی اس نئی حیثیت کو مستحکم کرنے میں مدد دی۔ اس طرح انیسویں صدی کے آغاز سے اردو کی ترقی کی رفتار تیز ہوگئی۔ انگریزوں کی تعلیمکے لیے فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا جس کا مقصد انھیں ملکی علوم والسنہ سے آشنا کرانا تھا۔ اس کے تحت عربی و فارسی کی اہم کتابوں کو اردو میں منتقل کیا گیا، نئی نئی کتابوں کی تدوین و تالیف کی کامیاب کوششیں کی گئیں، لغات و قواعد مرتب کیے گئے۔ مگر یہاں صرف انھیں کتابوں کی تالیف و تدوین ہوئی جو ہندوستان میں آکر بسنے والے انگریزوں کے لیے مفید ہوسکتی تھیں۔ ان کتابوں سے فائدہ یہ ہوا کہ سادہ اور سلیس اردو جو فارسی کے اثر سے آزاد اور عام بول چال کی زبان سے بہت قریب بھی، ادبی نگارشات میں استعمال کی جانے لگی۔ اس وقت جب کہ مروجہ اردو نثر فارسی کے اثر سے مغلوب، دور از کار اور نامانوس الفاظ و استعارات سے گراں بار اور بے جا و بے محل تکلف و تصنع سے بوجھل ہو رہی تھی اور صرف ایک محدود حلقے میں، جس کی تعلیم و تہذیب میں عربی و فارسی کو بنیادی حیثیت حاصل ھی، لکھی پڑھی اور سمجھی جاتی تھی، اسی زبان کو ادبی زبان بنانے کی کوشش کرنا جو وسیع تر حلقوں میں سمجھی جاسکے فورٹ ولیم کالج کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ چوں کہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی سرگرمیاں اپنے مقصد کے اعتبار سے بہت محدود تھیں اس لیے اس کے فوائد بھی محدود رہے۔ مگر اس کے باوجود اس نے اردو کو ایک ایسا ادبی طرز عطا کیا جو مزید ترقی کے وسیع تر امکانات لیے ہوئے تھا۔

فورٹ ولیم کالج کے بند ہونے زمانہ ہندوستان میں اور خصوصاً شمالی ہند اور دہلی میں پریس اور صحافت کے آغاز اور تیزی کے ساتھ فروغ کا زمانہ تھا۔ فارسی کے اثر سے آزاد اردو نثر کو جو

عام طور پر ادیبوں کی چشم التفات سے محروم رہی تھی اب صحافت نے پلکوں سے اٹھایا اور ملک کے گوشے گوشے میں مقبول کر دیا۔ اس دور میں نثر کا فروغ صحافت کے فروغ کا لازمی نتیجہ تھا۔ یہ جدید اردو نثر کا بچپن تھا اس لیے مختلف اثرات کو جلد قبول کر لینا بھی اس کی فطرت کا تقاضا تھا۔ چناں چہ صحافت سے بھی اس نے بے پناہ اثر لیا، اور اس کے اچھے برے سب ہی عناصر کو قبول کیا۔ پریس اور صحافت کی بدولت ادب کی تخلیق کرنے اور اس سے محظوظ و مستفید ہونے والے طبقے میں توسیع ہوئی، ادب شرفا اور امرا کی تنگ محفلوں سے نکل کر ہر پڑھے لکھے تک پہنچنے لگا۔ تعلیم کے پھیلنے سے پڑھا لکھا طبقہ بھی بڑھنے لگا۔ جدید تعلیم، صنعت و تجارت اور سرکاری اداروں اور شعبوں کے پھیلاؤ کی بنا پر تیزی کے ساتھ بڑھنے والے متوسط طبقے نے اپنی سیاسی و معاشی خوش حالی کے ساتھ ساتھ اخبارات و رسائل کے ذریعے اپنی ذہنی تسکین کا سامان پایا۔ اب ادیب کے مخاطب بھی چند استاتذائے فن یا گنے چنے صاحبانِ ذوق نہیں رہ گئے بلکہ دور دراز کی ان دیکھیں محفلوں میں بھی اسے اپنے سمجھنے والے اور قدر دان ملنے لگے۔ یہی طبقہ اب ادیبوں اور شاعروں کو بھی جنم دینے لگا۔ پڑھنے والوں اور ان ہی بنیادی تبدیلیوں کے باعث ادب کی ضرورت، مقصد، ماہیت، منصب غرض کہ سب ہی کچھ بدل گئے اور اس طرح نئی روایات واقدار کی داغ بیل پڑی۔

ان بدلتے ہوئے حالات میں، سماجی تغیرات کا ادراک رکھتے ہوئے جس ادارے نے اردو زبان و ادب کے ارتقا میں اہم ترین حصہ لیا وہ دہلی کالج تھا۔ یہاں نئے ذہنی رجحانات مغربی فکر و فلسفہ کے زیر اثر پروان چڑھ رہے تھے ۔ چناں چہ سیاسی اعتبار سے لبرل ازم (Liberalism) نے اور سماجی اعتبار سے افادیت پسندی (Utilitarianism) نے یہاں کے اساتذہ وطلباء کے طرزِ فکر پر اثر ڈالا۔ علم وفن، شعر و ادب، صنعت وحرفت غرض کہ ہر شے کے پیچھے کوئی مفید مقصد تلاش کیا جانے لگا۔ ہر نظریہ اور ہر عمل اپنے نتائج سے جانچا جانے لگا۔ تعلیم کا مقصد بھی اب انفرادی معاشی فلاح اور ساتھ ہی ساتھ سماجی اصلاح ہو گیا۔ ادب افراد کے اذہان کو متاثر کر کے انھیں کسی مفید کام پر اکسانے کا وسیلہ بن گیا۔ اس طرزِ فکر کی ایک اچھی مثال فوائد الناظرین کے صفحات پر شائع ہونے والے ایک خط میں ملتی ہے۔ مکتوب نگار نے شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”بڑی غرض اس فن سے ہے برانگیختہ کرنا چند قوتوں کا جو گویا انسان کی ماہیت میں داخل ہیں مثلاً انسان میں یہ باتیں ہوتی ہیں، غصہ، شجاعت، عشق، رحم، حب الوطنی وغیرہ اور نہایت خوبی اشعار کی یہی

ہوتی ہے کہ ان سے دلِ انسان پر جو انھیں سمجھ سکتا ہو برانگیختہ کرنے کی ان قوتوں میں سے قرار واقعی ہو۔ چناں چہ اکثر حکمائے فرنگ کی یہی رائے ہے کہ جس شعر میں یہ بات نہیں پائی جاتی ہے وہ شعر ہی نہیں یہاں سے یہ بات ظاہر ہے کہ جو فوائد اور نقصان ان قوتس کے برانگیختہ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں وہی فوائد اور نقصانات فنِ شاعری سے متعلق ہونے چاہئیں...... اب دیکھنا چاہیے کہ مطلق اثر اشعارِ عشقیہ کا یہاں کے لوگوں پر کیا ہونا چاہیے۔ میری رائے ناقص میں سوائے اس کے کہ ان اشعار کی سماعت کرنے سے شوق واسطے لغویات کے اور نفرت واسطے علوم اور فنون مفیدہ کے پیدا ہو جائے اور کوئی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ سوائے اس کے دل پر ایک طرح کی سستی اور بے پروائی ہو جاتی ہے اور وہ جو باتیں شجاعت اور مردانگی کی ہیں ان کے مزاج میں سے اٹھ جاتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں کے اشعار اس لائق ہیں کہ انھیں عیاش اور اوباش سنا کریں کیوں کہ ان کے ذریعے سے انھیں زیادتی لذتِ کی حاصل ہوسکتی ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ اگر یہی صاحب جو اتنا ذہن اور قوت رکھتے ہیں کہ نہایت عالی مضمون کے اشعار ایک لحظے میں بنا سکتے ہیں، اور مضمون کے اشعار مثلاً ایسے جن کے سننے سے ایک طرح کی مردانگی اور شجاعت دل پر آوے بنا دیں تو خلقتِ ہندوستان کو کس قدر فائدہ ہوسکتا ہے۔ اگر حال ملکِ فرنگ کا کسی کو معلوم ہوگا تو اس پر یہ بات روشن ہوگی کہ بعض کتاب نظم کے مطالعہ کرنے سے لوگوں کے مزاج بدل گئے ہیں...... الراقم سیاح۔"[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کالج سے متعلق حضرات اور اس کے اخبارات و رسائل سے متاثر ہونے والے لوگ ادب میں مقصدیت اور افادیت کی اہمیت سے نہ صرف اچھی طرح آگاہ تھے بلکہ ملک کے ادیبوں اور شاعروں سے ان عناصر کی اہمیت کو عملی طور پر تسلیم کرانے کے لیے بھی کوشاں تھے۔ دہلی کالج کی تحریک کا یہ ادبی پہلو اس کی وسیع سماجی تحریک کے ضمن میں وجود میں آیا تھا۔ اصلاحی نظریات کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس کی بھی نشوونما ہوئی اور بہت قلیل عرصے میں یہ اردو شعر و ادب پر حاوی ہوگیا۔ مگر کالج میں بنیادی طور پر زور سائنس کی تعلیم پر

---

[1] فوائد الناظرین، ۲۹؍جون ۱۸۴۶ء

تھا اور اصل کوشش یہ تھی کہ تراجم کے ذریعے اردو زبان میں مغربی علوم کی ترویج کی جائے اور خود پڑھنے والوں کے اذہان کو جدید دور کے مسائل کو سمجھنے اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمودار ہونے والے تغیرات کی اہمیت کو محسوس کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ چناں چہ یہ تحریک اگر ایک طرف بلاواسطہ طور پر بھی لوگوں کو سائنٹیفک انداز میں سوچنے پر مجبور کر کے ان کی نگارشات پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اس دور کے حساس و باشعور ادیب و شاعر اس کے اثرات سے فیض یاب ہونے لگے، ان کی نگارشات میں جدید سماجی و سیاسی نظریات کی جھلک دکھائی دینے لگی، ادبی اسالیب و اصناف میں وسعت آئی۔ اس بنا پر دہلی کالج کی تحریک کے زیرِ اثر ظہور پذیر ہونے والے ادبی رجحانات کی تاریخی اہمیت ہے، جسے پیشِ نظر رکھے بغیر جدید اردو نثر کے ارتقائی مدارج کا مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔

جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے یہ دور صحافت کا دور تھا۔ ادب میں سادگی زبان و بیان کی اہمیت کے شعوری احساس کے علاوہ صحافت کی ضرورت کا بھی یہی تقاضا تھا کہ مصنوعی انداز اختیار کرنے کی بجائے فطری اور عام فہم انداز اپنایا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہوسکیں۔ اخبار کی ترتیب واشاعت سے اتنا وقت بچ ہی نہیں سکتا تھا کہ اسے پر تکلف اور مرصع عبارت پر صرف کیا جاسکے۔ یہ تو فرصت کے لمحات میں ہی ممکن تھا۔ اخبار کی طباعت کے وقت تک خبریں اور اطلاعیں آتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے وقت کی قدر و قیمت کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔ بعض اوقات مہتمم اخبار کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا تھا کہ اخبار میں شائع ہونے والے سارے مواد کو خود قلم بند کرے چناں چہ وہ اس سلسلے میں دوسروں سے بھی مدد لیتا تھا۔ اکثر وہ لکھنے کی بجائے بولتا جاتا اور کوئی دوسرا شخص اس کے الفاظ کو لکھتا جاتا تھا۔ اس دور کے اخباروں کی عبارت میں یہ عنصر بہت نمایاں ہے۔ تحریروں میں گفتگو کا انداز ہوتا تھا جملوں کی ساخت الفاظ کے انتخاب محاوروں کے استعمال میں کاوش سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ اس لیے اگر بول چال کی زبان کی رواں دواں انداز لب ولہجہ کا اتار چڑھاو اور روزمرہ کا لطف تحریر میں آگیا اور تکلف و تصنع کا دامن چھوٹا تو دوسری طرف احتیاط وانتخاب کی کمی نے وہ چھب اور وہ بانکپن نہ آنے دیا جس سے تحریروں میں جان آتی ہے۔ عام بول چال کی روانی، لب ولہجہ اور اندازِ گفتگو کی تابع ہوتی ہے، اور جملوں کی ساخت سے زیادہ اہمیت مجموعی تاثر کو ہوتی ہے۔ تحریروں کی روانی اور ان کا مجموعی اثر جملوں کی ساخت، اور الفاظ ومحاورات کے انتخاب پر منحصر ہے۔ انداز گفتگو کی چاشنی اس تاثر میں اضافہ تو کرسکتی ہے مگر اس پر پورے طور پر دارو مدار نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ تحریروں میں بول چال کا انداز اپنانے کے لیے ادب کے جمالیاتی

مزاج کا خاص لحاظ لازم ہے۔ شاید اس کی طرف اس دور میں زیادہ توجہ نہیں دی جا سکی۔ نثر میں ردو قبول کے عام معیار متعین نہیں کیے گئے، اس لیے اس دور کے اخبارات عبارتوں میں ایک یکسانیت سی اور انھیں پڑھتے وقت زبان کو کچھ نمک کی کمی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ صحافت کی مجبوریوں کے علاوہ شاید یہ اس آراستہ و پیراستہ نثر کے خلاف ایک ردِ عمل بھی تھا جہاں ادب فن (Art) کی حدوں سے گذر کر اور حرفے (Craft) کی حدوں میں داخل ہوکر اپنی معراج کو پہنچتا تھا۔ مگر اس دور کا ادیب فن (Art) کی سرحدوں کو بھی رفتہ رفتہ پہچانتا ہے اور اس کی سمت آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے۔ یہ ردِ عمل اتنا شدید تھا کہ اس کے اثرات سرسید کی تحریروں تک پہنچے اور تہذیب الاخلاق کے مضامین میں انھیں بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر یہاں تک پہنچتے پہنچتے اس میں ایک توازن قائم ہوگیا۔ سادگی میں ایک طرف داری اور سجیلا پن آنے لگا۔ صحافت سے رشتہ ٹوٹا بھی نہیں اور اس کا غلبہ بھی ختم ہوگیا۔ ادبی نثر کے معیار متعین ہونے لگے۔ جن سے خود صحافت پر مفید اثرات پڑے۔ انیسویں صدے کے صحافتی اسلوب کی یکسانیت دور ہونے لگی اور تحریروں میں تنوع نمودار ہوا۔ عبارتوں میں منفرد رنگ جھلکنے لگے اور اس کی بدولت ایسی نگارشات وجود میں آئیں جنھیں اعلی ادب میں بھی جگہ ملی اور بلند پایہ صحافت میں بھی جن کا شمار کیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں سرسید کے تہذیب الاخلاق اور ابوالکلام آزاد کے الہلال والبلاغ کے مضامین مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۲)

رام چندر اس اہم تحریک کے سب سے زیادہ ممتاز رکن تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ جاگیردارانہ سیاسی وسماجی خیالات کی تردید کر کے ایسے نظریات کی تبلیغ کی جائے جو صنعتی دور کے تقاضوں کے مطابق ہوں اور جن کے سہارے ہندوستان نئے دور میں قدم رکھ سکے۔ رام چندر کی تحریروں کا مقصد تبلیغی تھا۔ انھوں نے جس نثر اور اسلوب نثر کو پیش کیا وہ بھی تبلیغی ضروریات کا پابند تھا۔ وہ اپنے زمانے کے سیاسی وسماجی طرزِ فکر پر اپنی تحریروں کے ذریعے براہِ راست اثر انداز ہونا چاہتے تھے ان کے مضامین کیف وسرور کی بجائے ہوش وآگہی سے بھرپور تھے۔ انھوں نے اردو زبان وادب کو نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جس میں وہ خود اپنے دور میں بھی کام یاب ہوئے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسا سرمایہ بھی چھوڑ گئے جو اردو زبان وادب کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔

رام چندر کا طرزِ تحریر اپنے دور کا سب سے اہم طرزِ تحریر ہے۔ ان کی نگارشات میں اس دور کی خوبیاں بھی اپنے شباب پر ہیں اور خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کی زبان عام بول چال کی زبان ہے۔ انھوں نے دقیق الفاظ، دور از کار محاورے اور بے جا و بے محل تشبیہات و استعارات کہیں استعمال نہیں کیے اور اس بات کی خاص طور رپ کوشش کی کہ ہر پڑھنے والا ان کے مضامین کو بہ آسانی سمجھ سکے۔ سلاست و سادگی کی علاوہ وضاحت بھی ان کے طرز کی ایک نمایاں خوبی ہے۔ چوں کہ ان کے مضامین کسی اہم وقتی مسئلے سے متعلق ہوتے تھے اس لیے لازم تھا کہ خیالات کا اظہار اس قدر واضح ہو کہ ناظرین ان پر غور وفکر کرسکیں۔ ان کے ذہن عبارت کی رنگینی میں محو نہ ہوجائیں بلکہ اصل موضوع پر مرکوز ہوں۔ رام چندر کی تحریروں کا بنیادی مقصد اشاعت افکار تھا۔ وہ ''ابلاغ'' سے زیادہ ''تبلیغ'' کے لیے فکر مند تھے۔ اس لیے وہ اپنی ضرورت کے مطابق کہیں خطابت کا طرز اختیار کرتے ہیں، کہیں طنز و مزاح کا، کہیں سنجیدہ منطقی بحثوں کا، لیکن خیال ہر جگہ حاوی ہے، وہ ادب کی حدود کے مطابق گھٹتا بڑھتا نہیں بلکہ اس کے مطابق ادب کے حدود پھیلتے اور اکم ہوتے ہیں۔ یہ آب گینہ ان کے یہاں تندی صہبا سے پگھل پگھل جاتا ہے اور ہر لحظہ نئی نئی شکلوں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ نثر کے ان پیمانوں کو نئی شکل دینے کی یہ کوشش قابل ستایش ہے۔ ان ہی شکلوں کی تراش خراش اور آرایش و زیبائش آنے والے دور میں علی گڑھ تحریک کے نمائندوں کے ہاتھوں ہوئی۔

رام چندر کے علمی مضامین خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔ رام چندر اور دہلی کالج کے اساتذہ کی کوششوں سے پہلے اردو زبان مغربی فلسفہ وعلم سے قطعاً ناآشنا تھی۔ رام چندر کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تراجم کے ذریعے بھی اس کمی کو پورا کیا اور مغربی علوم سے متعلق متعدد مضامین بھی لکھے جن کی بدولت جدید علوم اردو میں منتقل ہوئے اردو داں طبقہ فکری طور پر ''یونان ومصرو روما'' کے دور سے آگے بڑھا اور نئے دور کے سیاسی سماجی، معاشی اور تہذیبی تقاضوں سے ہم کنار ہوا اس کی حدِ نظر مشرق سے بڑھ کر مغربی دنیا تک پہنچی۔ اب مغربی ادبیات سے استفادہ کا ذوق وشوق پیدا ہونے لگا۔ اردو زبان کی اسالیب، اصناف، الفاظ و اصطلاحات میں اضافہ۔ مضمون نگاری ان ہی اصناف میں سے ایک اہم صنفِ ادب تھی۔ رام چندر نے اردو میں پہلی بات اس کی طرف توجہ دی اور اسے اس خوبی کے ساتھ اور اس وسیع پیمانے پر برتا کہ بہت جلد اسے عام مقبولیت حاصل ہوگئی۔ ''مضمون'' کا لفظ اردو میں متعدد معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ اسے (Essay) کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے اور آرٹیکل (Article) کے معنوں میں بھی۔ انگریزی اصطلاح سے ہی اگر کام نکالا جاے تو رام چندر

کے مضامین کو آرٹیکل (Article) کہا جاسکتا ہے۔ ہمارے یہاں اسی کو ابتداً مضمون کا نام دیا گیا۔ مضمون کا یہ اصطلاحی مفہوم ہمارے یہاں اخبار و رسائل کے بعد آیا۔ اس کی بدولت اور اسی کی ایک متنوع شکل کے طور پر اسے (Essay) کا ظہور ہوا۔ اسی لیے دونوں کے لیے مضمون ہی کا لفظ استعمال کیا جاتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی متعدد اور اقسام وجود میں آئیں، مضمون کا مفہوم وسیع تر ہوتا گیا اور جن اصناف کے لیے انگریزی میں مختلف اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں، وہ اردو میں ایک ہی اصطلاح کے ضمن میں استعمال کی جانے لگیں۔ خیالی مضامین، مزاحیہ مضامین، سوانحی مضامین، علمی مضامین، مضمون ہی کی مختلف اصناف سمجھی جاتی رہیں۔ مگر یہ سب اصناف ہمارے یہاں آرٹیکل (Article) ہی سے وجود میں آئیں، اسی کو ابتداً ''مضمون'' کہا گیا اور اس کا آغاز رام چندر کے ہاتھوں فوائد الناظرین کے صفحات پر ہوا۔

علمی مضامین پر رام چندر نے خاص توجہ دی۔ اور اہم موضوعات پر اعلیٰ معیار کے مضامین رقم کیے۔ علمی مضامین کی زبان اور اس کا انداز بیان عام طور پر دقیق اور مشکل ہو جایا کرتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے الفاظ، فقرے، لب و لہجہ غرض کہ سب مخصوص نہج پر ڈھل جاتے ہیں۔ علمی اصطلاحات کا جا بجا استعمال موضوع کو اور زیادہ مشکل بنا دیتا ہے۔ اور اسی لیے سنجیدہ علمی مضامین میں زیادہ تر دو اور دو چار والا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر رام چندر کی تحریروں کی خوبی یہ تھی کہ وہ ان لوگوں کے لیے ہی آسان نہیں جو صرف ان علوم پر گہری نظر نہیں رکھتے بلکہ معمولی پڑھے لکھے لوگوں کی سمجھ میں بھی یہ آسانی آسکتی تھیں۔ اردو زبان، علمی مضامین نہ ہونے کی وجہ سے، رام چندر کے دور تک علمی الفاظ و اصطلاحات اور علمی اسلوب سے محروم رہی تھی۔ اگر یہ روایات پہلے سے موجود ہوتیں تو رام چندر کا کام بہت آسان ہوتا۔ ان کی غیر موجودگی میں خود رام چندر نے یہ مشکل آسان کرنے کی کوشش کی، اور اس سلسلے میں بہت اہم اور بنیادی کام انجام دیا۔ سماجی و اخلاقی مسائل تاریخی واقعات اور سوانح پر بھی رام چندر نے متعدد مضامین لکھے رام چندر کی تمام تحریروں کی زبان اور اسلوب میں یکساں سلاست، وضاحت اور گفتگو کا سا انداز ملتا ہے۔ موضوعات اور ضروریات کے اعتبار سے ان میں خفیف فرق بھی مل جاتا ہے مگر کہیں بنیادی انحراف نظر نہیں آتا۔[1]

اردو میں ترجمہ نگاری کا فروغ رام چندر کا ایک اور کارنامہ ہے۔ رام چندر نے ترجمے کا کام زمانۂ طالب علمی میں دہلی کالج کے انگریز اساتذہ کی نگرانی میں شروع کیا تھا۔ انھیں اس سے

---

[1] ملاحظہ ہو تیسرا باب۔

دلچسپی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور اردو میں اس کی افادیت کے پیش نظر بڑے انہماک کے ساتھ وہ اس میں محفو ہوگئے اور مغربی فلسفہ وعلوم کو اہم انگریزی کتابوں کے تراجم کے ذریعے اردو داں طبقے تک پہنچانے لگے۔ ان ہی تراجم کے ذریعے ہندوستانی باشندے اوّل اوّل مغربی طرز فکر سے آشنا ہوئے اور ان میں انگریزی زبان و ادبیات، فلسفہ وعلم اور افکار ونظریات کے مزید مطالعے اور ان سے استفادے کا شوق پیدا ہوا۔

رام چندر کے تراجم میں بھی اس کی نثر کی عام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان تراجم کو دہلی کالج میں درسی کتابوں کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اس لیے طلبا کی ضرورت کا خیال رکھنا ترجمہ نگار کے لیے ضروری تھا۔ چناں چہ یہ تراجم بھی سہل زبان اور سہل اندازِ بیان کے حامل ہیں۔ اصطلاحات کے تراجم میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ ان کا پورا مفہوم واضح ہوجائے خواہ بالکل مترادف اصطلاح وضع نہ ہو۔ بعض مقامات پر ترجمہ نگار نے اس آزادی سے ذرا زیادہ فائدہ اٹھایا ہے اور کہیں کہیں ترجمہ کچھ بے ڈول سا بھی ہوگیا مثلاً پیرا ڈائز لوسٹ (Paradise Lost) کا ترجمہ ''گم شدن باغ بہشت از دست آدم'' مناسب نہیں معلوم ہوتا[1] مگر یہ خامی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ عمومی طور پر دیکھا جائے تو ترجموں کا معیار بلند ہے۔ اردو زبان و ادب میں رام چندر کے ترجموں کی زیادہ تر اہمیت تاریخی اعتبار سے ہے۔ اردو ترجمہ نگاری کا یہ دور آغاز تھا اور اس منزل پر اس معیار کے تراجم پیش کرنا اہم کارنامہ ہے۔

رام چندر کے مضامین زیادہ تر فوایدالناظرین اور محبّ ہند میں شائع ہوئے۔ عجائبات روزگار اور تذکرۃ الکاملین بھی دراصل ان ہی مضامین کے مجموعے ہیں۔ ان میں چند مضامین کا اضافہ بھی کیا گیا ہے مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ رام چندر نے دوران طالب علمی میں ہی سیاسی، اخلاقی، تمدنی، معاشرتی موضوعات پر مضامین لکھنے شروع کردیے تھے جن کا مقصد ملک میں جدید خیالات کی ترویج و اشاعت تھا۔ یہ عام طور پر اس نقطہ نظر سے لکھے جاتے تھے کہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی ان کو پڑھ کر مصنف کے خیالات پر غور وفکر کے لیے آمادہ ہوں۔ اسی لیے ان کا طرزِ تحریر بہت صاف سادہ اور سلجھا ہوا ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ رام چندر کا مقصد اس طبقے کے خیالات وعقائد پر بھی ضرب لگانا تھا جو قدیم طرزِ تعلیم کے تحت پروان چڑھا تھا جو اپنی مخصوص ذہنی تربیت کی بنا پر اور مغربی افکار وخیالات کے خلاف چلنے والی مذہبی تحریکوں کے زیر اثر ہر نئی شے کو برا سمجھتا تھا۔ یہی طبقہ اس وقت کی سماجی مذہبی وعلمی زندگی پر حاوی اور نئے

---

[1] ملاحظہ ہو تیسرا باب۔

رجحانات کے خلاف نبرد آزما تھا۔ ان لوگوں کی ذہنی تربیت کے لیے انھیں ایسے موضوعات سے آشنا کرانے کی ضرورت تھی جن کے مطالعے سے ان کے توہمات متزلزل ہوں اور وہ اپنے خیالات وعقائد پر نئی معلومات اور نئے نظریات کی روشنی میں غور وفکر کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ فلسفیانہ، منطقی اور دقیق انداز بیان سے احتراز کیا جائے اور مشکل سے مشکل، دقیق سے دقیق مسائل کو بھی سمجھانے کے لیے سیدھا سادا اور عام فہم طرزِ تحریر اختیار کیا جائے۔ نامانوس اور نئے نظریات کو مانوس اور مقبول زبان ہی کے ذریعے ملک کے زیادہ سے زیادہ لوگوں میں پھیلایا جاسکتا تھا۔ معمولی علمی استعداد رکھنے والوں کی ذہنی سطح کو رفتہ رفتہ بلند کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی اور مروجہ مشرقی معیاروں کے مطابق اعلی تعلیم سے مستفید مگر ذہنی اعتبار سے پس ماندہ اور نئے تقاضوں سے ناآشنا لوگوں کو جدید ضروریات کا احساس دلایا جاسکتا تھا۔ چوں کہ یہ طبقہ انگریزی زبان، انگریزی علوم اور ان کی اشاعت کرنے والے لوگوں اور اداروں سے متنفر تھا اس لیے ان کے ذہنوں تک پہنچنے کی صرف یہی صورت تھی کہ اخبارات ورسائل کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ ان میں پیاس پیدا کی جائے اور اگر اس کے باوجود وہ کنوئیں تک پہنچنے سے معذور ہوں تو پانی کو ان کے پاس پہنچا دیا جائے۔ رام چندر کا مقصد تشنگی پیدا کرنا، اسے شدید تر کرنا اور پھر اسے بجھانے کے ذرائع کی جستجو میں ان کی رہنمائی کرنا تھا۔ رام چندر کی تحریروں کا یہ تبلیغی پہلو بہت اہمیت رکھتا تھا۔ ان کی زبان، ان کا اسلوب ان کا لب ولہجہ سب ان کے اسی مقصد کے تابع تھے۔

مگر رام چندر زبان و ادب کی ضروریات، ان کے منصب و ماہیت سے قطعاً ناواقف نہیں تھے۔ وہ اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ اردو زبان میں بنیادی اصلاحیں کی جائیں چناں چہ انھوں نے مہتمم سیدالاخبار کے سامنے ایک خط کے ذریعے یہ سوال پیش کیا کہ:

> ''اصل اردو کیا ہے وہ کون سے الفاظ زبان فارسی اور عربی اور سنسکرت کے ہیں کہ ان کا ہی فقط استعمال اردو میں مناسب ہے، اور باقی نامناسب ہے؟''[1]

وہ اردو کو عربی، فارسی اور سنسکرت کا دست نگر سمجھنے کی بجائے اس کو ایک ایسی زبان سمجھتے تھے جو خود اپنے پیروں پر بغیر کسی سہارے کے کھڑے ہونے کے قابل ہے۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

> ''یہ بات دیکھی گئی ہے کہ اگر لکھنے والا عربی خواں ہے تو وہ اپنی عبارت

---

[1] فوائد الناظرین ۲۴ر اگست ۱۸۴۶ء

اردو میں عربی الفاظ زیادہ لاتا ہے جو فارسی خواں ہے وہ فارسی کے
الفاظ بہت کامیں لاتا ہے۔ اور جو سنسکرت فقط جانتے ہیں وہ الفاظ
سنسکرت کا بہت استعمال کرتیہیں علاوہ ازیں سوائے الفاظ کے بہت
سے اشخاص اکثر فارسی خواں محاورے اور اصطلاحیں زبان فارسی کی
اردو عبارت میں مندرج کرتے ہیں۔ اور اس کو عین خوبی عبارت کی
تصور کرتے ہیں۔ اور اب ظاہر ہے کہ اس طرح کی عبارتوں کو تو اردو
نہیں کہہ سکتے۔''[1]

اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ اردو زبان کے معیار متعین کیے جائیں جن کی کسوٹی پر اردو عبارتوں کو
پرکھ کر بتایا جاسکے کہ صحیح اردو کون سی ہے فارسی یا عربی یا سنسکرت کی صحت و خوبی کے معیار اردو
کے معیار نہیں ہو سکتے۔ اردو کے معیار دوسری زبانوں کے معیاروں کے تابع نہیں ہونے
چاہیں۔ چناں چہ وہ اس سلسلے میں مہتمم سید الاخبار کی رائے مانگتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کوئی ایسی ترکیب نکالنی چاہیے کہ اس کے ذریعے سے یہ معلوم ہو جایا
کرے کہ فلانی اردو عبارت صحیح اور فلاں غلط۔ اگر اس بات کی تحقیقات
میں آپ کوشش کریں گے تو خلقت ہند کو قطعاً فائدہ ہوگا۔''[2]

رام چندر زبان و ادب کا ایک خاص نقطہ نظر رکھتے تھے جو مغربی ادبیات سے واقفیت اور ان
کے سائنٹفک طرز فکر کی بدولت وجود میں آیا تھا۔ کم الفاظ میں وضاحت کے ساتھ موقع و محل کی
مناسبت سے اپنی بات کا اظہار کرنا ان کے نزدیک طرز تحریر کی خصوصیت ہونی چاہیے:

''نفس انشا میں کچھ برائی نہیں بلکہ ایک فن شریف ہے۔ لیکن اپنے
مقام مناسب میں نہ ہر جگہ۔ تقریر و تحریر و سلام و کلام میں دس سطر میں
ہو تضیع اوقات ہے۔''[3]

وہ ''فارسی بازوں'' کے سخت شاکی تھے۔ ان کے نزدیک ان ہی لوگوں نے ''موافق اپنی عادت
کے سب چیزوں کو بگاڑا تھا۔'' چناں چہ خطوط نگاری کا رسمی طرز بھی ان ہی کا پروردہ تھا۔ خطوط

---

[1] فوائد الناظرین، ۲۴ر اگست ۱۸۴۶ء

[2] ایضاً ایضاً

[3] آج کل دہلی ستمبر ۱۸۵۲ء، ص ۱۲ غالب اور خطوط نویسی از برج موہن دتا تریہ کیفی (از محب ہند دسمبر ۱۸۴۹ء و جنوری ۱۸۵۰ء، ص ۴۶: ''تتمہ علوم در باب توہمات و رسوم۔ طریقہ خط و کتابت'')

نگاری کے مروجہ طرز کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اوّل میں خط کے لمبے چوڑے القاب، بعد اس کے آداب، تسلیمات وشرح اشتیاق پانچ چار دس بیس سطروں میں، بعد اس کے حال خیرت و عافیت چار سطروں میں، پھر شکایت نہ پہنچنے خط کی طرح طرح سے، اور بے قرار اور مضطر ہونا جس کا بالکل اثر نہیں ہوتا یا حال پہنچنے خط کا اور سرفراز وممتاز ہونا، پھر تھوڑا مطلب بڑی عبارت میں، یا بعضے خطوں میں سوائے امور مذکورہ اور کچھ بیان نہیں ہوتا تو اس کے سب آشنایوں کو اسامی وار سلام کہتے ہیں۔ اکثر امرا بلکہ عوام میں دستور ہے کہ مبادا دوسرا آدمی شکایت کرے کچھ نہ کچھ لکھ کر جس میں مطلب کی ایک بات نہیں ہوتی البتہ انشاء پردازی اور عبارت آرائی میں حتی الوسع دریغ نہیں ہوتا بھیج دیتے ہیں۔ خطوط تہنیت وتعزیت کے دفتر کے دفتر ہوتے ہیں۔ بعضے خطوں میں دیکھا کہ مضمون نہایت عتاب کا ہے لیکن القاب و آداب سے شرف وعظمت و اخلاق ومحبت ٹپکتا ہے۔ عبارت مضمون کی یہ ہے کہ ان صادق الوداد فلاں امر نہایت قبیح کروند، آیندہ چناں نکنند، واز صدور چنیں امر معلوم شد کہ آں مہرباں را با ما عداوتے تامہ است۔ لیکن القاب میں مشفقِ مہرباں، وکرم فرماتے مخلصاں، و مخلصِ اخلاص پرستاں، وغیرہ اور آداب میں ''بعد تمنا حصول مواصلت کہ حدے وپایانے ندارد و اظہارِ لوازم تسلیم وعبودیت'' وغیرہ مندرج ہے۔ ایک خط ۲۳ سطر کا میں نے دیکھا جس میں مضمون صرف اتنا تھا کہ قریب چار ساعت نواحقہ برغریب خانہ تشریف آرند۔ ہر چہ کہ اس مضمون کو بھی بڑی دھوم دھام سے لکھا تھا۔''[1]

رام چندر کے نزدیک بزرگوں نے ''خط کو نائب وخلیفہ تقریر کا اختیار کیا تھا نہ دفتر واسطے انشا پردازی و اغلاقِ عبارات وصناعات و استعارات کے'' مگر فارسی داں حضرات نے اس کی غرض وغایت کو فنا کر کے اسے نہایت مضحکہ خیز شے میں تبدیل کر دیا۔ عربی، سنسکرت اور انگریزی مکتوب نگاری میں یہ بے ڈھنگا پن نہیں ملتا۔ اس میں صرف فارسی والوں نے ہی کمال حاصل

---

[1] آج کل دہلی ستمبر ۱۸۵۲ء، ص ۹ تا ۱۲: غالب اور اردو خطوط نویسی از برج موہن دتاتریہ کیفی (از محب ہند دسمبر ۱۸۴۹ء وجنوری ۱۸۵۰ء ص ۵۶: ''تتمہ علوم در باب توہمات ورسوم سطر وخط وکتاب'')

کیا، اور اردو داں حضرات کو چاہیے کہ اس طرز کو چھوڑ کر سیدھا سادا قدرتی انداز گفتگو اختیار کریں کیوں کہ خط لکھنے کا اصل منشاء یہی ہے۔

اردو نثر کی تاریخ میں غالب کے خطوط کو اہم مقام حاصل ہے۔ ان ہی کی بنا پر غالب کو نثر کے جدید طرز کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ پنڈت جی موہن کیفی مرحوم کے فرمانے کے مطابق غالب نے اپنا پہلا اردو خط ۱۸۵۲ء میں لکھا ہوگا اس سے قبل رام چندر کا خطوط کے بارے میں مضمون محبِ ہند (دسمبر ۱۸۴۹ء و جنوری ۱۸۵۰ء) میں شائع ہو چکا تھا اس لیے ''ظن غالب یہ ہے کہ ماسٹر رام چندر کا یہ مضمون مرزا غالب کی نظر سے ضرور گذرا ہوگا اور ان کی طبع وقاد نے ضرور اثر لیا ہوگا''۔[1] مگر آفاق دہلوی صاحب کی تحقیق کے مطابق مرزا نے اپنا پہلا اردو خط دسمبر ۱۸۴۸ء یا جنوری ۱۸۴۹ء میں منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام لکھا تھا۔ اسی سیان کی اردو مکتوب نگاری کا آغاز شروع ہوا۔[2] مالک رام صاحب کے فرمانے کے مطابق بھی غالب کے ۱۸۴۹ء میں لکھے ہوئے خطوط مل جاتے ہیں[3] اس لیے یہ قیاس تو شاید صحیح نہ ہو کہ غالب نے مکتوب نگاری کا نیا طرز رام چندر کا مضمون پڑھنے کے بعد اختیار کیا۔ مگر اس کے باوجود غالب سے پہلے اور لوگوں کے بھی اسی طرز کے خطوط مل جاتے ہیں۔ خود قرآن السعدین، دہلی اردو اخبار اور فوایدالناظرین کے صفحات پر ناظرین کے خطوط، مہتمم کے مکتوبات اور جوابات دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر پڑھے لکھے لوگوں میں یہ رجحان پیدا ہونے لگا تھا کہ اردو زبان و بیان کی تشکیل فارسی انشاء کی بجائے اردو ہی کے اندازِ گفتگو کے مطابق ہونی چاہیے۔ غالبکے خطوط کی تاریخ ۱۸۴۸ء یا ۱۸۴۹ء جو بھی مقرر کرلی جائے اردو مکتوب نگاری کا یہ طرز اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ غالب کے اپنانے کے بعد یہ اور مقبول ہوا اور صدر الدین آزردہ جیسے لوگوں نے بھی یہی طرز اختیار کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انداز تنہا کسی شخص کی ایجاد نہیں تھا بلکہ بعض وجود کی بنا پر ایک ایسا ماحول بن گیا تھا کہ یہ یک وقت متعدد لوگوں نے جدا جدا اسے اختیار کیا۔ یہ اس دور کا پروردہ رجحان تھا جو اس ''محمد شاہی طرز'' سے مختلف اور ممتاز تھا جس پر خود غالب نے طنز کیا تھا۔ اس رجحان کی پرورش دراصل دہلی کالج اور رام چندر کی علمی اور صحافتی سرگرمیوں کی بدولت ہوئی تھی۔ چناں چہ رام چندر کا کارنامہ یہ نہیں کہ انھوں نے مکاتیب غالب کے وجود میں آنے سے پہلے ایک مضمون میں خط کو نائب اور خلیفہ تقریر کا

---

[1] آج کل دہلی ستمبر ۱۹۵۲ء: ''غالب اور اردو خطوط نویسی'' از: برج موہن دتاتریہ کیفی

[2] نگار لکھنؤ مئی ۱۹۴۷ء: ''غالب کے غیر مطبوعہ خطوط'' از: آفاق دہلوی

[3] جامعہ دہلی فروری ۱۹۴۲ء: ''غالب کی اردو خطوط نویسی کے آغاز کی تاریخ'' از: مالک رام

قرار دیا بلکہ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک ادبی نقطہ نظر کی ترویج کی اور عملی طور پر بھی
اسے خود انھوں نے اور ان کے حلقے کے حضرات نے اس خوبی کے ساتھ برتا کہ اس کے لیے
ایک ساز گار فضا پیدا ہوگئی جس میں سانس لینے والے تمام اہم اہل قلم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ
سکے۔ نثر کا یہ طرز غالب کی دین نہیں بلکہ اس دور کی دین ہے جس میں غالب کے ذہن وفکر کی
نشوونما ہوئی۔ چناں چہ غالب کو امتیاز تقدیم کی بنا پر نہیں بلکہ ان کے اسلوب کی انفرادیت
انھیں اس عہد کے دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کا شوخ اور بانکا انداز، طبیعت کی
ندرت پسندی، شاعرانہ فکر وتخیل کی رنگ آمیزی اور ان کی شخصیت کے پرتو نے ان کی نثر کو وہ
حسن عطا کیا جو اس دور کے کسی اور اہل قلم کے حصے میں نہ آسکا۔ غالب کے خطوں کی خوبی
سادگی، سلاست یا مکالمے کے انداز وغیرہ سے زیادہ ان کا شوخ اور بانکا انداز، طبیعت کی
ندرت پسندی، شاعرانہ فکر وتخیل کی رنگ آمیزی اور ان کی شخصیت کے پرتو نے ان کی نثر کو وہ
حسن عطا کیا جو اس دور کے کسی اور اہل قلم کے حصے میں نہ آسکا۔ غالب کے خطوں کی خوبی
سادگی، سلاست یا مکالمے کے انداز وغیرہ سے زیادہ ان کا رچا ہوا مذاق ہے جو ہر ہر لفظ میں
جھانکتا ہوا ملتا ہے اور اس معاملے میں کوئی اور ادیب ان کے آس پاس بھی نہ پہنچ سکا۔ بول
چال کے انداز کو تحریر میں اپنانا، تکلف وتصنع سے احتراز کرنا، یہ سب کچھ تو اس دور کی عام
خصوصیات بنتی جارہی تھیں مگر تحریروں میں تنوع ابھی بہت کم تھا اور ایک پھیکا پن سا پیدا ہو چکا
تھا۔ غالب کی تحریروں کا طرز دور کے عام طرز کے مطابق مگر ان کا اسلوب سب سے الگ
تھلگ تھا۔ یہی تنوں ان کی نثر کی خوبی ہے۔ رام چندر کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ انھوں نے نثر
کے ایک نئے اور عمومی معیار کا تعین کرنے اور اسے تسلیم کرانے میں سب سے اہم حصہ لیا۔
غالب کی شان امتیاز اس میں ہے کہ انھوں نے اس عمومی معیار کو تسلیم کر کے اسے مخصوص
انفرازی رنگ میں رچا دیا۔ ان دونوں کی ادبی کاوشوں کی نوعیت قطعاً مختلف تھی۔ رامچند ر نے
جو کام انجام دیا اس کی بنیادی نوعیت تھی اس لیے اردو ادب میں ان کی تاریخی اہمیت ہے۔

رام چندر نے سب سے پہلے زبان وادب پر نظریاتی طور پر روشنی ڈالی، ان کی سماجی اساس کو
اہمیت دی اور ان کے صحت مند مضر اثرات کے پیش نظر ان کی خوبیوں اور خرابیوں کا احساس
دلانے کی کوشش کی اور ان کے منصب، ماہیئت، مقصد پر لوگوں کو غور کرنے کی طرز مایل کیا۔
جس ادبی طرز کو وہ نظریاتی طور پر بہتر اور مفید سمجھتے تھے اسے انھوں نے عملی طور پر بھی بڑی خوبی
کے ساتھ برتا۔ انکے علمی، اخلاقی، سیاسی وسماجی مضامین ان تمام خصوصیات کے حامل ہیں
جنھیں وہ تحریر میں لازم سمجھتے تھے۔ چوں کہ یہ مضامین زیادہ تر سنجیدہ مسایل سے متعلق ہوتے

تھے اس لیے ان میں انشا پردازی کی لطافتیں تلاش کرنا فضول ہے ان کی ساری دل کشی رنگینی و رعنائی کی بجائے وضاحت وسلاست میں مضمر تھی۔ بے تکلف گفتگو کے ستھرے، بے لاگ اور دوٹوک انداز کا اپنا جادو کچھ کم نہیں ہوتا بشرطیکہ اسے جگانے والا قلم موجود ہو۔ رام چندر کے قلم میں یہ بات ان کی شخصیت کے حسن، ان کی علمی قابلیت اور ان کے بے پناہ خلوص کے بدولت آئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تحریروں کے اسلوب اور موضوعات دونوں نے اپنا اپنا اثر دکھایا اور بہت جلد ان کی عام طور پر پیری کی جانے لگی۔ خود ان کے زیر سایہ نذیر احمد، ذکاء اللہ اور محمد حسین آزاد جیسے ادیبوں کے مذاق وصلاحیت کی تہذیب وتربیت ہوئی اور ان ہی کے ذریعے رام چندر کی ادبی فکر کے اثرات دور تک پہنچے۔

رام چندر کی نثر کی خوبیاں، رعنائی فکر، لطافتِ خیال اور حسنِ اظہار کی بجائے رفعتِ فکر، افادیتِ خیال اور وضاحتِ اظہار تھیں۔ ان کا مقصد فرصت وفراغت کے لمحات میں غفلت انگیز راحت فراہم کرنا اور تلخ حقائق سے دوچار آمادہ فرار ذہنوں کو خواب ناک پناہ گاہیں بہم پہنچانے سے زیادہ جھنجھوڑنا، چونکانا فرصر وفراغت کو چھیننا اور راہ فرار دکھانے کے بجائے آمادہ پیکار کرنا تھا۔ مقصدیت وافادیت ہی ان کی تحریروں کی ابتداء وانتہا، محرک و ماحصل تھی۔ اس کی ضرورت کا انھیں اس قدر شدید احساس تھا کہ اس ''یک گونہ بے خودی'' کی طرف جو اعلیٰ ادب کی جان سمجھی جاتی ہے، ان کا ذہن گیا ہی نہیں، وہ ادب کو ''صد گونہ آگہی'' پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

رام چندر کی تحریروں میں ''مسرت آفرینی'' کا عنصر کم پایا جاتا ہے انھوں نے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی طرف خاص توجہ دی کیوں کہ اسی طرح ناظرین میں وہ جوش وخروش پیدا کیا جاسکتا تھا جسے وہ قومی تعمیر کے لیے لازمی سمجھتے تھے۔ اسی لیے اکثر مقامات پر ان کی نثر صحافت میں ضم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور کہیں کہیں خطابت کا انداز اس قدر غالب ہوجاتا ہے کہ تحریر کی قائم مقام ہی نہیں رہتی بلکہ خود تقریر بن جاتی ہے۔ مثلاً یہ انداز کہ ''افسوس ہزار افسوس! اے دوستو اے چھوٹے بڑوں رہنے والوں ہندوستان کے تمھاری عقل پر کیا پردا پڑ گیا ہے......''! تحریر کا انداز ہرگز نہیں معلوم ہوتا۔ گفتگو کے انداز کو برتنے میں کہیں کہیں بے اعتدالی بھی آجاتی ہے۔ صحافت کی ضروریات اور اپنی بے پناہ مصروفیات کی بنا پر عجب نہیں کہ رام چندر نے خود مضامین قلم بند کرنے کی بجائے وہی طریقہ اختیار کیا ہو کہ وہ بولتے جائیں اور کاتب ان کے الفاظ کو من وعن نقل کرتا جائے۔ گفتگو کی زبان کا ربط اور بے ربطیاں، جملوں کی ساخت سے زیادہ مفہوم پر توجہ، بول چال کا لب ولہجہ اور اتار چڑھاؤ غرض کہ ہر بات سے یہ اندازہ ہوتا

ہے جیسے کسی عام گفتگو کو قلم بند کر دیا گیا ہو۔ مثلاً:

> ''راجا جگت سنگھ ایک عیاش آدمی راجہ ہوا۔ اس کے عہد میں غنیم حملہ آور ہوا۔ شہروں کا محاصرہ ہوا۔ اور روپیہ دینا غنیم کو واسطے صلح کے، سازشیں دربار میں، یہ سب باتیں اس راجہ کے عہد میں واقع ہوئیں اور اس کا احمقاپن ساتھ حرموں کے ساتھ ظاہر ہوا......''[1]

یا سرو (Cicero) کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''......اس کی کتابیں تصنیف کی ہوئیں بہت ہیں اور ایسی لوگوں کو پسند ہیں اور بڑے بڑے فاضل اس کی تعظیم کرتے ہیں کہ کتنی دفع تو وہ چھپ چکی ہیں۔''[2]

گفتگو میں توجہ عام طور پر موضوع گفتگو پر ہوتی ہے۔ اس لیے بسا اوقات الفاظکے استعمال کی بھی زیادہ فکر نہیں کی جاتی۔ جمع الجمع بنا دینا، لفظوں کی شکلوں میں کچھ ترمیم کر دینا، ایسے الفاظ یا الفاظ کی ایسی صورتوں کو استعمال کرنا جو گفتگو میں تو عام طور پر چل جاتی ہیں، مگر معیاری نہیں سمجھی جاتیں یا انھیں تحریر میں لاتے وقت احتیاط برتی جاتی ہے۔ رام چندر کی تحریروں میں اندازِ گفتگو کا بہت گہرا رنگ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ''تحقیقاتیں''، ''غلطیئں''، ''بچاپن''، ''احمقاپن''، ''تغافلی''، ''قالیانہ'' اور اس قسم کے متعدد الفاظ انھوں نے جابجا استعمال کیے ہیں ممکن ہے یہ بے توجہی کی بجائے بول چال کے انداز کو تحریر میں رائج کرنے کی شعوری کوشش کی بنا پر ہو۔ کہیں کہیں الفاظ کے املا سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مضمون مصنف نے اپنے قلم سے نہ لکھا ہوگا۔ مثال کے طور پر کرنے بجائے کرنیں، نفا بجائے نفع، سرے بازار بجائے سر بازار وغیرہ۔ پھر بھی بول چال کی زبان کا لطف زیادہ تر قائم رہتا ہے، روز مرہ اور محاوروں کا برمحل استعمال، مکالمے کا انداز، تاریخ سے واقعات نقل کرتے وقت قصوں کہانیوں کا سا انداز، یہ سب کچھ رام چندر کی تحریروں میں جابجا نظر آتا ہے اور اسی لیے بول چال کی سادگی، لطافت اور برجستگی ان کی تحریروں کو دل کش اور دلچسپ بنا دیتی ہے۔ مثلاً:

> ''جب دولہہ رائے کے چچا نے اس کی ریاست زداری سے اسے نکال دیا تو اس کی ماں اسے ایک ٹوکری میں رکھ کر وہاں سے چلی اور جب

---

[1] قرآن السعدین، ۴؍دسمبر ۱۸۴۸ء: ''تاریخ جے پور'' از: محب ہند

[2] ایضاً ۲۹؍اگست ۱۸۴۸ء: ''حال سسرو فصیح کا'' از: محب ہند

ایک جنگل میں پہنچی تو اس نے ٹوکری کو ایک زمین پر رکھ دیا اور پھر دیکھتی کیا ہے کہ ٹوکری کے اوپر ایک سانپ کھڑا ہے۔ یہ ماجرا دیکھ کر اس نے شور مچایا، ایک برہمن نے اسے تشفی کی کہ تو گھبرا مت، یہ فالِ نیک، تیرا بیٹا کہیں کا راجا ہوگا۔ اس نے جواب دیا کہ ارے جا، تو اپنا کام کر، راجا ہوگا جب ہوگا۔ اب تو بھوکے اور تباہی میں مرتے ہیں......"[1]

یا یونان کے ایک امیر سے سقراط کی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے سقراط کی نصیحت لکھتے ہیں:

"اے عزیز شیخی کرنی کسی بات کی نہایت بری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایسی ذات پاک ہے کہ اس نے مدام سیر کے واسطے سوا سیر پیدا کیا ہے۔"[2]

رام چندر کی تحریروں کی اہمیت ان کے اسلوب کے اعتبار سے بھی تاریخی ہے اور موضوع کے اعتبار سے بھی۔ ان ہی کی کوششوں کی بدولت اردو زبان و ادب میں صحت مند اقدار و روایات کی تشکیل ہوئی، اس میں مشرقی و مغربی ادبیات کے اعلیٰ عناصر ہم کنار ہوئے، وہ جدید اذہان کی اعانت و رہ نمائی کرنے کے قابل ہوئی اور بہت جب کہ ہر شے قدیم سے جدید کی سمت مایلِ سفر تھی، اردو زبان و ادب کا قافلہ بھی رام چندر کی رہنمائی میں آگے بڑھا اور ان منزلوں کی طرف گامزن ہوا جو ان سے پہلے نگاہِ تصور کی رسائی سے بھی دور تھیں۔

---

[1] قرآن السعدین، ۲۷ر نومبر ۱۸۴۸ء: "تاریخ جے پور"، از: محبِّ ہند

[2] ایضاً ۲۵ر دسمبر ۱۸۴۸ء: "حال حکیم سقراط یونانی کا" از: فوائد الناظرین

ضمیمہ (الف)

رام چندر کے مضامین

فوائد الناظرین

فوائد الناظرین تقریباً دس برس تک نکلتا رہا۔ اس کے زیادہ تر مضامین رام چندر ہی کے لکھے ہوئے تھے اس لیے ان کی مضامین کی مکمل فہرست بہت ضخیم ہوگی۔ ذیل میں صرف وہی مضامین مختلف عنوانات کے تحت پیش کیے جاتے ہیں جو فوائد الناظرین کی چند جلدوں میں میری نظر سے گزرے۔ چوں کہ یہ چند جلدیں بھی مکمل نہیں تھیں اس لیے یہ فہرست بھی مکمل نہیں ہوسکتی۔ مگر اس کے ذریعے رام چندر کے مضامین کی ایک بڑی تعداد سامنے آجاتی ہے، جن سے ان کے اخبار کی نوعیت اور معیار کے ساتھ ساتھ ان کے افکار و خیالات اور علمی کاوشوں کے بارے میں بھی اہم معلومات حاصل ہوسکتی ہے۔ مضامین کی ایک بڑی تعداد ساتھ ساتھ ان کے افکار و خیالات اور علمی کاوشوں کے بارے میں بھی اہم معلومات حاصل ہوسکتی ہے۔ مضامین کے مندرجات اُن کے عنوانات سے اس قدر واضح ہیں کہ مزید تشریح کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ ان عنوانات کی فہرست ہی تشریحی فہرست (Descriptive Bibliography) ہے۔

سوانحی و تاریخی مضامین

۱۸۴۵ء-۱۸۴۶ء جلد اوّل

۱- بادشاہت غزنی کے بیان میں (نمبر ۱۳) ۸ ستمبر ۱۸۴۵ء

۲- بادشاہت غزنی (نمبر ۱۴) ۲۲ ستمبر ۱۸۴۵ء

۳- حال بوعلی سینا کا (نمبر۱۶) ۲۰/اکتوبر ۱۸۴۵ء

۴- حال محمود غزنوی کا (نمبر۱۶) ۲۰/اکتوبر ۱۸۴۵ء

۵- حال سقراط (نمبر۱۷) ۳/نومبر ۱۸۴۵ء

۶- حال فلاطون کا (نمبر۱۸) ۱۷/نومبر ۱۸۴۵ء

۷- تاریخ انگلستان (نمبر۱۸) ۱۷/نومبر ۱۸۴۵ء

۸- حال ارسطو کا (نمبر۱۹) یکم دسمبر ۱۸۴۵ء

۹- حال بقراط کا (نمبر۲۰) ۱۵/دسمبر ۱۸۴۵ء

۱۰- تاریخ ایران (نمبر۲۰) ۱۵/دسمبر ۱۸۴۵ء

۱۱- حال زردشت کا (نمبر۲۰) ۱۵/دسمبر ۱۸۴۵ء

۱۲- تاریخ انگلستان (نمبر۲۹) ۲۰/اپریل ۱۸۴۶ء

۱۳- احوال بادشاہ رچرڈ انگلستان کا (نمبر۳۱) ۱۸/مئی ۱۸۴۶ء

۱۴- حال نادر شاہ کا (نمبر۳۲) یکم جون ۱۸۴۶ء

۱۵- حال فتح شاہ پادشاہ ایران (نمبر۳۳) ۱۵/جون ۱۸۴۶ء

۱۶- حال محمد علی پاشا (نمبر۳۶) جولائی ۱۸۴۶ء

۱۷- تذکرہ تلسی داس اور سور داس کا (نمبر۴۰) ۲۱/ستمبر ۱۸۴۶ء

۱۸- حال لارڈ چارلس مٹکلف صاحب بہادر (نمبر۴۵) ۳۰/نومبر ۱۸۴۶ء

۱۸۴۷ء- جلد دوم

۱۹- مختصر حال سلطنت حضرت شاہ عالم بہادر (نمبر۲) ۸/فروری ۱۸۴۷ء

۲۰- زمانہ سلف کا حال- ملک مصر کا (نمبر۱۰) ۳۱/مئی ۱۸۴۷ء

۲۱- حال جناب فرینکلن صاحب کا (نمبر۱۱) ۴/جون ۱۸۴۷ء

۲۲- فرنگستان کے لوگوں کو علم اور عقل حاصل ہونے کا بیان (نمبر۱۱) ۴/جون ۱۸۴۷ء

۲۳- الفریڈ جو انگلستان کا بادشاہ تھا اس کی مدح
اور تعریف کا بیان (نمبر ۱۱) ۴؍جون ۱۸۴۷ء

۲۴- حال حضرت اکبر بادشاہ دہلی کا (نمبر ۱۳) جولائی ۱۸۴۷ء

۲۵- حال دوست محمد خاں والی کابل کا (نمبر ۱۵) ۹؍اگست ۱۸۴۷ء

۲۶- ذکر شیر شاہ افغان (نمبر ۱۸) ۲۰؍ستمبر ۱۸۴۷ء

۲۷- حال نپولین بونا پارٹ کا (نمبر ۱۸) ۲۰؍ستمبر ۱۸۴۷ء

۲۸- حال فردوسی کا (نمبر ۱۹) ۴؍اکتوبر ۱۸۴۷ء

۲۹- حال نواب شجاع الدولہ (از محبِ ہند) (نمبر ۲۰) ۱۸؍اکتوبر ۱۸۴۷ء

۳۰- حال مہاراجہ شیر سنگھ والی لاہور (نمبر ۲۱) یکم نومبر ۱۸۴۷ء

۳۱- حال دایوجینیس کا جو ایک حکمائے یونان میں سے تھا (نمبر ۲۲) ۱۵؍نومبر ۱۸۴۷ء

۳۲- جیمس اوّل کے زمانے میں جو خوفناک
سازش ہوئی تھی اس کا بیان (نمبر ۲۳) ۲۹؍نومبر ۱۸۴۷ء

۳۳- حال نواب آصف الدولہ (نمبر ۲۳) ۲۹؍نومبر ۱۸۴۷ء

۱۸۴۸ء جلد سوم

۳۴- حال مہاراجہ پرتاپ سنگھ والی ستارہ (نمبر ۶) ۲۰؍مارچ ۱۸۴۸ء

۳۵- ذکر شہنشاہ اگسٹس کا جو کہ بہت مشہور
بادشاہ روم میں ہوا ہے (نمبر ۷) ۳؍اپریل ۱۸۴۸ء

۳۶- حال بادشاہ پررس (نمبر ۸) ۱۷؍اپریل ۱۸۴۸ء

۳۷- حال اولیور کرام ویل- غاصب تخت انگلستان کا (نمبر ۱۱) ۱۰؍جون ۱۸۴۸ء

۳۸- گلیلو صاحب کا حال (نمبر ۱۴) ۱۰؍جولائی ۱۸۴۸ء

۳۹- حال کھنڈرات تخت جمشید کا ملک — (نمبر ۱۵) ۲۴/جولائی ۱۸۴۸ء

۴۰- ملک یونان — (نمبر ۱۵) ۲۴/جولائی ۱۸۴۸ء

۴۱- حال سر ولیم ہرشل کا — (نمبر ۱۶) ۷/اگست ۱۸۴۸ء

۴۲- خصلت اور مذہب مختلف ملکوں کا — (نمبر ۱۷) ۲۱/اگست ۱۸۴۸ء

۴۳- بیان طریق تحریر کا جو مصریوں میں مروّج تھا — (نمبر ۱۸) ۲۴/ستمبر ۱۸۴۸ء

۴۴- حال پلوتارک کا — (نمبر ۱۹) ۱۸/ستمبر ۱۸۴۸ء

۴۵- بیان سلطنت نوشیروان عادل کا — (نمبر ۲۰) ۲/اکتوبر ۱۸۴۸ء

۴۶- حال اوطہو شہنشاہ رومیہ کبری — (نمبر ۲۱) ۱۶/اکتوبر ۱۸۴۸ء

۴۷- حال قوم گوتھا کا — (نمبر ۲۱) ۱۶/اکتوبر ۱۸۴۸ء

۴۸- حال حکیم سقراط یونانی — (نمبر ۲۵) ۱۱/ستمبر ۱۸۴۸ء

۱۸۵۰ء- جلد پنجم

۴۹- قدیم انگریزی بتوں کا حال — (نمبر ۵) ۴/مارچ ۱۸۵۰ء

۵۰- مصریوں کے ظلم کا حال — (نمبر ۶) ۱۸/مارچ ۱۸۵۰ء

۵۱- حال بابر شاہ بادشاہ از تخت نشینی تا فتح ہندوستان — (نمبر ۱۰) ۱۳/مئی ۱۸۵۰ء

۵۲- بیان تیمور تاتاری — (نمبر ۱۱) ۲۷/مئی ۱۸۵۰ء

۵۳- فوائد علم تاریخ — (نمبر ۱۲) ۱۰/جون ۱۸۵۰ء

۵۴- حال حکمائے عرب — (نمبر ۱۲) ۱۰/جون ۱۸۵۰ء

۵۵- رر (بقیہ علوم اہل اسلام کا ہندوستان میں)
صرف ونحو، عربی، منطق وفلسفہ — (نمبر ۱۳) ۲۴/جون ۱۸۵۰ء

۵۶- حال نصر اللہ بہادر خاں والی بخارا — (نمبر ۱۴) ۸/جولائی ۱۸۵۰ء

۵۷- حال بقیہ علوم اہل اسلام کا ہندوستان میں
تصوف، رمل و جفر واحکام نجوم (نمبر ۱۷) یکم اگست ۱۸۵۰ء

۵۸- حال شہنشاہ سکندر کا (نمبر ۱۸) ۵ر ستمبر ۱۸۵۰ء

۵۹- حال شہنشاہ الحکما اور فضلا سر اسحاق نیوطن ا (نمبر ۲۳) ۲۰ر نومبر ۱۸۵۰ء

سائنسی مضامین

۱۸۴۵ء ۱۸۴۶ء جلد اوّل

۱- طبیعات (نمبر ۱۱) ۱۱ر اگست ۱۸۴۵ء

۲- // // //

۳- // (نمبر ۱۲) ۲۵ر اگست ۱۸۴۵ء

۴- // (نمبر ۱۳) ۸ر ستمبر ۱۸۴۵ء

۵- // (نمبر ۱۴) ۲۲ر ستمبر ۱۸۴۵ء

۶- بیان پن چکی کا (نمبر ۱۵) ۶ر اکتوبر ۱۸۴۵ء

۷- // (نمبر ۱۸) ۱۷ر نومبر ۱۸۴۵ء

۸- پیمائش کمپاس کا (نمبر ۱۹) یکم دسمبر ۱۸۴۵ء

۹- کسوف اور خسوف کے بیان میں (نمبر ۲۱) ۲۹ر دسمبر ۱۸۴۵ء

۱۰- اصول علم حساب جزئیات وکلیات // //

۱۱- جبر و مقابلہ // //

۱۲- طبیعات (نمبر ۲۲) ۲۲ر جنوری ۱۸۴۶ء

۱۳- // (نمبر ۲۵) ۲۳ فروری ۱۸۴۶ء

۱۴- طبیعات	(نمبر۲۶) ۹/مارچ ۱۸۴۶ء
۱۵- ″	(نمبر۲۸) ۶/اپریل ۱۸۴۶ء
۱۶- معرفت طبیعی	(نمبر۲۸) ۶/اپریل ۱۸۴۶ء
۱۷- ویل[1]	(نمبر۳۰) ۴/مئی ۱۸۴۶ء
۱۸- ہپو پوٹیمس	(نمبر۳۱) ۱۸/مئی ۱۸۴۶ء
۱۹- حال ایک نئے آلے کا جس کے ذریعے گولے بطور توپ کے پھینکے جاسکتے ہیں	(نمبر۳۲) یکم جون ۱۸۴۶ء
۲۰- حال درختوں کا جونزدیک شہر کعارہ کے جو دارالخلافہ مصر کا ہے واقع ہیں اور پتھر بن گئے ہیں	″ ″
۲۱- مجمل حال قوس قزح کا	(نمبر۳۵) ۱۳جولائی ۱۸۴۶ء
۲۲- حال ایک عجب قسم کے چیونٹوں کا	(نمبر۳۷) ۱۰/اگست ۱۸۴۶
۲۳- علم طبیعی	″ ″
۲۴- ٹیلی گراف	(نمبر۳۸) ۲۴اگست ۱۸۴۶ء
۲۵- حال درخت بڑ کا	″ ″
۲۶- علمِ طبیعی	″ ″
۲۷- درباب دخانی کشتی کے	(نمبر۴۱) ۴/اکتوبر ۱۸۴۶ء
۲۸- درباب روشنی کے	″ ″
۲۹- علم طبیعی	″ ″
۳۰- چرخی کا بیان	(نمبر۴۲) ۱۹/اکتوبر ۱۸۴۶ء
۳۱- چرخی کا بیان	(نمبر۴۲) ۱۹/اکتوبر ۱۸۴۶ء

---

[1] Whale

۳۲- علم طبیعی	〃 〃
۳۳- حال علم ادات کا	(نمبر۴۴) ۱۵ر نومبر ۱۸۴۶ء
۳۴- حال مس مریزم کا	〃 〃
۳۵- حال علم ہیئت	〃 〃
۳۶- علم طبیعی	〃 〃
۳۷- حال گردش زمین کا	(نمبر۴۵) ۳۰ر نومبر ۱۸۴۶ء
۳۸- مقناطیس بنانے کی ترکیب	〃 〃
۳۹- بیان بلون[ل] یعنی برج ہوا کا	(نمبر۴۶) ۱۴ر دسمبر ۱۸۴۶ء
۴۰- حال گردزمین	〃 〃
۴۱- حال باعث زیادتی ہونے نزلہ اور زکام کے	(نمبر۴۷) ۲۸ر دسمبر ۱۸۴۶ء
۴۲- تتمہ حال نزلہ اور زکام کا	(نمبر۴۸) ۱۱ر جنوری ۱۸۴۷ء
۴۳- علم طبیعی	〃 〃

۱۸۴۷ء- جلد دوم

۴۴- علم ادات	(نمبر۱) ۲۵ر جنوری ۱۸۴۷ء
۴۵- طبیعات آواز کے بیان میں	(نمبر۲) ۸ر فروری ۱۸۴۷ء
۴۶- علم ہیئت	(نمبر۳) ۲۲ر فروری ۱۸۴۷ء
۴۷- علم ادات	(نمبر۴) ۸ر مارچ ۱۸۴۷ء
۴۸- علم جرثقیل کے بیان میں	(نمبر۶) ۵ر اپریل ۱۸۴۷ء
۴۹- مریخ ستارے کا بیان	(نمبر۱۱) ۱۴ر جون ۱۸۴۷ء

Baloon ل

۵۰- حال تعجبی بھونچالوں کا	(نمبر۱۲) ۱۸رجون ۱۸۴۷ء
۵۱- بیان ثابت کرنے گولائی زمین کا	// //
۵۲- حال ستارہ مشتری کا	(نمبر۱۳) ۱۲رجولائی ۱۸۴۷ء
۵۳- حال دوربین کا	(نمبر۱۷) ۶رستمبر ۱۸۴۷ء
۵۴- حال دم دار ستاروں کا	// //
۵۵- حال تقویم کا مع تقویم ماہ اکتوبر	(نمبر۱۹) ۴راکتوبر ۱۸۴۷ء

<u>سنہ ۱۸۴۸ء - جلد سوم</u>

۵۶- چھاپے کی ایجاد کا بیان	(نمبر۴) ۲۱رفروری ۱۸۴۸ء
۵۷- دورہ خوان کے بیان میں	(نمبر۵) رمارچ ۱۸۴۸ء
۵۸- حال جانور فلیا کا	(نمبر۷) ۳راپریل ۱۸۴۸ء
۵۹- درباب ہوا کے	(نمبر۸) ۱۷راپریل ۱۸۴۸ء
۶۰- حال ایس بس ٹوس کا اور اس کپڑے کا جس پر آگ اثر نہیں کرتی	// //
۶۱- کرہ زمین کی مقدار کے بارے میں	(نمبر۱۰) ۱۵رمئی ۱۸۴۸ء
۶۲- الماس یعنی ہیرا	(نمبر۱۰) ۱۵رمئی ۱۸۴۸ء
۶۳- طریق دریافت کرنے شروع سال ہجری کا مطابق سال عیسوی کے	(نمبر۱۱) ۲۹رمئی ۱۸۴۸ء
۶۴- کمی باران رحمت کی ہندوستان میں	(نمبر۱۲) جون ۱۸۴۸ء
۶۵- حال تبدیل فصل کا	(نمبر۱۳) ۲۶رجون ۱۸۴۸ء
۶۶- صنعت الٰہی (عود بلاؤ)	(نمبر۱۶) ۷راگست ۱۸۴۸ء

۶۷- حال جانور سیل کا	(نمبر ۱۷) یکم اگست ۱۸۴۸ء
۶۸- وجود کیٹروں کا پانی میں ۱۸۵۰ء جلد پنجم	(نمبر ۲۰) ۲/ اکتوبر ۱۸۴۸ء
۶۹- درباب معراج[1] جو بسبب انحراف شعاع آفاب کے نئے طور سے ظہور میں آتا ہے	(نمبر ۷) یکم اپریل ۱۸۵۰ء
۷۰- کلک متکلم	(نمبر ۷) یکم اپریل ۱۸۵۰ء
۷۱- حال بیرومیٹر	(نمبر ۱۸) ۵/ ستمبر ۱۸۵۰ء
۷۲- چھلاوہ	(نمبر ۲۱) ۲۰/ اکتوبر ۱۸۵۰ء
۷۳- وجود کیڑوں کا پانی میں	// //
۷۴- بیان سیماب	// //
۷۵- طبیعیات	(نمبر ۲۲) ۵/ نومبر ۱۸۵۰ء
۷۶- بیان آواز کا	(نمبر ۲۵) ۲۰/ دسمبر ۱۸۵۰ء

۱۸۵۱ء جلد ششم

۷۷- (بقیہ) بیچ بیان منعکس ہونے آواز کے	(نمبر ۱) ۵/ جنوری ۱۸۵۱ء
۷۸- بیچ بیان حیوان کے کان کے	(نمبر ۱) ۵/ جنوری ۱۸۵۱ء
۷۹- انحراف شعاع روشنی	// //
۸۰- احوال برق وصاعقہ	// //
۸۱- حرارت زمین	(نمبر ۳) ۵/ فروری ۱۸۵۱ء
۸۲- بیچ بیان بخار بن جانے کے	(نمبر ۴) ۲۰/ فروری ۱۸۵۱ء
۸۳- بیچ بیان آب کاری کے	// //
۸۴- جغرافیہ	(نمبر ۵) ۵/ مارچ ۱۸۵۱ء

---

[1] Mirage

اخلاقی و اصلاحی مضامین

۱۸۴۷ء - ۱۸۴۶ء جلد اوّل

۱- علم اخلاق	(نمبر ۲۴) ۹ر فروری ۱۸۴۶ء
۲- استقلال	(نمبر ۲۸ر اپریل ۱۸۴۶ء
۳- رشوت	(نمبر ۳۱) ۱۸ر مئی ۱۸۴۶ء
۴- ذکر درباب رشوت کے	(نمبر ۳۵) ۱۳ جولائی ۱۸۴۶ء
۵- دولت بہم پہنچاتی ہے دوستوں کو اور مفلسی امتحان کرتی ہے ان کا	(نمبر ۳۷) ۱۰ر اگست ۱۸۴۶
۶- بیان اعتدال کے فوائد کا	(نمبر ۴۲) ۱۹ر اکتوبر ۱۸۴۶ء
۷- کفایت شعاری	(نمبر ۴۶) ۱۴ر دسمبر ۱۸۴۶ء
۸- حال سخاوت کا	(نمبر ۴۷) ۲۸ر دسمبر ۱۸۴۶ء
۹- حال خرابیوں سخاوت بے جا کا	(نمبر ۴۸) ۱۱ر جنوری ۱۸۴۷ء

۱۸۴۷ء جلد - دوم

۱۰- سستی کے بیان	(نمبر ۱) ۲۵ر جنوری ۱۸۴۷ء
۱۱- مکاری کے بیان میں	// //
۱۲- اوقات کے صرف کے بیان میں	// //
۱۳- حال تربیت لڑکیوں کا	(نمبر ۲) ۸ر فروری ۱۸۴۷ء
۱۴- درباب صرف کرنے وقت کے	// //
۱۵- خوشامد	// //

۱۶- غرور (نمبر۳) ۲۲رفروری ۱۸۴۷ء

۱۷- صبر " "

۱۸- بیماری " "

۱۹- حسد (نمبر۴) ۸رمارچ ۱۸۴۷ء

۲۰- غصہ " "

۲۱- بے رحمی " "

۲۲- عبادت " "

۲۳- اسبابِ خوشی کے بیان میں (نمبر۵) ۲۲رمارچ ۱۸۴۷ء

۲۴- فوائد نیک نامی کے بیان میں (نمبر۶) ۵راپریل ۱۸۴۷ء

۲۵- اچھی تربیت کے فوائد کے بیان میں " "

۲۶- شجاعت کے بیان میں (نمبر۷) ۲۹راپریل ۱۸۴۷ء

۲۷- خوش اخلاقی کے بیان میں " "

۲۸- عالی حوصلہ ہونا (نمبر۷) ۲۹راپریل ۱۸۴۷ء

۲۹- عاقبت کے باب میں (نمبر۸) ۳رمئی ۱۸۴۷ء

۳۰- تعصب کے بیان میں " "

۳۱- حال توجہ سلف کا " "

۳۲- سچ بولنے کے فائدے (نمبر۹) ۱۷رمئی ۱۸۴۷ء

۳۳- ہم دردی اور مروّت کے بیان میں " "

۳۴- بلند نظری کے بیان میں (نمبر۱۰) ۳۱رمئی ۱۸۴۷ء

۳۵- صفائی دل کی (نمبر۱۲) ۱۸رجون ۱۸۴۷ء

۳۶- سیاحی کے بیان میں " "

۳۷- برداشت " "

۳۸- بیان مصیبتوں کا جو انسان پر نازل ہوتی ہیں (نمبر۱۷) ۶ر ستمبر ۱۸۴۷ء

۳۹- عادت (نمبر۲۰) ۱۸ر اکتوبر ۱۸۴۷ء

۴۰- فصاحت کے بیان میں (نمبر۲۲) ۱۵ر نومبر ۱۸۴۷ء

۱۸۴۸ء جلد- سوم

۴۱- درباب محنت کے (نمبر۸) ۱۷ر اپریل ۱۸۴۸ء

۴۲- اثبات صانع حقیقی کا // //

۴۳- بیان اس بات کا کہ زبردستی معاوضہ نہ کرنا چاہیے // //

۴۴- علم اخلاق (نمبر۱۰) ۱۵ر مئی ۱۸۴۸ء

۴۵- اقوال حکیم اسقل نیوس // //

۴۶- خوش آئند اور قابل ادب کے نیکیں (نمبر۱۱) ۲۹ر مئی ۱۸۴۸ء

۴۷- غیبت (نمبر۱۲) ۱۲ر جون ۱۸۴۸ء

۴۸- موت // //

۴۹- تشریح ان برائیوں کی جو بسبب دست اندازی
کے مال غیر پر پیدا ہوتی ہیں (نمبر۱۴) ۱۰ر جولائی ۱۸۴۸ء

۵۰- اخلاق (نمبر۱۵) ۲۴ر جولائی ۱۸۴۸ء

۵۱- فرض مربیوں کا طرف ان کے بچوں کے (نمبر۱۹) ۱۸ر ستمبر ۱۸۴۸ء

۵۲- نیک خصلت مشہور ہونے کا بیان (نمبر۲۱) ۱۶ر اکتوبر ۱۸۴۸ء

۱۸۵۰ء جلد- پنجم

۵۳- حکیم سقراط کی نصیحت درباب عبادت الٰہی کے (نمبر۳) ۴ر فروری ۱۸۵۰ء

۵۴- اُمید (نمبر۱۸) ۵ر ستمبر ۱۸۵۰ء

۵۵- میلان بچوں کا طرف نقل کرنے کے (نمبر۱۹) ۲۰ر ستمبر ۱۸۵۰ء

۵۶- طریق زندگی انسانی (طفولیت، جوانی) 〃 〃

۵۷- ترکیب جس سے کہ آدمی محنتی ہو جاویں

(یہ ضروری ہے کہ نتیجے سستی کے سہنے دے دیں (نمبر۲۲) ۵ر نومبر ۱۸۵۰ء

۵۸- زیادتی محنت کی منحصر ہے اوپر افزائش عقل کے (نمبر۲۳) ۲۰ر نومبر ۱۸۵۰ء

۱۸۵۱ء جلد- ششم

۵۹- کہانی دریاب راستی اور بطلان کے (نمبر۵) ۵ر مارچ ۱۸۵۱ء

۶۰- اوباش کی سزا بعد مرنے کے (نمبر۱۰) ۲۰ر مئی ۱۸۵۱ء

۶۱- بیان ریاضت کا (نمبر۱۴) ۲۰ر جولائی ۱۸۵۱ء

۶۲- درباب بلند نظری کے (نمبر۱۷) ۷ر اکتوبر ۱۸۵۱ء

سیاسی، سماجی و معاشی مضامین

۱۸۴۶ء- ۱۸۴۵ء جلد- اوّل

۱- فوایدعلوم (نمبر۱) ۲۳ر مارچ ۱۸۴۵ء

۲- بیان سرکار کمپنی انگریزی کا (نمبر۲) ۶ر اپریل ۱۸۴۵ء

۳- قواعد سیاست 〃 〃

(نمبر۳) ۲۰ر اپریل ۱۸۴۵ء

۴- 〃 〃

(نمبر۴) ۴ر مئی ۱۸۴۵ء

۵- قواعد سیاست

۶- ذکر سرکار کمپنی انگریزی کا 〃 〃

۷- باعث کم رواج ہونے علوم کا ہندوستان میں (نمبر۵) ۱۸ر مئی ۱۸۴۵ء

۸- حالات گورنمنٹ — (نمبر۹) ۱۴؍جولائی ۱۸۴۵ء

۹- // // — (نمبر۱۰) ۲۸؍جولائی ۱۸۴۵ء

۱۰- // // — (نمبر۱۱) ۱۱؍اگست ۱۸۴۵ء

۱۱- // // — (نمبر۱۲) ۲۵؍اگست ۱۸۴۵ء

۱۲- بیچ بیان تعریف سزا و غایت سزا کے — (نمبر۱۹) یکم دسمبر ۱۸۴۵ء

۱۳- بہت خرچ کرنا شادیوں میں — // //

۱۴- اصول قوانین — // //

۱۵- تربیت لڑکوں کی ہندوستان میں — (نمبر۲۰) ۱۵؍دسمبر ۱۸۴۵ء

۱۶- // // — (نمبر۲۱) ۲۹؍دسمبر ۱۸۴۵ء

۱۷- تربیت کرنا لڑکیوں کا — (نمبر۲۲) ۱۲؍جنوری ۱۸۴۶ء

۱۸- اصول انتظام مدن — (نمبر۳۰) ۴؍مئی ۱۸۴۶ء

۱۹- درباب آزادی محنت کے — (نمبر۴۰) ۲۱؍ستمبر ۱۸۴۶ء

۲۰- درباب تحصیل علم — (نمبر۴۳) یکم نومبر ۱۸۴۶ء

۱۸۴۷ء جلد - دوم

۲۱- درباب رفاہ خلقت ہندوستان کے — (نمبر۲) ۸؍فروری ۱۸۴۷ء

۲۲- تحصیل علم — (نمبر۳) ۲۲؍فروری ۱۸۴۷ء

۲۳- لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں — // //

۲۴- تجارت کے فائدے کے بیان میں — (نمبر۵) ۲۲؍مارچ ۱۸۴۷ء

۲۵- تربیت کرنا بچوں کا ابتدائے عمر میں — (نمبر۱۱) ۱۴؍جون ۱۸۴۷ء

۲۶- بدلنا بیرونی حالت انسان کا اکثر
مخالف کر دیتا ہے نیکی سے (نمبر۱۱) ۱۴/جون ۱۸۴۷ء

۲۷- چھوٹی عمر میں شادی کرنے کے نقصان (نمبر۱۳) ۱۲/جولائی ۱۸۴۷ء

۲۸- رائے ایک انگریز کی درباب تربیت اہل ہند کے (نمبر۱۹) ۱۴/اکتوبر ۱۸۴۷ء

۲۹- ترقی ہونا ہر بات کا انگریز کی عمل داری میں (نمبر۲۰) ۲۹/اکتوبر ۱۸۴۷ء

۱۸۴۸ء جلد-سوم

۳۰- مجلسوں کے بیان میں (نمبر۵) ۶/مارچ ۱۸۴۸ء

۳۱- ضرورت حکام کے باب میں (نمبر۹) یکم مئی ۱۸۴۸ء

۳۲- حال گورنمنٹ انگریزی ہندوستان کا (نمبر۱۰) ۱۵/مئی ۱۸۴۸ء

۳۳- حال دہلی (اعداد و شمار) (نمبر۱۵) ۲۴/جولائی ۱۸۴۸ء

۱۸۵۰ء جلد-پنجم

۳۴- تفصیل آمدنی و خرچ ہندوستان بابت
۱۸۴۴-۴۵ء، ۱۸۴۵-۴۶ء (نمبر۴) ۱۸/فروری ۱۸۵۰ء

۳۵- تفصیل اس روپے کی جو بابت ہندوستان کے
ولایت انگلستان میں صرف ہوتا ہے " "

۳۶- بیان فوائد کوٹھی صرافے کا اس صورت میں جب
وہ واسطے قرض دینے روپے کے مقرر ہو (نمبر۱۲) ۱۰/جون ۱۸۵۰ء

۱۸۵۱ء جلد-ششم

۳۷- حکومت کی باتوں کو تحقیق کرنے کا طریق (نمبر۲۰) ۲۰/نمبر ۱۸۵۰ء

تاریخی مقامات وعمارات

۱۸۴۵ء - ۱۸۴۶ء جلد اوّل

۱- نقشہ گیاجی مندر کا (نمبر ۳۴) ۲۹/جون ۱۸۴۶ء

۲- حال ایک مینار کا جو شہر نین کن یعنی دارالخلافہ چین میں واقع ہے (نمبر ۴۰) ۲۱/ستمبر ۱۸۴۶ء

۱۸۴۷ء جلد - دوم

۳- بیان قلعہ چہل ستون واقع شہر الہٰ آباد کا (نمبر ۱) ۲۵/جنوری ۱۸۴۷ء

۴- بیان عبادت گاہ عیسائی کا جو شہر سکندریہ میں واقع ہے (نمبر ۳) ۲۲/فروری ۱۸۴۷ء

۵- حال مقبرہ واقع شہر قاہرہ دارالسلطنت ملک مصر (نمبر ۴) ۸/مارچ ۱۸۴۷ء

۶- تذکرہ اس عمارت اور مینار کا جسے انگریزی میں بلیک ہول کہتے ہیں اور کلکتہ میں واقع ہے (نمبر ۵) ۲۲/مارچ ۱۸۴۷ء

۷- حال تماشا گاہ روم کا (نمبر ۶) ۵/اپریل ۱۸۴۷ء

۸- بیان بادشاہی محل کا جو شہر غرناطہ میں واقع ہے (نمبر ۸) ۳/مئی ۱۸۴۷ء

۹- حال بت شہزادہ ایل برٹ بہادر (نمبر ۱۹) ۴/اکتوبر ۱۸۴۷ء

۱۰- دہلی کے قلعہ معلیٰ کا حال (نمبر ۲۰) ۱۸/اکتوبر ۱۸۴۷ء

۱۸۴۸ء جلد - سوم

۱۱- عبادت خانہ سینٹ پال کا بیان (نمبر ۵) ۶/مارچ ۱۸۴۸ء

۱۲- حال مقبرہ حیدر علی کا (نمبر ۱۴) ۱۰/جولائی ۱۸۴۸ء

۱۳- درباب عمارات اور بت مصریوں کے (نمبر ۱۸) ۴/ستمبر ۱۸۴۸ء

متفرقات

۱۸۴۶ء جلد - اوّل

۱- جزیرہ سیلون یعنی لنکا سے موتی نکالنے کا بیان (نمبر ۴۱) ۱۴/اکتوبر ۱۸۶ء

۲- حال روشنی کے معیار (نمبر ۴۳) یکم نومبر ۱۸۴۶ء)

۱۸۴۷ء جلد دوم

۳- دلچسپ بیان نمک کا (نمبر ۶) ۵/اپریل ۱۸۴۷ء

۴- بیان سڑک آہنی کا (نمبر ۷) ۲۹/اپریل ۱۸۴۷ء

۵- فواروں قدرتی کا حال (نمبر ۹) ۱۷/مئی ۱۸۴۷ء

۶- حال نوجوانی 〃 〃

۷- تجویم مکالے صاحب کی درباب تربیت
کرنے رعایا کے کچہری پارلی منٹ میں (نمبر ۱۴) ۲۶/جولائی ۱۸۴۷ء

۸- حال دیو اور بالشتیوں کا (نمبر ۱۵) ۹/اگست ۱۸۴۷ء

۹- عجیب وغریب حالات کشمیر جنت نظیر (نمبر ۱۶) ۲۳/اگست ۱۸۴۷ء

۱۸۴۸ء جلد - سوم

۱۰- جزیرہ فیرو میں شکار کس طرح کھیلتے ہیں (نمبر ۵) ۶/مارچ ۱۸۴۸ء

۱۱- حال جزیروں کا (نمبر ۱۱) ۲۹/مئی ۱۸۴۸ء

۱۲- چشموں اور دریاؤں کا بیان 〃 〃

۱۳- ظاہر ہونا نئی دنیا اور حال وہاں کے باشندوں کا (نمبر ۱۹) ۱۸/ستمبر ۱۸۴۸ء

۱۴- حال شہر لندن کا (نمبر ۲۰) ۲/اکتوبر ۱۸۴۸ء

۱۵- حال دریاے نیل کا جو ملک مصر میں بہتا ہے (نمبر ۲۶) ۲۵/دسمبر ۱۸۴۸ء

۱۶- دیو اور بونے وغیروں کا حال (نمبر۵) ۴/مارچ ۱۸۵۰ء

۱۷- اخبار ظریف لندن[۱] (نمبر۷) ۱۵/اپریل ۱۸۵۰ء

۱۸- جزیرہ طلائی کیلی فورنیا ″ ″

۱۹- میلہ ہردوار کا بیان (نمبر۷) یکم اپریل ۱۸۵۰ء

۲۰- وس ویس کوہ آتش خیز ″ ″

۲۱- حال خروج پہاڑ آتشی وس ویس کا جو ملک نیپلز میں واقع (نمبر۱۴) ۸/جولائی ۱۸۵۰ء

۲۲- طریقہ اہل طبت[۲] کا اوّل منزل پہنچانے
میں ان کے مردوں کے (نمبر۱۸) ۵/ستمبر ۱۸۵۰ء

۲۳- کچھ حال متعلق عربستان (نمبر۲۱) ۲۰/اکتوبر ۱۸۵۰ء

مضامین خیر خواہ ہند و محبّ ہند

خیر خواہ ہند یا محبّ ہند کے بہت کم رسائل دستیاب ہیں۔ اسی لیے محبّ ہند میں شائع ہونے والے رام چندر کے مضامین کی یہ فہرست بہت مختصر ہے۔ ان میں سے متعدد مضامین محبّ ہند کے علاوہ فوائد الناظرین اور قرآن السعدین کے صفحات پر بھی نظر آتے ہیں۔

سائنسی مضامین

۱- علم ہیئت۔ ستاروں کا بیان۔[۳] اکتوبر ۱۸۴۷ء

۲- حساب کسوف اور خسوف کا جس سے یہ معلوم ہو جائے گا
کہ کون سی تاریخ فلانے سال میں چاند گرہن ہوگا جنوری ۱۸۴۸ء

۱- Punch

۲- تبت

۳- فوائد الناظرین، ۱۸/اکتوبر ۱۸۴۷ء، (نمبر-۲۰، جلد دوم)

۳- بیان برف بارش و برف علم و باعث مینہ وابر۔ بیان آب فروری ۱۸۴۸ء

۴- ایک عجیب حال حکمایان و عاقلان یورپ کی تحقیقات
میں سے (Divisibility of matter) فروری ۱۸۴۸ء

۵- ذکر ڈای ونگ بل (Diving Bell) یعنی وہ کل
جس سے ڈوبا ہوا اسباب سمندر میں سے نکال سکیں // //

۶- بیان حیوانات کا مارچ و اپریل ۱۸۴۸ء

۷- خواب مئی ۱۸۴۸ء

تاریخی و سوانحی مضامین

۱- حال شہر دہلی مع نقشہ شہر دہلی کے[۱] ستمبر ۱۸۴۷ء

۲- تواریخ ولایت سراندیپ یعنی لنکا کی // //

۳- تذکرہ شاہ عباس اعظم یعنی شاہ ایران کا مع تصویر // //

۴- حال حضرت ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ
بادشاہ غازی دہلی کا مع شبیہ // //

۵- تواریخ ملک اودھ مفصل علاحدہ علاحدہ بادشاہ کی
(مع تصویر شجاع الدولہ و آصف الدولہ)[۲] اکتوبر ۱۸۴۷ء

۶- حال ڈمستھ نیز کا اپریل ۱۸۴۸ء

۷- تاریخ انگلستان مع تصویر بادشاہ ولیم دی کونکرر اور
بادشاہ رچرڈ اوّل جون ۱۸۴۸ء

۸- تاریخ راج کوئلہ // //

۹- تواریخ بنگال // //

۱۰- تاریخ خاندان مغلیہ اورنگ زیب کی سلطنت تک فروری ۱۸۴۸ء

۱۱- بقیہ تواریخ (مغلیہ) شاہ عالم اوّل سے
حضرت بہادر شاہ تک مارچ و اپریل ۱۸۴۸ء

۱۔ فوائد الناظرین، ۶؍ستمبر ۱۸۴۷ء (نمبر ۱۷، جلد دوم)

۲۔ فوائد الناظرین، ۱۸؍اکتوبر ۱۸۴۷ء (نمبر ۲۰، جلد دوم)

۱۲-	حال جولیس قیصر روم کا	مئی ۱۸۴۸ء
۱۳-	حال سر آئزک نیوٹن صاحب کا	// //
۱۴-	حال کنفیوشس کا	مئی ۱۸۴۸ء
۱۵-	تاریخ ممالک چین	فروری، مارچ، جولائی، اپریل مئی ۱۸۵۰ء
۱۶-	مختصر حال شہر دمشق اور وہاں کے باشندوں کا	جون ۱۸۵۰ء
۱۷-	مختصر حال ملک مصر کا اور وہاں کے باشندوں کا	// //
۱۸-	ذکر سکندر اعظم	اگست ۱۸۵۰ء
۱۹-	مختصر حال بخارا	اپریل ۱۸۵۰ء
۲۰-	مختصر حال شہر گوڑ قدیم دار الخلافت بنگال جس کو جنت آباد کہتے ہیں۔	مئی، ۱۸۵۰ء
۲۱-	مختصر حال تاریخ سندھ [۱]	// //

سیاسی وسماجی مضامین

۱-	باعث کم شیوع ہونے علوم مفیدہ کا ہندوستان میں [۲]	ستمبر ۱۸۴۷ء
۲-	تربیت اہل ہند کے باب میں [۳]	اکتوبر ۱۸۴۷ء
۳-	بیان طریقہ سادھوؤں کا	// //
۴-	درباب علم اخلاق کے مع رائے حکمایان ودانایان یونان (مع تصویر افلاطون)	اپریل ۱۸۴۸ء
۵-	تربیت اہل ہند کے باب میں	جون ۱۸۴۸ء

---

[۱] ملاحظہ ہو دہلی کالج میگزین قدیم دہلی کالج نمبر، ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۸ و ۱۱۳
(''ہندوستانی اخبار نویسی'' میں محمد عتیق صدیقی صاحب نے بھی ص ۳۴۶ پر محب ہند ۱۸۵۰ء کے پہلے چھ ماہ کے مضامین کے عنوانات کا انتخاب تحریر کیا ہے)۔

[۲] فوائد الناظرین، ۶ر ستمبر ۱۸۴۷ء، نمبر ۱۷، جلد دوم

[۳] فوائد الناظرین، ۱۸ر اکتوبر ۱۸۴۷ء، نمبر ۲۰، جلد دوم

کتابیات

کتابیں

۱- آزاد، محمد حسین — آبِ حیات — مطبوعہ لاہور ۱۸۵۰ء

۲- احسن (مارہروی) — تاریخ نثر اردو — علی گڑھ، ۱۹۳۰ء

۳- افتخار عالم (بلگرامی) — حیات النذیر — دہلی ۱۹۱۲ء

۴- تنہا، محمد یحییٰ — سیر المصنفین (حصہ اوّل) — دہلی ۱۹۲۴ء

۵- سیدہ جعفر، ڈاکٹر — ماسٹر رام چندر — حیدر آباد ۱۹۶۱ء

۶- صابری، امداد — فرنگیوں کا جال — دہلی ۱۸۴۹ء

۷- صدیقی، محمد عتیق — ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) — علی گڑھ ۱۹۵۷ء

۸- عابد حسین، ڈاکٹر — قومی تہذیب کا مسئلہ — علی گڑھ ۱۹۵۵ء

۹- عبدالحق، مولوی — مرحوم دہلی کالج — دہلی ۱۹۴۵ء

۱۰- فضلی، فضل علی — کربل کتھا (مقدمہ) — دہلی ۱۹۶۱ء

۱۱- کریم الدین — طبقات شعرائے ہند — دہلی ۱۸۴۸ء

۱۲- گارساں دتاسی — خطبات گارساں دتاسی — اورنگ آباد ۱۹۳۵ء

۱۳- ,, — مقالات گارساں دتاسی (حصہ اوّل و دوم) — دہلی ۱۹۴۳ء

۱۴- مالک رام — قدیم دہلی کالج، — دہلی۔

۱۵- محمد حسین خلیفہ — تاریخ پٹیالہ — امرت سر ۱۸۷۸ء

۱۶- مدنی، ظہیر الدین — اردو اسیز — بمبئی ۱۸۵۷ء

۱۷- Andrews, C.F — Zakaullah of Delhi — 1929 Cambridge

۱۸- Bailey, T. G — History of Urdu Literature — 1932 Calcutta

۱۹- Jacob, Edwin — A Memoir of Prof. Yesuda Ramchandra of Delhi — 1902 Kanpur

۲۰- Ramchandra — "A Treatise on the Problem of Maxima and Minima" — 1859 London

۲۱- Sen. S. N. — "Eighteen Fifty Seven" — 1957, New Delhi

۲۲- Spear, Percivel — "The Twilight of the Moghals" — 1951

۲۳- Tarachand — "The History of Freedom Movement in India." — 1961, New Delhi

۲۴- Thornton — Gazetteer of India : Vol. 11 of 1854

۲۵- Zellner — Education in India — 1951 Newyork

۲۶- Imperial Gazetteer of India (Provincial Series) Vol. 1 of 1908

ب۔ اخبارات ورسائل

۱- 'آج کل' (دہلی) ستمبر ۱۹۵۲ء

۲- 'اخبار الحقائق وتعلیم الخلائق' ۳/مئی ۱۸۵۱ء
(آگرہ) ۱۸/اگست ۱۹۵۲ء

۳- 'اردو' (حیدرآباد) اپریل ۱۹۳۵ء

۴- 'جامعہ' (دہلی) فروری ۱۹۴۲ء

۵- 'دہلی اردو اخبار' (دہلی) ۲۳/مئی ۱۸۴۱ء نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی۔

// ۱۸/جولائی ۱۸۵۲ء اسٹیٹ لائبریری، حیدرآباد

// ۱۷/مئی ۱۸۵۷ء نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی۔

۶- 'دہلی کالج اردو میگزین' (دہلی)
(قدیم دہلی کالج نمبر) ۱۹۵۳ء

۷- 'رسالہ دہلی سوسائٹی' (دہلی) ۱۸۶۶ء تا ۱۸۶۹ء رضا لائبریری، رام پور

'رسالہ دہلی سوسائٹی' (دہلی) ۱۸۶۶ء تا ۱۸۶۹ء و ۱۸۷۳ء، ۱۸۷۴ء عثمانیہ یونی ورسٹی لائبریری حیدرآباد

۸- 'زمانہ' (کان پور) نومبر ۱۹۰۴ء رضا لائبریری، رام پور

۹- 'فوایدالناظرین' (دہلی) ۲۳/مارچ ۱۸۴۵ء تا ۱۱/جنوری ۱۸۴۷ء ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد

// (دہلی) ۲۵/جنوری ۱۸۴۷ء
۱۲/جولائی ۱۸۴۷ء

// (دہلی) ۲۱/فروری ۱۸۴۸ء تا
۱۶/اکتوبر ۱۸۴۸ء

// (دہلی) ۱۱/دسمبر ۱۸۴۸ء تا اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد
۲۵/دسمبر ۱۸۴۸ء

// (دہلی) ۲۱/جنوری ۱۸۵۰ء تا
۲۰/دسمبر ۱۸۵۰ء

// (دہلی) ۵/جنوری ۱۸۵۱ء تا
۱۸/دسمبر ۱۸۵۱ء

اخبار	تاریخ	مقام
۱۰۔ 'قران السعدین' (دہلی)	۱۰رجنوری ۱۸۴۸ء تا ۲۵ردسمبر ۱۸۴۸ء	نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی
// (دہلی)	۲۵ردسمبر ۱۸۴۷ء	ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد
// (دہلی)	۱۲رجنوری ۱۸۵۲ء	ذخیرہ
// (دہلی)	۳۰رمئی ۱۸۵۴ء	قاسم علی سجن لال،
// //	۱۴رنومبر ۱۸۵۴ء	حیدرآباد
۱۱۔ 'محبّ ہند' (دہلی)	جنوری ۱۸۴۸ء تا جون ۱۸۴۸ء	اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد
۱۲۔ 'مخبر سرور' (بمبئی)	۲۶رفروری ۱۸۷۷ء	مملوکہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی
۱۳۔ 'مہر درخشاں' (دہلی)	۲۴رمارچ ۱۸۷۵ء	
// (دہلی)	۲راپریل ۱۸۷۵ء	
// (دہلی)	یکم مئی ۱۸۷۵ء	اسلامک ریسرچ
// (دہلی)	۱۱رستمبر ۱۸۷۷ء و	انسٹی ٹیوٹ، بمبئی
// (دہلی)	۱۱رجولائی ۱۸۷۷ء	
۱۴۔ 'نصرت الاخبار' (دہلی)	۱۱رمارچ ۱۸۷۷ء و	اسلامک ریسرچ
۱۵۔ 'نگار' (لکھنؤ)	مئی ۱۹۴۷ء	
۱۶۔ 'نوائے ادب' (بمبئی)	اپریل ۱۹۵۳ء و اکتوبر ۱۹۵۳ء	

۱۷۔ 'ہندوستانی' (الہ آباد) جنوری ۱۹۳۳ء

۱۸۔ The Journal of Royal Asiatic Society of Gr. Britain & Ireland — 1894 — (State Library, Hyderabad)

۱۹۔ Calcutta Review — Vol. xiv No. xxviii — July-Dec.1850 — (The National Archives of India, New Delhi)

۲۰۔ Islamic Culture — Hyderabad — January 1949
July 1952 — // — //

ج - دستاویزات

1. Report of the General Committee of Public Instruction for 1833 to Lord. W. C. Bentinck, G. G. in Council,

   Ref.: N. A. I; Home (Public) Deptt.: O. C. 24; 25th March 1835.

2. Letter by Asst. A. G. G. of N. W. Provinee to I.H. Tylor, Secty. of the Local Committee, dated 15th March 1839, Para 19.

   Ref.: N. A. I; Home (Public) Deptt. 1840 15th July O. C, 8-14 and Kw.

3. Note by I. R. Colvin, Private Secty. to the Governor General dated June 22, 1840.

4. Public Proceeding, Home Deptt.

   Ref.: N. A. I.: O. C., 36, 37, 38 dated 1st March- 12th April 1843

5. Letter to the Court; Ref.: N. A. I; No. 11 of 1857

6. N. A. I; Public Deptt. No. 137 of 1858

7. N. A. I; Home (Education) Deptt. No. 11-3, 1857.8 May

8. Educational Letter to the Governor General

   Ref.: N. A. I; Home (Education) Deptt. No. 10

9. Letter by Morgan to Secty. of the Court

   Ref.: N. A. I; Letters to the Court 1858.

ضمیمہ-۲

مرتبہ:- خواجہ احمد فاروقی

فہرست مضامین

خیر خواہ ہند و محبّ ہند (دہلی)

یکم ستمبر ۱۸۴۷ء تا یکم اگست ۱۸۵۰ء

خیر خواہ ہند

یکم ستمبر ۱۸۴۷ء

فہرست مضامین:

۱ حال شہر دہلی کا

۲ باعث کم شیوع ہونے علوم مفیدہ کا

۳ تاریخ جزیرہ سرندیپ یعنی لنکا کی

۴ تذکرہ شاہ عباس بادشاہ ایران کا

۵ حال مشاعرہ وغیرہ کا

۶ Assembly of the poets (تصویر)

غزلیات بہادر شاہ ظفر

مطلع　مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نور جمال تھا

کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

☆

مطلع　ہنسو دیکھ کے تدبیر کو پلٹے کھاتے

دیر لگتی نہیں تقدیر کو پلٹے کھاتے

☆

مطلع　کیا کہوں دل مائل زلفِ دوتا کیوں کر ہوا

یہ بھلا چنگا گرفتارِ بلا کیوں کر ہوا

☆

مطلع　روئے جو دل کھول کر ٹکڑے جگر ہونے لگا

اور اگر رونے کو روکا درد سر ہونے لگا

خیر خواہ ہند

اکتوبر ۱۸۴۷ء

فہرست مضامین:

۱　تواریخ ملک اودھ

۲　تربیتِ اہلِ ہند کا بیان

۳　بیان طریقہ سادھو(ؤ)ں کا

۴　علم ہیئت

۵ اشعار قصیدہ شیخ ابراہیم ذوق ع

سریر آرائے گردوں جب تلک سلطان خاور ہو

محبّ ہند

سرورق: نومبر ۱۸۴۷ء

اندر: یکم دسمبر ۱۸۴۷ء

فہرست مضامین:

۱ تاریخ سلطنت پنجاب

۲ حال نکلنا مسجد کا کوٹلہ فیروز شاہ میں زمین کے اندر سے (آرکی لوجیکل سوسائٹی دہلی کی حسن سعی سے)

۳۔ غزلیات شاہ دہلی

غزل ظفر:

مطلع دل کا کچھ کام نہ تجھ سے بت پرفن نکلا

دوست جانا تھا تجھے جان کا دشمن نکلا

☆

میں ہوں عاشق مجھے غم کھانے سے انکار نہیں کہ ہے غم میری غذا

تو ہے معشوق تجھے غم سے سروکار نہیں کھائے غم تیری بلا

☆

مثلث ظفر (ابتدا)

مرے قاصد سے پہنچا مرغ دل ہو نامہ بر پہلے

مثلث ظفر (ابتدا)

ستم در پردہ کرتے (ہو) بظاہر پیار کرتے ہو

غزلیات (؟) حضور شاہ دہلی متخلص بہ ظفر

مطلع　غم دل کس سے کہوں کوئی بھی غم خوار نہیں　　غم فرقت کے سوا
اور اگر پوچھے کوئی قابل اظہار نہیں　　چپکا رہنا ہے بھلا

محبّ ہند

سرورق: یکم جنوری ۱۸۴۸ء

اندر: دسمبر ۱۸۴۷ء

فہرست مضامین:

۱　تاریخ خاندان مغلیہ اورنگ زیب کی سلطنت تک

۲　بیان برف بارش و برف علم و باعث مینہ وابر نیسان اب (؟)

۳　ایک حال عجیب حکمایان اور عاقلان کی تحقیقات میں سے

۴　ذکر Diving Bell ڈائی ونگ بل جس سے ڈوبا ہوا اسباب سمندر میں سے نکال سکیں۔

۵　غزلیات، جرأت

مطلع　اب بتا دل میں ترے اے بت عیار ہے کیا
بولتا کیوں نہیں دل لے کے تو بیزار ہے کیا

☆

مطلع　کیوں نہ لرزاں ہو سراپا تن لاغر میرا
سخت بے چین ہے بر میں دل مضطر میرا

☆

مطلع　کب کوئی تجھ سا آئنہ رویاں ہے دوسرا
ہے تو ترا ہی عکس نمایاں ہے دوسرا

☆

محبّ ہند

یکم مارچ ۱۸۴۸ء

فہرست مضامین :

۱ بقیہ تاریخ بوندی

۲ حال جولیس قیصر روم کا

۳ خواب

۴ حال نیوٹن صاحب کا

۵ حال کن فیوشس کا

۶ سڑک آہنی، ریلوے

محب ہند

یکم جون ۱۸۴۸ء

فہرست مضامین :

۱ تاریخ انگلستان

۲ تاریخ کوٹلہ

۳ مضمون تربیت اہل ہند کے باب میں

محب ہند

یکم جولائی ۱۸۴۸ء

فہرست مضامین :

۱ تاریخ انگلستان

۲ بقیہ تاریخ کوٹلہ

۳ حال سر وفصیح کا

۴ قسطنطن کا

۵ حال (Crichton) کرائی ٹن کا

محب ہند

اگست ۱۸۴۸ء

فہرست مضامین:

۱ تاریخ جے پور

۲ بقیہ تاریخ انگلستان

۳ حال جسم اور عقل انسان کا

محب ہند

اکتوبر ۱۸۴۸ء

فہرست مضامین:

۱ بقیہ تاریخ جے پور

۲ انسان کی عقل کا بیان

۳ حال مادہ کا

۴ بقیہ تاریخ انگلستان

۵ سوال و جواب از رسالہ ارسطو

۶ امور مختلفہ

۷ غزل ظفر

مطلع

گہر دنداں دہاں نور علی نور
زباں شیریں بیاں نور علی نور

محب ہند

یکم نومبر ۱۸۴۸ء

فہرست مضامین:

١ تاریخ ایران

٢ تاریخ انگلستان

٣ خلاصہ تاریخ سابقہ ممالک ہند از روے فرشتہ

٤ غزلیات حضور والا و مرزا صائب

ظفر:

مطلع مرا تو حال ہونا آپ کی فرقت میں یوں ہی تھا
مجھے شکوہ نہیں تم سے میری قسمت میں یوں ہی تھا

☆

مطلع عشق میں اوستاد یاں تک آپ کا مفتوں ہوا
دشت میں شاگرد اس کا آن کر مجنوں ہوا

☆

مطلع نالہ ہے برق فشاں سوز جگر کی دولت
ابر نیساں ہے مژہ دیدۂ تر کی دولت

☆

مطلع کہہ بیٹھوں جو سوز غم ہجراں کی حقیقت
کچھ بھی نہ رہے آتش سوزاں کی حقیقت

محبّ ہند

یکم دسمبر۔ ١٨٤٨ء

فہرست مضامین:

١ تاریخ ایران

۲ علم کیمیا

۳ تاریخ انگلستان

۴ حال سرکار کمپنی بہادر کا

۵ غزلیات حضور والا:

مطلع باتوں باتوں میں جو وہ مجھ سے بگڑ کر رہ گیا
غیر تو اپنا کلیجہ ہی پکڑ کر رہ گیا

☆

مطلع جب کہ وہ خط پڑھ کے بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا
دل خطاواروں کا دھڑکا اور دھڑک کر رہ گیا

☆

مطلع غمزہ وہ برسر بیداد آیا مژدہ اے مرگ کہ جلاد آیا

مطلع جو دل میں تیرا شوق گیسوئے خمار ہو پیدا
عجب کیا کفر کعبہ سے اگر اے یار ہو پیدا

محبّ ہند

جنوری ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین:

۱ بقیہ تاریخ ایران

۲ علم کیمیا

۳ حال دلچسپ ٹیپو سلطان سریر آرائے دکن مع تاریخ شہادت بزبان فارسی متضمن تعزیت بادشاہ جم جاہ ٹیپو سلطان فردوس مکان کہ در ماہ ذی قعد ۱۲۱۳ھ واقع ہوئی و مع شبیہہ والا شان ٹیپو سلطان، اسم شاعر و مصنف معلوم نیست۔

محبّ ہند

یکم فروری ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین:

۱ حالات نواب حیدر علی خاں والیِ میسور

۲ حال بادشاہت کابل

۳ قواعد انگریزی گورنمنٹ کے

۴ طریقہ حج اہل اسلام

۵ امور مفیدہ مختلفہ

۶ غزلیات ظفر:

مطلع جگر برشتہ و جاں خستہ دل فگار دریغ
ہزار حسرت و صد حیف و صد ہزار دریغ

☆

مطلع عشق آفت ہے نہیں ناصح کا فرمانا دروغ
ہے اسے آفت میں آنا جن نے یہ جانا دروغ

مطلع ہر طرح غیر کی دلجوئی ہے معقول چہ خوش
ہم سے ہر بات پہ بد خوئی ہے معقول چہ خوش

☆

مطلع کرتے ہیں بہت صاحب تدبیر پس و پیش
پر دیکھیے کیا کرتی ہے تقدیر پس و پیش

☆

مطلع بجز ادائے ستم کچھ نہیں ترا اخلاص
یہی ادا ہے تو بس ہو چکا ادا اخلاص

محب ہند

یکم مارچ ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین :

۱ حال سلطنت لارداک لند بہادر

۲ تواریخ ممالک سندھ وٹھ

۳ حال دلچسپ سکّوں زمانہ قدیم کا

محبّ ہند

اپریل ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین:

۱ ذکر سلاطین ملتان

۲ تاریخ کشمیر

۳ خلاصہ تاریخ جدید جنگ پنجاب

۴ نانک شاہیوں کا بیان

۵ دم دار ستاروں کا بیان

۶ اشعار چیدہ خواجہ میر درد

محبّ ہند

مئی ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین:

۱ بقیہ تاریخ کشمیر

۲ حال جانوروں عجیب کا

۳ حال اون غلطیوں کا جو ہنود نے علوم مختلفہ شاستر میں کی ہیں

محبّ ہند

جون ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین:

۱ حال ان غلطیوں کا جو کہ فاضلان ہنود نے علوم مختلفہ شاستر میں کی ہیں

۲ بقیہ حال تاریخ جنت نظیر کشمیر

محبّ ہند

جولائی ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین :

۱ حال حکمت زراعت وفنون باغیچہ

محبِ ہند
یکم اگست ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین :

۱ تتمہ حال حکمت زراعت وفنون باغیچہ وغیرہ
۲ فن فصاحت

محبت ہند
یکم ستمبر ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین :

۱ تتمہ حال حکمت زراعت الخ
۲ قصہ حاجی مصطفیٰ
۳ شکستہ حالی اور مصائب جہالت اور وحشت میں
۴ بقیہ فن فصاحت
۵ امور مختلفہ۔ سوالات کمیٹی ممتحن وغزلیات حضور پرنور دہلی

آغاز ع اشک سرمہ سا دیکھ آئینے کی آب میں (؟)
ع لوگ کہتے ہیں کہ وہ تم سے قریں رہتے ہیں
ع برب کعبہ کعبہ سے غرض رکھتے نہیں ہم ہیں
ع کشش سے دل کی جو میں تم کو اے صنم کھینچوں

محبِ ہند
یکم اکتوبر ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین:

۱ بقیہ حال حکمت وفنون زراعت وباغیچہ وغیرہ
۲ مثنوی شعلہ عشق کی بہت پاکیزہ ہے۔ فارسی میں ہے

آغاز کا شعر

اے طوطی (خامہ ؟) نغمہ زن شو
در حمد خدا شکر شکن شو

محب ہند
یکم اکتوبر ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین:

۱ بقیہ حال حکمت زراعت الخ

۲ حال شہر بابل ونمرود کا

۳ رسالہ مبارک دراصل کمبوہ من تصنیف نواب مبارک علی خاں

۴ غزلیات حضور والا

مطلع
ارادہ اور کچھ ہے یار جانی اور کہتے ہو
خطوں میں اور لکھتے ہو زبانی اور کہتے ہو

☆

مطلع
میرے قاصد سے پیام اے یار جانی سن تو لو
چاک کرنا پیچھے خط پہلے زبانی سن تو لو

☆

مطلع
کہے تدبیر کر کر لاکھ انساں یہ نہ ہو وہ ہو
بجز تقدیر لیکن کب ہے امکان یہ نہ ہو وہ ہو

☆

مطلع
یقین ہے رات کا پردہ الٹ کر صبح روشن ہو
ہوا سے رخ پہ گر زلف سیہ اُلٹی سے سیدھی ہو(؟)

☆

مطلع کان دھر کر وہ سنے تقریر ہو اتنی تو ہو
بات ہو ایسی تو ہو تاثیر ہو اتنی تو ہو

☆

مطلع ہم وہ بے کھٹکے ملیں تدبیر ہو ایسی تو ہو
کھل نہ جائے راز دل تقریر ہو ایسی تو ہو

☆

مطلع مونہہ سے میں کہتا ہوں کیا ہو تمنا یاہو
میں کسی در کا گدا ہوں تمنا یاہو

☆

محبّ ہند

یکم دسمبر ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین:

۱ حال سفر یوسف خاں کمل پوش کا ملک انگلستان میں

محبّ ہند

یکم جنوری ۱۸۴۹ء

فہرست مضامین:

۱ حال علوم اہل اسلام کا

(اسی میں ص ۴۶ پر تتمہ علوم درباب توہمات ورسوم [طریقہ خط وکتابت] ہے۔)

۲ غزلیات حضور والا

(یہ رسالہ ناقص الآخر ہے)

محبّ ہند

یکم فروری ۱۸۵۰ء

فہرست مضامین:

۱ بقیہ حال سفر یوسف خاں کمل پوش کا ملک انگلستان میں

۲ تاریخ ممالک چین

۳ مثنوی فسانہ عشق من تصنیف مرشدزادہ آفاق مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر دام اقبالہ

آغاز ساقیا رہ مدام خورم وشاد

بھر کے دے جام تا خط بغداد

محب ہند

یکم مارچ ۱۸۵۰ء

فہرست مضامین:

۱ بقیہ حال سفر یوسف خاں کمل پوش کا

۲ تاریخ ممالک چین

۳ مثنوی مسمی فسانہ عشاق تصنیف مرزا محمد سلطان فتح الملک عرف مرزا فخرالدین حسین بہادر دام اقبالہ

مثنوی کا آغاز نامہ اس طرح ہے:

اے گل گلستانِ رعنائی اے مہہ آسمانِ زیبائی

اے بہار ریاض ناز و ادا اے فروغ چراغ مہر و وفا

اے پری زاد آدمی پیکر اے زمیں مسکن و فلک منظر

محب ہند

ماہ اپریل ۱۸۵۰ء

فہرست مضامین:

۱ تاریخ چین

۲ مختصر حال بخارا

۳ مختصر حال یوسف خاں کمل پوش کا انگلستان میں

۴ غزل شاہ نصیر

ع ہم نے وصف گوہر عرفاں کو جب لکھنا کیا

محب ہند

یکم مئی ۱۸۵۰ء

فہرست مضامین:

۱ مختصر حال شہر گوڑ قدیم دار الخلافت بنگال جس کو جنت آباد کہتے ہیں۔

۲ بھوت پریت جن کا (گجرات ورنیکولر سوسائٹی نے ۱۵۰ روپے کا انعام اس انگریزی مضمون پر دیا اس کا ترجمہ ہے۔ طالب علم سوتر دادی دلپت رام دیا نے انعام پایا جو قوم سے شری مالی برہمن ہے)۔

۳ مختصر حال تاریخ سندھ

۴ بقیہ تاریخ چین

۵ غزل شاہ نصیر

ع ہم رہان سفر اسباب سفر باندھتے ہیں

محب ہند

یکم جون ۱۸۵۰ء

فہرست مضامین:

۱ مختصر حال شہر دمشق اور وہاں کے باشندوں کا

۲ مختصر حال ملک مصر کا اور وہاں کے باشندوں کا

۳ بھوت ہند

محب ہند

یکم جولائی ۱۸۵۰ء

فہرست مضامین:

۱ مفصل حال جنگ ہائے جدید پنجاب کا
۲ بھوت ہند
۳ بقیہ تاریخ چین
۴ غزل شاہ نصیر

محب ہند

ماہ اگست ۱۸۵۰ء

فہرست مضامین:

۱ بھوت ہند
۲ مفصل حال جنگ ہائے جدید ملک پنجاب
۳ ذکر سکندر اعظم
۴ غزل شاہ نصیر

تمام شد

اشاریہ

الف

آرنلڈ، ولیم۔ڈی: ۲۰، ۸۸

آزاد، ابوالکلام: ۵۹

آزاد، محمد حسین: ۱۰، ۱۴، ۲۰، ۲۳، ۷۳، ۱۷۳، ۱۹۷

آزردہ، صدرالدین: ۳۶، ۷۴، ۱۷۱

آشوب، پیارے لال: ۱۰، ۳۶، ۳۷، ۷۳، ۱۰۱، ۱۰۲

آصف الدولہ: ۱۱۱، ۱۳۱، ۱۷۹، ۱۹۵

آفاق دہلوی: ۱۷۱

آگرہ کرسچن ٹریکٹ اینڈ بک سوسائٹی: ۹۷

"آئین اکبری": ۳۷، ۷۱

"اخبار الحقائق": ۱۱۷، ۱۹۸

ارسطو: ۳۶، ۴۲، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۴۱، ۱۴۷، ۱۴۸، ۲۰۸

اسپیکٹیٹر: ۱۱۳

"استقصا الافحام": ۱۳۳

اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد: ۱۲۳، ۱۹۹، ۲۰۰

اسمت، پادری: ۱۰۲، ۱۲۲

اشپرنگر: ۳۶، ۵۱

اشرف الاخبار (دہلی): ۱۱۴

اصول علم حساب جزئیات وکلیات: ۱۸۱

اصول گورنمنٹ کے: ۱۲۰

اظہارالحسن: ۱۱۱، ۱۱۲

اعتراض قرآن: ۱۳۳

اعتمادالدولہ: ۷۲

افلاطون: ۴۲، ۵۲، ۱۱۹، ۱۹۶

اکبر: ۲۴، ۲۸، ۳۷، ۱۷۹

البلاغ: ۱۶۴

الہلال: ۱۶۴

انڈیا آفس (لندن): ۱۱۱

انجیل: ۹۱، ۹۲، ۹۴، ۱۳۲

انگلش اسکول: ۸۲، ۸۳

انگلش مین (کلکتہ): ۸۷، ۱۲۹

اینڈریوز، سی۔ایف: ۵۸

ب

بابل، سلطنت: ۱۳۷، ۲۱۴

بدعات عیسائی مذہب: ۱۳۳

برن، کرنل ایچ۔پی: ۹۵

بوترو، پرنسپل ایف: ۷۴، ۸۴

بہار دانش: ۱۴۰

بھاسکر: ۱۲۹

بھوت نہنگ: ۱۲۰

بیتھوون، ڈرنک واٹر: ۸۷

پ

پتمبر: ۱۲۱

پنجاب ریلی جس بک سوسائٹی

(لاہور): ۱۳۱
پیٹرک، فنٹر: ۱۰۲
تاراچند، ریورینڈ: ۱۱۴
تذکرۃ الکاملین: ۴۴
تعریف القرآن: ۱۳۳
تہذیب الاخلاق: ۱۶۴
تھامپسن: ۹۰

ٹ

ٹیپو سلطان: ۱۱۵، ۲۱۰
ٹیلر، پرنسپل: ۱۹، ۲۶، ۳۳، ۷۶
ٹامسن کالج: ۱۲۷
جے سکھ رائے، راجہ: ۹۹
جیکسن، ریورینڈ: ۹۶، ۹۸

چ

''چپ کی داد'': ۷۹
چمن لال، ڈاکٹر: ۷۶، ۹۳، ۹۸

ح

حالی: ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹
۴۰، ۴۴، ۷۹، ۸۰
حامد حسین (لکھنوی): ۱۳۳
''حب الوطنی'': ۴۹، ۵۳
''حیات النذیر'': ۹۷، ۱۹۷

خ

خدا بخش لائبریری (پٹنہ): ۶۰، ۱۲۵
''خلاصۃ الحساب'': ۱۲۵
''خیر خواہ ہند'' (مرزا پور): ۳۸، ۵۱، ۱۱۱، ۱۱۲،
۱۹۴، ۲۰۳، ۲۰۴

د

دتاسی، گارساں: ۸۴، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۳۱،
۱۳۲، ۱۳۳، ۱۹۷
دلیپ سنگھ، مہاراجہ: ۱۱۰، ۱۷۹،
''دہلی اردو اخبار'': ۶۹، ۷۶، ۷۷، ۱۰۶،
۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۷،
۱۷۱، ۱۹۹
دہلی اردو اخبار پریس: ۱۲۱، ۱۲۳
دہلی ڈسٹرکٹ اسکول: ۱۰۰، ۱۲۷
دہلی سوسائٹی: ۷۸، ۱۰۱، ۱۰۲،
۱۰۳، ۱۹۹
دہلی کالج: ۱۷، ۲۰، ۲۶، ۲۷،
۲۸، ۳۰، ۳۱، ۳۲،
۳۵، ۳۶، ۳۷، ۵۴
۵۵، ۵۷، ۵۸، ۶۵
۶۸، ۷۱، ۷۲، ۷۳،
۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷
۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۵
۸۷، ۹۹، ۱۰۵، ۱۰۶
۱۰۹، ۱۱۱، ۱۲۲، ۱۳۵،
۱۳۶، ۱۳۹، ۱۴۲،
۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۳، ۱۶۵
۱۶۶، ۱۶۷، ۱۷۱،
۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۹

ڈ

ڈایوفین لٹس: ۱۲۹
ڈگلس، کیپٹن: ۶۸

ذ

ذکاء اللہ، مولوی: ۳۷، ۴۴، ۷۳، ۸۰

ذوق: ۲۰، ۴۰، ۴۱، ۸۷، ۱۱۱

ر

رام، موہن رائے، راجہ: ۲۳، ۳۰، ۵۴، ۶۵

رام چندر (یسوع داس): ۹۴، ۹۵، ۱۲۸

قبول عیسائیت: ۷۶، ۸۹، ۹۲

ریاست پٹیالہ: ۱۰۳، ۱۱۸، ۱۳۱، ۱۳۲

دوسری شادی: ۹۵

انتقال: ۲۹، ۳۱، ۸۱، ۸۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۰

"رسالہ اصول کلوں کے باب میں": ۱۲۷

"رسالہ دہلی سوسائٹی": ۱۹۹

رضا لائبریری (رام پور): ۶۰، ۱۹۹

روس، اے: ۷۵

"رگ وید": ۱۰۱

رے نالڈز: ۱۳۰

س

سالار جنگ لائبریری (حیدرآباد): ۱۲۱، ۱۲۸

سائمن: ۱۲۳

سپریم کونسل: ۸۷

سجن لال (قاسم علی): ۳۸، ۵۹، ۶۰، ۱۰۱، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۲۰۰

سعدی: ۱۴۰

سقراط: ۱۷۵، ۱۷۸، ۱۸۰، ۱۸۸

سکندر: ۴۲، ۱۱۵، ۱۸۱، ۱۹۶، ۲۱۸

سندھیا: ۲۴، ۶۲

سیتا: ۸۲، ۱۰۳

سیاح: ۱۴۱، ۱۶۲

سید احمد خاں، سر: ۱۹، ۳۷، ۵۸، ۱۰۱، ۱۶۴

سید محمد، مولوی: ۱۲۱

سینٹ اسٹفنز چرچ (دہلی): ۹۵

سینٹ اسٹیفن، یوم: ۹۶

ش

شاہ رخ، مرزا: ۶۹، ۱۱۰

شاہ عالم: ۲۴، ۶۲

شجاع الدولہ: ۱۱۱، ۱۷۹، ۱۹۵

شعلہ اخبار: ۱۱۷

ص

صدر امین، دہلی: ۹۷

صہبائی، امام بخش: ۷۴، ۱۰۸

صدیقی، محمد عتیق: ۳۸، ۵۹، ۱۰۵، ۱۱۱، ۱۹۶، ۱۹۷

ظ

ظفر، بہادر شاہ: ۲۴، ۱۰۸، ۲۰۴

ع

عابد حسین، ڈاکٹر سید: ۶۷، ۷۱، ۱۹۷

عالمگیر ثانی: ۱۸، ۱۹، ۳۸، ۷۲

عبدالحق، مولوی: ۵۸، ۵۹، ۶۸، ۷۲، ۷۴، ۷۹، ۸۴، ۱۰۹، ۱۲۱، ۱۳۳، ۱۹۷

عبدالحق (دہلوی) مولانا: ۱۳۳
"عجائبات روزگار" ۱۱۶، ۱۱۷
علائی،
نواب علاء الدین خاں: ۱۰۱
"علم طبیعی": ۱۱۲، ۱۲۶، ۱۸۲، ۱۸۳
علم مثلث وتراش ہاے
مخروطی وعلم ہندسہ بالجبر: ۱۲۲، ۱۲۳
علی گڑھ تحریک: ۶۵، ۷۸، ۸۰، ۱۶۵

غ

غازی الدین خاں: ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۹، ۷۲۔
غالب، مرزا اسداللہ خاں: ۳۶، ۳۷، ۴۳، ۵۲، ۱۰۱، ۱۷۱
غلام نثار: ۹۳
فتح محمد بیگ، مرزا: ۱۳۲
فوایدالشایقین: ۲۴، ۵۳
فوائدالناظرین (دہلی): ۶۹، ۷۰، ۷۳، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۷، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۳۷، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۶۲، ۱۶۸، ۱۶۹۔
فورٹ ولیم کالج: ۴۲، ۴۷، ۷۸، ۷۹، ۱۶۰

ق

قرآن: ۴۱
قران السعدین (دہلی): ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۴، ۸۵، ۱۰۵، ۱۱۷، ۲۰۰

ک

کریما: ۱۴۰۔
کریم الدین، مولوی: ۳۶، ۴۳، ۷۷، ۱۹۷۔
کلارک: ۱۰۰
کلکتہ ریویو: ۲۸، ۵۱، ۸۶، ۸۷، ۱۲۸
کمشنر دہلی: ۷۲، ۸۸
کورٹ آف ڈائیریکٹرز (ایسٹ انڈیا کمپنی): ۳۱
کونسل آف ایجوکیشن: ۹۲
کیمبرج: ۳۸، ۴۰، ۴۹
کیفی، پنڈت برجوہن دتاتریہ: ۴۳، ۵۹، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱
گورنر جنرل: ۲۷، ۳۳، ۱۰۳
گیتا: ۹۱

ل

لارڈ بشپ (کلکتہ): ۱۰۳
لندن یونیورسٹی: ۵۹
لوک: ۱۱۹
لیلاوتی: ۱۲۵

م

ماتھر، رائے سندر لال: ۸۱
مارگن، آگسٹن، ڈی: ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۸، ۱۲۹، ۱۳۰

مالک رام: ۱۷۱، ۱۹۷
مٹکاف، ٹی ٹی: ۷۲، ۷۵، ۱۱۸
مٹکاف، سر چارلس: ۷۲
مجلس قانون (لا کمیشن): ۸۷
محبّ ہند (خیر خواہ ہند): ۳۱، ۳۸، ۳۹، ۴۱، ۴۳، ۴۵، ۴۶، ۵۰، ۵۳، ۵۶، ۸۶، ۱۰۶، ۱۱۳، ۱۴۳، ۱۵۸، ۱۶۷، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۹، ۱۹۴، ۲۰۰، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸
محمد باقر، مولوی: ۱۰۶
محمد شاہ: ۱۳۷
مخبر سرِ ر (دہلی): ۷۷، ۲۰۰
مدرسہ غازی الدین: ۱۹، ۷۲
"مسیح الدجال": ۱۳۱، ۱۳۲
مطبع العلوم (دہلی): ۷۷، ۸۴، ۱۰۵، ۱۱۷، ۱۲۵
مطبع محمدی (کانپور): ۱۲۵
مطبع نظامی (کانپور: ۱۲۵
مطبع نول کشور (کانپور): ۱۱۵، ۱۱۸
ملٹری آرفن پریس (کلکتہ): ۱۳۰
"مناجات بیوہ": ۷۹
"مواعظ عقبیٰ": ۱۱۴
مہر درخشاں (دہلی): ۱۳۲، ۱۳۳، ۲۰۰
مہندر سنگھ، مہاراجہ (پٹیالہ): ۱۸
مہندر کالج (پٹیالہ): ۱۰۳
میور، سر ولیم: ۹۹، ۱۱۴
نادر شاہ: ۲۴، ۲۹، ۱۷۸
نپولین: ۱۱۵
نذیر احمد، مولوی: ۳۶، ۳۸، ۴۴، ۷۳، ۷۶، ۸۰، ۱۷۳
نور افشاں (لدھیانہ): ۱۳۲
ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی (دہلی): ۷۳، ۱۰۵
ہادی علی، مولوی: ۱۲۵
ہٹن: ۱۲۳
"ہسٹری آف امریکا": ۱۰۱
ہیسنگو، راون: ۲۲، ۶۳